قدرت اللہ شہاب کے ساتھ
ایوان صدر میں
سولہ سال
مہ جبیں خالد
JALAL BOOKS
KUTUB KHANA

ایوانِ صدر میں سولہ سال

م۔ ب۔ خالد

دِید شُنید پبلیکیشنز

نام کتاب ——— ایوانِ صدر میں سولہ سال

اشاعت اوّل ——— جولائی ۱۹۸۸ء

تعداد ——— ایک ہزار

قیمت ——— ایک سو پچیس روپے

پبلشر ——— دید شنید پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۱۹۔ ستلج بلاک اقبال ٹاؤن لاہور

دفتر رابطہ ۲۳ فضل منزل بیڈن روڈ لاہور

فون نمبر ۲۲۱۸۴۰

پرنٹرز ——— کمبائن پرنٹرز

گارڈی ٹرسٹ بلڈنگ نیپیئر روڈ لاہور

سرورق ——— موجبہ

انتساب

اپنی شریکِ حیات

ارشی خالد کے نام

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارہ

اقبالؒ

"آدمی کی افتادِ طبع کا سراغ اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے ملتا ہے، بڑے بڑے کاموں سے نہیں۔ بڑے بڑے کام تو وہ سوچ سمجھ کر کرتا ہے جو بسا اوقات اس کی طبیعت کے خلاف بھی ہو سکتے ہیں"

——— ارسطو

فہرست

م۔ ب۔ خالد

ممتاز مفتی

صدر گھر اگر اقتدار کا گہوارہ ہو تو وہ گھر نہیں رہتا بلکہ میدان کارزار بن جاتا ہے۔ ایک دروازے سے اقتدار داخل ہوتا ہے تو دوسرے دروازے سے اعتماد، اطمینان اور سکون باہر نکل جاتے ہیں۔

صاحبِ اقتدار کے گرد دو طاقتیں ہر لمحہ برسرِعمل رہتی ہیں۔ ایک وہ جو اُن کا سرنگوں کرنے کے فکر میں گھلتے رہتے ہیں اور موقعے کے منتظر رہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اُن کو جائز و ناجائز طریقوں سے خوش کرنے اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ پھر ان جی حضوریوں کا آپس میں کمپیٹیشن چل پڑتا ہے۔ زید ایک فٹ جھک کر بات کرتا ہے۔ بکر دو فٹ جھک جاتا ہے۔ زید سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ آج زید بازی لے گیا۔ بکر کا دل مسوس ہو کر رہ گیا۔ اِسی فکر میں رات کاٹی کہ کل کس طرح نہلے پہ دہلا ماروں۔

صدر گھر میں مسکراہٹوں کی بھرمار رہتی ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ کون سی اصلی ہے کون سی نقلی۔ پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے لیکن ایسے ہوتا ہے کہ نقلی مسکراہٹ اصلی سے زیادہ چمکدار ہوتی ہے۔ زیادہ پُراثر ہوتی ہے۔ اسی لیے نقلی مسکراہٹ والے زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔

صاحبِ اقتدار کتنے ہی زیرک کیوں نہ ہوں وہ کنفیوز ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اِنھیں چیزوں اور افراد پر بھروسہ نہیں رہتا۔ سچ اور جھوٹ کی تمیز نہیں رہتی۔ پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ سچ اور جھوٹ کی تمیز کی خواہش نہیں رہتی۔ صرف ایک دھن سوار ہو جاتی ہے کہ اقتدار ہاتھ سے جانے نہ پائے۔

ایوانِ صدر گھر چیونٹی گھر کی مصداق ہوتا ہے۔ اوپر سے سائن نیچے مسلسل حرکت، اضطراب، بے چینی۔

حیرت ہے کہ ایم بی خالد نے ۱۶ سال صدر گھر کے اکھاڑے میں کس طرح گزارے۔ اگر خالد میں ذاتی مفاد یا تماش بینی کا عنصر ہوتا تو بات سمجھ میں آجاتی۔ لیکن خالد تو پیدائشی طور پر سراطِ مستقیمیہ ہے۔ شاید یہ بیماری موروثی ہو۔ بچپن ہی سے خالد میں اسلامی ذوق بیدار ہوا۔ پھر ایک عالمِ دین کی باتیں سُن سُن کر اس میں مزید ابال آگیا۔ جوانی میں ہی صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو گیا۔ داڑھی رکھ لی۔ اس زمانے میں داڑھی رکھنا فیشن میں نہ تھا الٹا پڑھے لکھے معیوب سمجھتے تھے۔ خالد کے دل میں تبلیغ کا جذبہ تھا۔ خدمت کا جنون تھا۔

پھر ایک روز انجانے میں اس عالمِ دین کو تخلیے میں یوں مصروف کار دیکھ لیا کہ خالد کی آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو گئی۔ افراد پر اعتماد نہ رہا۔ عمل کی شاہراہ کج رو پگڈنڈی بن کر رہ گئی۔ داڑھی منڈوا دی، صوم و صلوٰۃ تاک پر رکھ دیے۔

دو ایک سال عدم اعتماد کی کیفیت قائم رہی، پھر اتفاق سے حضور علیہ وسلّم کی سوانح ہاتھ لگ گئی۔ اسلامی کردار کی عظمت از سرِ نو اجاگر ہوئی۔ بے اعتمادی دُھل گئی۔ توجہ اسلام کے ظاہر کوائف سے ہٹ کر باطن پر مرکوز ہو گئی۔ اسلامی کردار متمعِ نظر بن گیا۔ جس پر وُہ آج تک سختی سے عمل پیرا ہے کچھ زیادہ ہی سختی سے عمل پیرا ہے۔

ایک ایسا شخص جسے ہر حالت میں سچ کہنے کی بُری عادت ہو، جو خوش کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو، جو صورتِ حالات سے بے نیاز ہو کر قدم اُٹھانے کا عادی ہو، جو نمائشی مُسکراہٹ سے عاری ہو، جو بلا تامل یس سر کہنے کا عادی نہ ہو جو وعدہ خلافی کو ناقابلِ تلافی جرم سمجھتا ہو، جو حقوق العباد کا دیوانہ ہو۔ ایسے آدمی کا سولہ سال صدر گھر میں رہنا میرے لیے حیران کن ہے خصوصاً اس زمانے کا صدر گھر جو اقتدار کا واحد مرکز تھا۔

خالد کا اصل نام محمد بشیر تھا۔ وُہ والدین کے لیے نیک بشارت لایا تھا۔ جب

وُہ بڑا ہوا تو اس نے اس راز کو اخفا کرنا پسند نہ کیا۔ پتہ نہیں کیوں۔ اِس نے محمد بشیر کو ایم بی میں کیما فلاج کر لیا اور ساتھ خالد کی کلی ٹانک لی۔

خالد سے میری ملاقات ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ جب وزارتِ اطلاعات نے مجھے ڈائریکٹوریٹ آف فلمز اینڈ پبلیکیشنز سے تبدیل کر کے صدر گھر میں بھیج دیا۔ صدر گھر میں خالد پریزیڈنٹ کا پی ایس تھا اور میں ان کا او ایس ڈی۔ سیکرٹری ٹو دی پریزیڈنٹ قدرت اللہ شہاب تھے۔

خالد کے ساتھ میں تقریباً تین سال صدر گھر میں رہا۔ ہمارے تعلقات بڑے خوشگوار مگر سطحی رہے۔ چونکہ ہم دونوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ میں برائے نام مسلمان تھا۔ خالد اسلام جیتا تھا۔ میں مغرب زدہ تھا۔ خالد مشرقی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ خالد اصولوں کا پابند تھا، میں اصولوں سے بے نیاز تھا۔ میں IS کی دنیا میں جیتا تھا۔ خالد AUGHT کا دلدادہ تھا۔

ریٹائر ہونے کے بعد پتہ نہیں خالد کو کیا سوجھی اس نے اپنی یادداشتوں کو قلم بند کرنے کا شغل اپنا لیا۔ یہ یادداشتیں نوائے وقت میں شائع ہوتی رہیں۔ لوگوں نے انھیں بے حد پسند کیا۔ اب خالد ان یادداشتوں کو اِس کتاب کی صورت میں پیش کر رہا ہے۔

خالد ادیب نہیں ہے۔ عبارت آرائی کے فن سے بے خبر ہے۔ ویسے بھی خالد عبارت آرائی کو پسند نہیں کرتا۔ نمائش سے اسے گھن آتی ہے۔ غلو کو وُہ بددیانتی سمجھتا ہے۔

لہٰذا اِس کتاب میں صرف دو خوبیاں ہیں، سچائی اور سادگی۔

دیباچہ

ایوان صدر میں سولہ سال ——— جناب م ۔ ب خالد کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے گفتنی اور ناگفتنی باتوں کا یہ گلدستہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ ہمارے ہاں نجی یادداشتیں لکھنے کا رواج ذرا کم رہا ہے ۔ جو دو چار کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں لکھنے والوں نے اپنی ذات کو تاریخ پاکستان کا محور بنا کر پیش کیا اور حقائق کا تناظر مسخ کر کے رکھ دیا ۔ م ۔ ب خالد ایک محتاط خود نوشت نگار ہیں وہ نہ پیشہ ور ادیب ہیں اور نہ پیشہ ور سیاست دان ۔ ان کے ہاں ادیب کہلانے اور مستقبل میں کوئی سیاسی الیکشن لڑنے کی خواہش دکھائی نہیں دیتی اس لئے وہ سچ اور صرف سچ کہنے پر مصر ہیں ۔ ان میں اپنی ذات کا اشتہار در و دیوار پر چسپاں کرنے کا شوق بھی نہیں اس لئے انہوں نے نہ حقیقت اور افسانے کے ڈانڈے ملائے ہیں اور نہ قاری ہی کو یہ تاثر دیا ہے کہ ہر گورنر جنرل ان کی جیب میں تھا ۔ انہوں نے تو سیدھے سادے مسلمان کی طرح جو دیکھا بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے ۔

ان کے بیان کردہ واقعات ہماری تاریخ کے بعض ایسے گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں جن کے بارے میں یا تو ہمیں سرے سے کچھ معلوم ہی نہیں تھا یا پھر یہ واقعات ان لوگوں کے بیان کردہ رہے ہیں جو کاروبار مملکت میں خود شریک (بلکہ بعض صورتوں میں شریکِ غالب) تھے اس لئے اچھی باتیں اپنے کھاتے میں اور بُری باتوں کی ذمہ داری اپنے حریفوں پر ڈالتے چلے گئے ۔ ایسے معاشرے میں جہاں چور دوسروں کو چور کہنے کا عادی ہو اور شخصی آزادی کا تصور مقبول و محمود ہو جس میں اخذ نتائج میں ڈنڈی مارنے کا حق ہر جہاں دیدہ فرد استعمال کر لیتا ہو ۔ وہاں پر سچ کا علم بلند کرنے کے لئے بڑا حوصلہ

درکار ہے۔

خالد ۲۳ راگست ۱۹۵۲ء کو ایوانِ صدر میں ملازم ہو کر گئے اور ۱۹۶۸ء تک وہاں رہے۔ اس دور میں ملک کے بلند و پست کو قریب سے دیکھنے کے مواقع انہیں حاصل رہے۔ یہ سولہ برس ہماری تاریخ کا تاریک ترین باب ہے۔ اگرچہ پورے ڈرامے کے مرکزی کردار تو اب دنیا سے جا چکے ہیں لیکن 'مصاحبوں' کا ایک بڑا 'طائفہ' اب بھی سیاہ و سفید کا مالک ہے، اس لئے حکومتی سطح پر سرکاری ریکارڈ کو سامنے لانا تو فی الحال "مفادِ عامہ کے منافی" ہی سمجھا جائے گا اور سرکاری دستاویزات پر "بصیغہ راز" کے دبیز پردے پڑے رہیں گے۔ اب لے دے کر تاریخ پاکستان کے مورخین کے لئے نجی یادداشتیں یا معاصر شہادتیں ہی ذریعہ معلومات ٹھہرتی ہیں۔ اس میں یہ گنجائش تو بہرحال رہتی ہے کہ کس نے کس واقعے کو کیا سمجھا ہو۔

م۔ ب خالد نے سچ کی دھونی رمائی ہے تو اسے داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ اس کے ہاتھ میں منافقت کا برش نہیں جس کی مدد سے وہ اپنے ہیرو کی تصویر روشن و تابناک اور اپنے مخالفین کے چہرے بدصورت اور تاریک بنا کر رکھ دے۔ وہ ادیب ہے اور اس نے اپنی ادبی صلاحیتوں کو ایمائی اور علامتی حوالوں سے سجایا ہے۔ وہ حقیقت کو حقیقت کے روپ میں پیش کرنا جانتا ہے۔ اس لئے اس کے بیان کردہ حقائق پر دلچسپ ہونے کے باوجود افسانے کا گمان نہیں ہوتا۔ وہ اپنے البیلے انداز میں کہیں کہیں ہلکی سی چٹکی تو ضرور لیتا ہے لیکن تمسخر و استہزا یا تملق و خوشامد اور چالاکی اور چابکدستی کے ہتھکنڈے استعمال نہیں کرتا جس سے حقائق کی صورت مسخ کر دینے کا احساس پیدا ہو۔ اس کی تحریر کا مقابلہ کسی دوسرے تاریخ نگار سے کرنا بھی مناسب نہ ہوگا، تاہم معاصر تحریروں کی جانب بار بار ہماری توجہ ضرور مبذول ہوتی ہے، اسے حسنِ اتفاق کہیے کہ خالد کی یادداشت اور شہاب نامہ کم بیش ایک ہی زمانے میں ضبط تحریر میں آئے۔ خالد، قدرت اللہ شہاب کے ماتحت رہے۔ ان کے حلم اور شرافت کے وہ مداح ہیں۔ دیانتدار مداح کی حیثیت سے وہ اپنے ہیرو کی کمزوریوں سے آگاہ ہیں اور جہاں جہاں شہاب کے قلم نے ٹھوکر کھائی ہے

اس کتاب میں اس کی نشاندہی بھی ملے گی۔

یہ کتاب تاریخ پاکستان کے اس دور سے تعلق رکھتی ہے جب ملک کی باگ ڈور طالع آزماؤں اور ذخیرہ اندوزوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس تاریک دور کی ساری تفصیلات سامنے نہیں ۔ معاصر تاریخ کے بیان میں یہ تو کمی بہر حال رہتی ہے کہ ہر شخص اپنے تاثرات کے حوالے سے اپنے تعصبات کی داخلی عینک سے دیکھتا ہے۔ چاہے وہ فیلڈ مین ہو یا زیڈ نگ ہو یا قدرت اللہ شہاب، جذباتی رویوں کی دھوپ چھاؤں تو قائم رہتی ہے۔ یہ دھوپ چھاؤں اس کتاب میں بھی ہے لیکن کم کم۔ صحتِ واقعات کی چھان پھٹک تو معاصر شہادتوں ہی سے ممکن ہے جو دستیاب نہیں۔

پچھلے چالیس برس میں ہم کذب وافترا کی دلدل میں دھنس گئے ہیں کہ اس میں سچ کہنے والے کو بھی کوئی نہیں بخشتا۔ م۔ب خالد پر بھی لوگ آوازے کسیں گے۔ معیارِ حق گوئی کے اوجھل ہو جانے سے صداقت اور تاریخ دونوں پر بڑا بے مہری کا وقت آپڑا ہے، اب ہمیں اپنے ٹیلی ویژن کی جگہ بی بی سی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہماری غلامی کی یادگار یہ احساس بھی ہے کہ سفید چمڑی کا آدمی ہمیشہ سچا ہوتا ہے اور کالے رنگ کا شخص جھوٹا۔ ایسے میں سچائی تک ہماری رسائی مشکل تر ہو گئی ہے۔ ہم میں کتنے ہیں جو قائد ملت لیاقت علی خاں کی شہادت کے پس منظر سے واقف ہوں، کتنے ہیں جو سکندر مرزا کے آس پاس کی محلاتی سازشوں کی تفصیل کے واقف ہوں، کتنے ہیں جو مشرقی پاکستان کے المیے کے اصل اسباب سے آشنا ہوں، کتنے ہیں جو پاک بھارت جنگ کے اصل پس منظر پر روشنی ڈال سکیں۔ چھان بین کے لئے کمیشن تو بیٹھتے رہیں گے لیکن رپورٹ کے مندرجات سے لوگ آگاہ نہیں ہو پاتے۔ ہماری قومی عمارت آدھے سچ پر قائم ہے۔ جب اخفائے احوال کا یہ حال ہو تو قوم کو آدھا سچ بھی ہضم نہیں ہوتا، تو پھر ایسے میں خالد کا نعرۂ مستانہ غنیمت سمجھنا چاہیئے کہ خالد کا یہ آدھا سچ ان کی ملازمتی مجبوری ہے۔ لیکن وہ دار کشی کے خوف سے ہمت ہار کر نہیں بیٹھ گئے۔ انہوں نے پورے سچ کے بیان کے لئے ایمائی انداز اختیار کیا ہے اور اس میں پنجابی اور اردو اشعار ان کے بہت کام آئے ہیں جس نے ان کے آدھے بیان کردہ سچ کے وہ پہلو

بھی اجاگر ہو گئے ہیں جو ضبط تحریر میں نہیں آسکتے تھے۔ ایک بھارتی اخبار نویس نے اخبارات کے بارے میں یہ بڑی پتے کی بات کہی تھی کہ بار بار کے سیاسی دباؤ اور بار بار کے مارشل لا نے پاکستانی صحافیوں کو سچی بات کہہ گزرنے اور قانون کی زد سے بچے رہنے کا سلیقہ عطا کیا ہے۔ م۔ ب خالد سچ کہہ دینے کا البیلا انداز رکھتے ہیں۔ اس کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

"۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ ہماری تاریخ کا بڑا اہم واقعہ ہے۔ مجھے کئی احباب نے کہا کہ "اندر کی بات" بتاؤں۔ حالانکہ اس سلسلے کا "اندر" جی ایچ کیو تھا ایوانِ صدر نہیں تھا۔ ایوانِ صدر میں ہم صرف صدر پاکستان کے چہرے کو دیکھ اور پڑھ سکتے تھے جس پہ پریشانی اور سراسیمگی کی ملی جلی کیفیت جھلکتی تھی اور جو روز پچھلے دن سے سوا نظر آنے لگی تھی۔ ضروری نہیں کہ یہ پریشانی اور سراسیمگی فیلڈ مارشل میں عزم و جرأت کے فقدان کا سبب ہو۔ جس ملک کی ساری دفاعی ضروریات کا دارومدار ایک ہی سپر پاور پر ہو اور وہ فاضل پرزے بھی سپلائی کرنے سے انکار کر دے اپنے مالی وسائل بھی ایسے نہ ہوں تو سراسیمگی کا سبب سمجھ میں آجاتا ہے۔"

آں کہ شیراں را کند روباہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

بہادر شاہ ظفر کے بعد یہ دوسرے مغل فرمانروا تھے جنہیں دفن کے لئے
ملے دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

سکندر مرزا اپنی وصیت کے مطابق اپنے سسرال (تہران) میں دفن ہیں۔
بقول سیف الملوک کے مصنف میاں محمد بخشؒ:

پینگھاں بہت ہلارے چڑھیاں ٹٹ زمین تے جھڑیاں
گڑیاں قبر دے مڑیاں پیکے سوہریاں چھک کھڑیاں

وزیراعظم کا عہدہ خواجہ ناظم الدین کا اپنا انتخاب تھا۔ گورنر جنرل کا عہدہ غلام محمد کا اپنا انتخاب نہ تھا۔ اُسے تھما دیا گیا تھا حالانکہ اُس وقت مغربی پاکستان کی دو بہت پُر وقار

اور تدبیر و تدبر کی حامل شخصیتیں موجود تھیں۔ سرحد سے سردار عبدالرب نشتر اور پنجاب سے راجہ غضنفر علی خان۔ یہ دونوں حضرات پرانے مسلم لیگی تھے۔ قائداعظمؒ کے معتمد ساتھیوں میں سے تھے اور ملک کے اندر اور باہر بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی وزارتِ عظمیٰ یا سربراہِ مملکت کے عہدے پر فائز کیا جانے کا اہل تھا۔ اِن دونوں کو خواجہ صاحب یا اُن کی کابینہ نے کیوں نظر انداز کیا؟ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیماری کے باوجود خواجہ صاحب اور اُن کی کابینہ کے دل میں غلام محمد کا اتنا احترام موجود تھا کہ اُسے ہیڈ آف سٹیٹ کے عہدے کی پیشکش کر دی گو اُن کی نگاہ اُس حد تک آگے نہ جا سکی کہ یہ بے حد محنتی اور غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل جب صحت مند ہو جائے گا تو پھر نچلا نہیں بیٹھ سکے گا۔

کرنی پڑے تو کیوں ڈرے کر کے کیوں پچھتائے
بوئے پیڑ ببول کے تو آم کہاں سے کھائے

ہندو شاعر تلسی داس کے اس شعر کا پہلا مصرع غلام محمد کے لئے اور دوسرا خواجہ صاحب پر صادق آتا ہے۔

دستور ۱۹۵۶ء کے ساتھ منسلک قراردادِ مقاصد کا مطالعہ کیا جائے۔ دستور ساز اسمبلی کے معزز اراکین کی فہرست کو سامنے رکھا جائے اور پھر سکندر مرزا کے ماضی حال اور مستقبل کا جائزہ لیا جائے تو اس حسنِ انتخاب پر بانگِ درا میں ظریفانہ کلام کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

تاریخی دستاویز کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس نکہت و نحوست کے دور کی بعض شخصیتوں کے کردار پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ غلام محمد، سکندر مرزا، شعیب قریشی اور قدرت اللہ شہاب یہ سارے کردار اپنا اپنا پارٹ ادا کر کے رخصت ہو چکے ہیں، لیکن تاریخ نے ان کے بارے میں انصاف نہیں کیا۔ غلام محمد کو ایک چالاک سیاست دان کے

طور پر پہچانا جاتا رہا ہے جس میں برائیاں ہی برائیاں ہیں۔ پاکستان کی بربادی کا سارا الزام اس پر ڈال کر باقی کرداروں کو فرشتہ بنانے کا رواج ہمارے مورخین میں بہت ہے۔ اس کتاب میں پہلی بار غلام محمد کے کردار کی خوبیاں بھی زیر بحث آئی ہیں، ان کی شخصیت کے اچھے رخ بھی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ ہمارے تاریخ دانوں نے عموماً غلام محمد کے پنجابی ہونے کے ناطے کبھی انصاف نہیں کیا۔ اس دور کی ساری خرابیوں کو ہم غلام محمد کے سر ڈال کر تاریخ نگاری کا فریضہ بخوبی ادا نہیں کر پاتے۔ غلام محمد اتنا بڑا شیطان نہ تھا جتنا بڑا بنا کر ہم پیش کرتے رہے ہیں۔ بعض خرابیاں اور غلطیاں کی تھیں جنہیں غلام محمد کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ م۔ ب خالد نے اس کتاب میں اس پہلو پر مفصل بحث کی ہے۔ وہ خود بعض واقعات کے ناظر تھے۔ ہر ناظر اچھا ناظر نہیں ہوتا اور بعض اوقات اپنی ذات کی داخلی کجی کو کرداروں میں منعکس کر دیتا ہے۔ خالد روشن لکیروں کے تاجر ہیں۔ وہ تاریخ میں دیانت کی قدروں کے امین ہیں۔ ان کے مقابلے میں اگر کابینہ ڈویژن کے نذیر احمد ان واقعات کو بیان کرتے تو شاید منظر کشی میں تاریکی کا عنصر غالب رہتا لیکن خالد نے کرداروں کو زندہ اور جاندار رکھنے کی سعی کی ہے، اس لئے "ایوانِ صدر کی داخلی زندگی" میں جامد و ساکت نہیں بلکہ چہکتی بولتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی توجہ ایوان صدر کے چھوٹے چھوٹے کرداروں پر بھی ہے اور بڑے کرداروں پر بھی۔ بڑے کردار کی یک رخی تصویر کی بجائے وہ انہیں گوشت پوست کے انسانوں کے روپ پیش کرتے ہیں۔ ہم معاشرے کی ساری سیاہی جمع کر کے غلام محمد کے چہرے پر ملنے کے عادی ہیں لیکن خالد کو ان کے اندر کا انسان زیادہ عزیز ہے۔ اس لئے ہے وہ اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں کامیاب ہیں۔ انہوں نے تاریخ کو مسخ ہونے سے بچایا ہے۔ یہ تاریخ پاکستان پر ایک احسان ہے۔ شہاب کے استعفوں کا حال بھی پہلی بار انہوں نے سنا ہے۔ شعیب قریشی کو ہم ماہر اقتصادیات کے طور پر جانتے ہیں لیکن ان کے کردار کے بعض پہلو ہمیشہ ہماری نظروں سے اوجھل رہے۔ اس طرح ایک خاص مذہبی لابی نے آکٹوپس بن کر جس طرح حکومتی ذرائع پر قبضہ کیا اس کی سرگزشت بھی توجہ طلب ہے۔ رشوت کا بازار جس طرح آہستہ آہستہ گرم ہوا اس کی

چاپ بھی اس کتاب میں سنائی دیتی ہے۔ مزار قائد اعظمؒ کے منصوبے سے جس طرح بعض سرکاری افسروں نے اپنے لئے دولت کے انبار لگائے اور قانون کی زد سے بھی بچ گئے، یہ اندوہناک داستان بھی ان صفحات میں مل جائے گی۔

وہ کامیاب ناظر ہیں اس لئے ان کے بیان کردہ حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سکندر مرزا اور ناہید سکندر مرزا کے ذوق ہائے فراواں کی داستان بھی پہلی بار تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے البتہ ایوب خان کا کردار ان کی خود نوشت سے مختلف نہیں۔ خصوصاً شہاب کے بارے میں ایوب خان کے نرم گوشے سے بھی تاریخ کا طالب علم آگاہ ہے، لیکن شہاب ایوب کے سبھی کارناموں سے متفق نہ تھے اور اس کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے اس کی داستان ہماری نظروں سے اوجھل تھی۔ ادیبوں اور نامی شاعروں کو رشوت دینے کے بارے میں شہاب نامے اور اس کتاب کے مندرجات میں بھی نمایاں فرق ہے جس کی روشنی میں قاری خود فیصلہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح گورنمنٹ ہاؤس کے باقی کردار بھی چلتے پھرتے ہمارے سامنے ہیں جس سے ایوانِ صدر کے معمولات کا پتہ چلتا ہے۔ دو چار کردار خاص طور پہ اہمیت رکھتے ہیں۔ رشوت ستانی اور لوٹ کھسوٹ کے بعض ایسے نقشے سامنے آتے ہیں، جس سے پاکستان کے آفیسر آہستہ آہستہ کینسر زدہ ہوئے بیان کی ہے۔ مثلاً ایوب خان کے رفاہی فنڈ اور قائد اعظمؒ کے مزار کو سونے کی کان بنا لینے کے واقعات پہلی بار پبلک میں آئے ہیں۔ ایوانِ صدر میں قیام پذیر سبھی افسروں کے کردار پر بھی سرچ لائٹ ڈالی گئی ہے، خصوصاً قادیانی عہدہ داروں کے طرز عمل اور ان کے طریقِ واردات کو جس خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے اس پر خالد صاحب کو جس قدر داد دی جائے کم ہے۔

خالد بعض واقعات کے عینی شاہد ہیں اور اس کے ڈرامائی پہلوؤں کو بھی چابکدستی سے بیان کرتے ہیں۔ ان اہم واقعات سے چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے:

تاریخ خود کو دہرانے میں کتنی بے رحم ہے۔ خواجہ ناظم الدین کو جس روز وزارت عظمیٰ سے "ڈس مس" کیا گیا وہ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ خواجہ صاحب کا پروگرام نماز جمعہ کے بعد

حیدر آباد جانے کا تھا۔ غلام محمد کے ملٹری سیکرٹری کرنل حامد نواز نے ٹیلی فون پر بتایا کہ گورنر جنرل صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ خواجہ صاحب نے معذرت پیش کی کہ جمعہ کی نماز کا وقت قریب ہے حیدر آباد واپسی پر حاضر ہوں گا۔ اِدھر اصرار ہوا کہ چند منٹ کے لیے تشریف لے آیئے۔

خواجہ صاحب تشریف لے آئے۔ ٹخنوں کے اوپر تک شرعی پاجامہ، ہلکے براؤن رنگ والی شارک سکن کی پرشکن شیروانی۔ ایک ہاتھ میں چھڑی دوسرے میں ٹوپی۔ میرے کمرے کے سامنے سے گزر کر گورنر جنرل کے کمرے میں داخل ہوئے۔ غلام محمد بھی جمعہ کے روز شیروانی پہنتے تھے اس روز گرے شیروانی اور گرے جناح کیپ میں ملبوس تھے۔ وہ آج کا کام آج ہی کرنے کے عادی تھے اور آج تو پہلے سے فیصلہ کئے بیٹھے تھے۔ چھوٹتے ہی خواجہ صاحب سے استعفا طلب کیا۔ خواجہ صاحب نے اسمبلی میں اپنی واضح اکثریت کا حوالہ دیا۔ غلام محمد کا پارا ایک لخت چڑھ گیا اور گرجے

I dismiss you

یہ کہا اور کھڑے ہو گئے۔ خواجہ صاحب پریشانی کے عالم میں کمرے سے باہر نکلے تو اپنی ٹوپی غلام محمد کی میز پر ہی بھول آئے۔ اکھڑے اکھڑے قدموں سے میرے کمرے کے سامنے سے شارٹ کٹ کرتے ہوئے پورچ میں پہنچے۔ گاڑی سے جھنڈا اترا ہوا تھا۔ موٹر سائیکل سوار جا چکے تھے۔ خواجہ صاحب کے ڈرائیور نے کار کا دروازہ کھولا۔

اسی گورنر جنرل ہاؤس میں قائداعظمؒ کی وفات کے بعد تین برس شاہانہ ٹھاٹھ سے گزارے تھے۔ اپنی اور سٹاف کی تفریح کی خاطر کتے اور بھیڑیئے اور کتے اور ریچھ کی لڑائی کروائی۔ مرغوں کے دنگل آراستہ کروائے۔ نیازیں بٹوائیں۔ ضیافتیں اڑائیں۔ مگر آج اسی گھر سے نکلتے وقت خواجہ صاحب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دایاں قدم اٹھانا ہے یا بایاں۔ تھوڑی دیر بعد غلام محمد بھی کمرے سے باہر تشریف لے آئے۔ آج ٹانگوں کا لنگ قدرے کم تھا اور فاتحانہ مسکراہٹ لبوں پر رقص کناں تھی۔

"ساڑھے نو بجے ہمارے ٹائپ رائٹر خاموش ہو گئے۔ ہم دونوں کو جنرل شیر بہادر

اپنی نگرانی میں ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر نوازش علی کے کمرے میں لے گئے جو بالکل دوسرے کونے میں تھا۔ تھوڑی دیر بعد سکندر مرزا بھی وہیں تشریف لے آئے۔

ٹھیک دس بجے رات جنرل محمد ایوب خان تشریف لے آئے۔ اُن کے ہمراہ لیفٹیننٹ جنرل ڈبلیو اے برکی اور لیفٹیننٹ جنرل اعظم خان بھی تھے۔ سکندر مرزا کو سلیوٹ کے بعد جنرل ایوب خان گویا ہوئے:

Everything O.K. Sir, operations Complete

ہاتھ ملائے گئے قہقہے بلند ہوئے۔ سکندر مرزا نے اشارہ کیا۔ چار پانچ خدمت گار ٹرے میں وسکی سوڈا کے چھلکتے ہوئے گلاس سجائے ایک ساتھ داخل ہوئے۔ کمرے میں آب نوش صرف میں اور نصرت تھے ہمارے لئے جوس کے گلاس آ گئے۔

سکندر مرزا چسکیاں لیتے لیتے یکدم سنجیدہ ہو گئے۔ ایوب خان کا بازو پکڑا اور کان کے پاس منہ لے جا کر پوچھا:

Ayub, Will I be alive tomorrow

ایوب خان نے مسکرا کر سکندر مرزا کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔

تبسمے بر لب او رسیدہ وہ ہیچ نہ گفت "

موجودہ کتاب کا خلاصہ پیش کرنا نہیں چاہتا۔ یہ کام قاری کو خود ہی کرنا پڑے گا۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ایک مدت کے بعد ہمارے تاریخی سرمایے میں ایک اور اہم اضافہ ہوا ہے۔ اس پر م۔ ب خالد لائق تحسین و آفرین ہیں۔ وہ مورخ نہ سہی لیکن انہوں نے یہ داستان بیان کر کے مورخین کو آئینہ دکھایا ہے۔

وحید قریشی

۲ر جون ۱۹۸۸ء

مصنّف

بیان حلفی

۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ میں وزارتِ مواصلات کی ریلوے ڈویژن میں سٹینوگرافر تھا کہ دستور ساز اسمبلی میں انگلش رپورٹر کی ایک اسامی اور گورنر جنرل آف پاکستان کے پرسنل اسسٹنٹ کی اسامی کے لیے مقابلے کے امتحان ہوئے۔ میں نے دونوں امتحانوں میں شرکت کی اور حسنِ اتفاق سے دونوں جگہ میں واحد کامیاب امیدوار قرار دیا گیا۔ اُن دنوں دستور ساز اسمبلی کے رپورٹر کا بنیادی سکیل گورنر جنرل کے پی اے کے بنیادی سکیل سے زیادہ تھا۔ میں چونکہ معاشی بدحالی کا شکار تھا اس لیے رپورٹر کی اسامی کو ترجیح دی اور دستور ساز اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدّین خاں کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ مولوی صاحب پان چبا رہے تھے۔ پیک دان میں تھوک کر فرمایا کہ اسامی بنگالی کے لیے مختص ہے جیسے ہی ڈھنگ کا بنگالی مل گیا تمھیں جگہ خالی کر کے واپس ریلوے ڈویژن میں جانا پڑے گا۔ سوچ لو۔ مولوی صاحب کی صاف گوئی نے خوف زدہ کر دیا اور میں نے پی اے کی اسامی کو غنیمت سمجھ کر گورنر جنرل ہاؤس کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ گورنر جنرل کے سیکرٹری جناب کے ایس اسلام میرے منتظر تھے اور ریلوے ڈویژن کے ڈائریکٹر جنرل کو بتا چکے تھے کہ گورنر جنرل غلام محمد نے مسٹر خالد کو فوراً طلب کیا ہے۔ میں نے چارج رپورٹ پر دستخط کیے اور اسی دن یعنی ۲۳؍اگست ۱۹۵۲ء سے مذکورہ سولہ برسوں کے روزِ اوّل کا آغاز عمل میں آیا۔

میں اس وجہ سے دل گرفتہ تھا کہ دستور ساز اسمبلی میں زیادہ تنخواہ والی

نوکری نہ مل سکی مگر ٹھیک دو سال دو ماہ گزرے تھے کہ ۲۴ اگست ۱۹۵۴ء کو گورنر جنرل نے دستور ساز اسمبلی توڑ دی اور اسمبلی کے سب ملازمین مارے مارے پھرتے دکھائی دیے۔ اسمبلی کو توڑنے کے احکام میں نے ہی ٹائپ کیے تھے۔ اور وہ قلم جس سے گورنر جنرل نے اُن احکام پر دستخط ثبت کیے تھے اپنی ریٹائرمنٹ پر وہ مجھے تحفتاً دے گئے۔ سبز رنگ کا یہ شیفر رڈ قلم میرے پاس محفوظ ہے اور میں اسے آثار قدیمہ کے طور پر سنبھال کر رکھے ہوئے ہوں۔

۱۹۵۶ء میں چوہدری محمد علی کے خلوص اور کاوش کے نتیجے میں دستور نافذ ہوا اور ہمارا پاکستان تاج برطانیہ سے نجات حاصل کر کے اسلامی جمہوریہ کہلایا۔ گورنر جنرل نے صدر پاکستان کے عہدے کا حلف اُٹھایا اور میں پی اے ٹو گورنر جنرل سے پی اے ٹو پریذیڈنٹ آف پاکستان بنا دیا گیا۔

۱۹۵۶ء میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرنے کے بعد سیکشن آفیسرز گروپ میں شامل کر لیا گیا تاہم پبلک انٹرسٹ یا مفاد عامہ میں صدر پاکستان کی خواہش پر اُن کے ساتھ منسلک رہا۔

۱۹۶۸ء میں آر سی ڈی کے صدر دفتر تہران میں ڈپٹی ڈائریکٹر (کلچر) کے عہدے کے لیے چن لیا گیا اور ایران جاتے ہوئے اپنے ذاتی کاغذات ہمراہ لے لیے۔ وہیں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۸ء تک کی یادداشتوں کے نوٹس تیار کیے۔ لکھنے لکھانے کا تھوڑا بہت چسکا تھا۔ لاہور کے سیارہ ڈائجسٹ میں بشیر خالد کے نام سے لکھنا شروع کر دیا۔ ایک مضمون پر جس میں غلام محمد کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی تھی خاصی تعداد میں تعریفی خطوط موصول ہوئے۔ مگر ساتھ ہی سرکار کی طرف سے انتباہ بھی کہ اس نوعیت کی تحریر بغیر سرکار کی پیشگی منظوری کے چھپوانے سے اجتناب کروں۔ پھر کیا تھا بس بستہ سمیٹ لیا کہ دڑوٹ زمانہ کٹ بھلے دن آون گے۔

دسمبر ۱۹۸۴ء میں ریٹائر ہونے پر آزادی ملی اور دوبارہ سلسلہ شروع

گیا۔ روزنامہ نوائے وقت نے اعانت فرمائی، پریزیڈنٹ ہاؤس میں سولہ سال کے عنوان سے قسط وار مشاہدات شائع ہوتے رہے جو اس کتاب میں ترامیم اور اضافے کے ساتھ قارئین کی خدمت میں حاضر ہیں۔

کتاب کو ماہ و سال کے حوالے سے ترتیب نہیں دیا۔ تاہم السابقون السابقون کے اصول پر پہلے غلام محمد، پھر اسکندر مرزا اور آخر میں ایوب خان کے ادوار کے دوران مشاہدات کا تذکرہ ہے۔ کتاب کا ایک حصہ ان حضرات کے متعلق ہے جن سے مجھے ایوانِ صدر میں واسطہ پڑا اور جن میں سر فہرست قدرت اللہ شہاب ہیں۔

غلام محمد، اسکندر مرزا اور ایوب خاں اس دُنیا سے رُخصت ہو چکے ہیں اور اُن کے نامہ اعمال پر فیصلہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں۔ یہ تینوں تاریخ ساز شخصیتیں تاریخ دانوں کے نزدیک متنازع رہی ہیں اور اُن کے بُرے بھلے اقدام کے ثمرات سے ہم ابھی تک نجات نہیں پا سکے ہیں۔ ان تین سربراہانِ مملکت کے قریب رہتے ہوئے میں نے جو دیکھا اور محسوس کیا اُسے پوری دیانتداری سے رقم کر دیا ہے۔ نتائج اخذ کرنا قاری کی صوابدید پر منحصر ہے۔

اس وقت ہم مختلف النوع علاقائی و لسانی تعصبات کا شکار ہیں جس کے سبب پوری قوم فرد فرد ہے۔ جب تک اِن تعصبات سے رہائی حاصل نہ ہو ہم اپنی گزشتہ خطاؤں کا نہ صحیح ادراک حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اپنی آیندہ سمت کا صحیح تعین۔ اگر اس کتاب کے مطالعہ سے ایسا ممکن ہو سکا تو میں سمجھوں گا میری یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی۔

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ ہماری تاریخ کا بڑا اہم واقعہ ہے۔ مجھے کئی احباب نے کہا کہ "اندر کی بات" بتاؤں حالانکہ اس سلسلے کا "اندر" جی ایچ کیو تھا ایوان صدر نہیں تھا۔ ایوانِ صدر میں ہم صرف صدرِ پاکستان کے چہرے کو دیکھ اور پڑھ سکتے تھے جس پر پریشانی اور سراسیمگی کی ملی جلی کیفیت جھلکتی تھی اور جو روز پچھلے دن سے سوا نظر آنے لگی تھی۔ ضروری نہیں کہ یہ پریشانی اور سراسیمگی فیلڈ

مارشل میں عزم و جرأت کے فقدان کا سبب ہو۔ جس ملک کی ساری دفاعی ضروریات کا دارمدار ایک ہی سُپر پاور پر ہو اور وُہ فاضل پُرزے بھی سپلائی کرنے سے انکار کر دے۔ اپنے مالی وسائل بھی ایسے نہ ہوں تو سراسیمگی کا سبب سمجھ میں آجاتا ہے۔

آں کہ شیران را کند روباہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

احتیاج کی اِس کیفیت کا ذمہ دار ایوب خاں نہیں تھا اور نہ ہی ایوب خاں کے پیش رو تھے۔ یہ صرف پاکستان کا ہی المیہ نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا پرانا روگ ہے۔ دور نہ جائیں اسی خطہ پر نظر رکھیں تو دیکھتے ہیں جس زمانے میں یورپ میں صنعتی انقلاب آیا عین اُس وقت ہمارے جہاں پناہ اور ظلِ الٰہی ساری دولت مقبروں کی تعمیر پر صرف کرنا شروع ہو گئے۔ وہاں لوہے کی مشین اور زنجیریں بنیں ہم نے اپنے لیے پتھر کے تاج محل بنائے۔ نتیجہ؟

یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد

م ب خالد

پہلا حِصّہ

جو بھی نِکلا تیری محفل سے پریشاں نِکلا

ایوانِ صدر میں اپنی سولہ (۱۶) سالہ مدت ملازمت کے دوران میں مجھے تین سربراہانِ مملکت کے ذاتی اسٹاف پر کام کرنے کا موقع ملا۔

۱۔ ملک غلام محمد۔

۲۔ میجر جنرل اسکندر مرزا۔

۳۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان۔

۱۹۵۲ء میں غلام محمد کے پرسنل اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام شروع کرتے وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھے اتنے قریب سے اہم ترین تاریخ ساز واقعات کا مشاہدہ کرنا ہوگا۔ اپنے وطنِ عزیز کی قسمت سے کھیل تماشہ نظروں سے گزرے گا۔ بڑے لوگوں کی چھوٹی اور چھچھوری باتیں، بہادروں کی بزدلی، ایمانداروں کی بے ایمانی، سچوں کے جھوٹ اور پڑھے لکھوں کی جہالت، سب کچھ دیکھوں گا اور دیکھتا رہ جاؤں گا۔

حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو خواجہ ناظم الدین بکمال رضا و رغبت قصرِ صدارت سے قصرِ وزارتِ اعظمیٰ میں منتقل ہوگئے۔ خواجہ صاحب کے بعد قصرِ صدارت سے جو بھی نکلا وہ بقول شاعر "یا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے۔"

تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے خالدؓ بن ولید کو اسلام کی سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کیا تو خالدؓ دل برداشتہ ضرور تھے کہ اللہ کی تلوار نیام میں جا رہی تھی اور شہادت کی تمنا پوری نہ ہو سکی تھی مگر حرف

شکایت زبان پر نہ لائے۔

اسی طرح جب حضرت عمرؓ نے جناب عمارؓ بن یاسرؓ کو گورنری کے عہدے سے سبکدوش کیا تو جناب رسالتمآبؐ کی نگاہوں میں عمارؓ کی قدرومنزلت یاد آئی۔ پوچھا کہ تم میرے اقدام سے ناراض تو نہیں ہوئے؟ عمارؓ کا جواب مختصر مگر جامع تھا۔ کہنے لگے، نہ اپنی تقرری پر خوشی ہوئی تھی اور نہ معزول کیے جانے پر رنجیدہ ہوں۔ تم نے میرے پاس امانت رکھوائی تھی جسے واپس لے لیا۔ ناراضگی کی کونسی بات ہے۔ ایسے کئی واقعات مطالعہ کے لیے تو ملتے ہیں مشاہدے کے لیے ایک واقعہ بھی نہیں ملتا۔

۱۹۵۵ء میں غلام محمد کو سبکدوشی پر بمشکل تمام رضامند کر لیا گیا۔ رخصتی والے دن گورنر جنرل ہاؤس کراچی سے لیکر کلفٹن میں اُن کی رہائش گاہ "نشیمن" تک سلامی کے لیے فوجی دستہ متعین کر دیا گیا تھا۔ غلام محمد کو جب گاڑی میں بٹھا چکے تو اسکندر مرزا نے مجھے اور ایک اے ڈی سی کو اشارہ کیا کہ ساتھ بیٹھ جائیں اور گھر تک چھوڑ آئیں۔

راستہ بھر غلام محمد سلامی لیتے گئے اور اندرونی اثرات کو چہرے کے خارجی حدود سے دور رکھا۔ گھر کے دروازے پر اُن کی بیٹی اقبال بیگم، اُس کا شوہر حسین ملک اور دیگر افرادِ خانہ استقبال کے لیے موجود تھے۔ سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نجی نوعیت کا ہی سہی تھا تو استقبال۔ لہٰذا قبولِ خاطر تھا۔ اپنے کمرے میں جا کر غلام محمد ابھی بیٹھے ہی تھے کہ اسکندر مرزا، چوہدری محمد علی اور ڈاکٹر خان صاحب تشریف لے آئے۔ اُن پر نظر پڑتے ہی غلام محمد بے قابو ہو گئے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ روتے روتے کچھ کہنے کی کوشش بھی کی مگر کسی کے کچھ پلے نہ پڑ سکا۔ اسکندر مرزا دبی مسکراہٹ کے ساتھ تسلیاں دینے لگے۔ چودھری محمد علی اور ڈاکٹر خان صاحب سنجیدہ کھڑے رہے۔ میں اس سے قبل غلام محمد کو دو دفعہ روتا دیکھ چکا تھا۔ ایک بار مسجدِ نبوی میں

روضۂ اطہر و اقدس کے سامنے اور دُوسری بار بالاکوٹ میں سید احمد شہیدؒ کے مزار پر۔ مگر آج کا رونا کچھ اور طرح کا رونا تھا۔ اُس رونے میں آواز پر قابو تھا آنسو بے قابو تھے۔ آج کے رونے میں آنسو ناپید مگر آواز بے قابو تھی۔ البتہ اسکندر مرزا کی مُسکراہٹ اور غلام محمد کا رونا ایک ہی تصویر کے دو رُخ تھے۔ اسکندر مرزا غلام محمد کے رو دینے پر مسکرا اُٹھا تو غلام محمد اسکندر مرزا کے مسکرانے پر رو دیا۔ ایک اپنے انجام سے باخبر ہو کر رو رہا تھا دُوسرا بے خبری کے عالم میں مُسکرا رہا تھا۔

تاریخ خود کو دوہرانے میں کتنی بے رحم ہے۔ خواجہ ناظم الدّین کو جس روز وزارتِ عظمٰی سے "ڈس مس" کیا گیا وُہ جمعتہ المبارک کا دن تھا۔ خواجہ صاحب کا پروگرام نمازِ جمعہ کے بعد حیدر آباد جانے کا تھا۔ غلام محمد کے ملٹری سیکرٹری کرنل حامد نواز نے ٹیلیفون پر بتایا کہ گورنر جنرل صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ خواجہ صاحب نے معذرت پیش کی کہ جمعہ کی نماز کا وقت قریب ہے حیدر آباد سے واپسی پر حاضر ہوں گا۔ اِدھر سے اصرار ہوا کہ چند منٹ کے لیے تشریف لے آیئے۔

خواجہ صاحب تشریف لے آئے۔ ٹخنوں کے اوپر تک شرعی پاجامہ، ہلکے براؤن رنگ والی شارک سکن کی پرشکن شیروانی۔ ایک ہاتھ میں چھڑی دوسرے میں ٹوپی۔ میرے کمرے کے سامنے سے گزر کر گورنر جنرل کے کمرے میں داخل ہوئے۔ غلام محمد بھی جمعہ کے روز شیروانی پہنتے تھے، اُس روز گہرے شیروانی اور گہرے جناح کیپ میں ملبوس تھے۔ وُہ آج کا کام آج ہی کرنے کے عادی تھے اور آج تو پہلے سے فیصلہ کیے بیٹھے تھے۔ چھوٹتے ہی خواجہ صاحب سے استعفٰی طلب کیا۔ خواجہ صاحب نے اسمبلی میں اپنی واضح اکثریت کا حوالہ دیا۔ غلام محمد کا پارا ایک لخت چڑھ گیا اور گرجے

I dismiss you

یہ کہا اور کھڑے ہو گئے۔ خواجہ صاحب پریشانی کے عالم میں کمرے

سے باہر نکلے تو اپنی ٹوپی غلام محمد کی میز پر ہی بھول آئے۔ اُکھڑے اُکھڑے قدموں سے میرے کمرے کے سامنے سے شاٹ کٹ کرتے ہوئے پورچ میں پہنچے۔ گاڑی سے جھنڈا اُترا ہوا تھا۔ موٹر سائیکل سوار جا چکے تھے۔ خواجہ صاحب کے ڈرائیور نے کار کا دروازہ کھولا۔

اِسی گورنر ہاؤس میں قائدِاعظم کی وفات کے بعد تین برس شاہانہ ٹھاٹھ سے گزارے تھے۔ اپنی اور سٹاف کی تفریح کی خاطر کتّے اور بھیڑیے اور کتّے اور ریچھ کی لڑائی کروائی۔ مرغوں کے دنگل آراستہ کروائے، نیازیں بٹوائیں، ضیافتیں اُڑائیں۔ مگر آج اُسی گھر سے نکلتے وقت خواجہ صاحب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دایاں قدم اُٹھانا ہے یا بایاں۔ تھوڑی دیر بعد غلام محمد بھی کمرے سے باہر تشریف لے آئے۔ آج ٹانگوں کا لنگ قدرے کم تھا اور فاتحانہ مسکراہٹ لبوں پر رقص کناں تھی۔

قومی دستور ساز اسمبلی کو توڑا۔ امریکہ سے محمد علی بوگرا کو بلایا۔ بلا کر بٹھایا۔ بٹھا کر اُٹھایا۔ اُٹھا کر نکالا۔ غرض ہنستے ہنسانے کے بیشمار مواقع پیش آتے رہے تھے۔ مگر ہنسنے ہنسانے کا بھی شاید ایک کوٹہ ہوتا ہے جو ایک نہ ایک دن ختم ہو سکتا ہے اور رونے دھونے کی باری آسکتی ہے۔ آج غلام محمد کیلئے گورنر جنرل ہاؤس کی وسیع و عریض عمارت کی بجائے چھوٹے سے مکان کا مختصر کمرہ تھا۔ تخت چھن چکا تھا۔ تختے کا انتظار تھا۔

غلام محمد کا نالہ و شیون اور اسکندر مرزا کے لبِ خنداں، اس شعر کی تفسیر تھے۔

میں روحِ سفر ہوں مجھے ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ

دن گزرتے رہے گھڑیاں بیتتی رہیں۔ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کا دن آگیا۔ بعد دوپہر اسکندر مرزا کا ذاتی خدمتگار عبدالستار میرے کمرے میں داخل ہوا۔ عبدالستار کبھی کبھی سینے کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے میرے کمرے میں آیا کرتا تھا کہ آخر

محرمِ رازِ درونِ میخانہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ پہلے اِدھر اُدھر دیکھے گا پھر آنکھ مار مار کر" اندرونِ خانہ" کے لطیفے اُگلے گا مگر آج وُہ بھی جلدی میں تھا۔ کہنے لگا ساب جی لاٹ صاب نے کہا ہے کہ آپ شام پانچ بجے دفتر آجائیے ضروری کام ہے۔

شام پانچ بجے میں دفتر میں تھا۔ میرے علاوہ اسکندر مرزا کا پرسنل سیکرٹری نصرت (این ڈی احمد) بھی تھا۔ ہم دونوں ساڑھے چھ تک چائے پیتے اور گپیں مارتے رہے۔ تاریکیاں پھیلنے کو تھیں کہ میجر جنرل شیر بہادر کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ جائنٹ چیفس سیکرٹریٹ کے سربراہ تھے۔ چھوٹے قد کے آدمی تھے۔ مونچھوں کو بڑھا کر شخصیت کی کمی کو پورا کرنے کی پوری کوشش کر رکھی تھی۔ ہم دونوں سے ٹائپ کی مشینیں درست کروائیں۔ بریف کیس میں سے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو کاغذ نکالے۔ ایک مجھے تھمایا دُوسرا نصرت کو۔ ٹائپ رائٹر کھٹ کھٹا کھٹ چلنے شروع ہو گئے۔ میرے حصّے میں آنے والے کاغذ کا عنوان کا Proclamation دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ پاکستان کا دستور منسوخ، قومی اور صوبائی اسمبلیاں برخاست، کیبنٹ ڈس مس۔ صوبائی حکومتیں ختم۔

ایک کے بعد دُوسرا کاغذ، مارشل لاء کا نفاذ۔ جنرل محمد ایوب خان کا بحیثیت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور سپریم کمانڈر تقرر، صوبوں میں ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹرز کی تقرریاں۔

تیسرا کاغذ۔ غیر ملکی سربراہانِ مملکت کے نام خصوصی پیغام۔

چوتھا کاغذ۔ غیر ملکوں میں پاکستانی سفیروں کے نام خصوصی ہدایات۔

رات کے نو بج چکے تھے۔ میں نے سوچا گھر میں بیگم کو ٹیلیفون کر دُوں کہ مصروف ہوں اور دیر سے آؤں گا۔ ٹیلیفون کا ریسور اٹھانے کو تھا کہ جنرل شیر بہادر نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ پانی کی طلب ہوئی تو جنرل صاحب خود اُٹھے۔ کاغذ ختم ہو گئے یا کاربن پیپر خراب ہوئے تو

جنرل صاحب نے سب کچھ اپنے بریف کیس سے نکال کر دیا۔ بریف کیس میں ہر قسم کی سٹیشنری موجود تھی، منصوبہ ہو تو ایسا ہو۔ باہر ٹیرس پر اسکندر مرزا ہونٹوں میں سگریٹ دبائے تیز تیز قدموں سے ٹہل رہے تھے۔ خدمت گار حسبِ معمول ٹرے میں وسکی سوڈا لایا۔ اسکندر مرزا نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

ساڑھے نو بجے ہمارے ٹائپ رائٹر خاموش ہو گئے۔ ہم دونوں کو جنرل شیر بہادر اپنی نگرانی میں ملٹری سیکرٹری، بریگیڈیئر نوازش علی کے کمرے میں لے گئے، جو بالکل دوسرے کونے میں تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسکندر مرزا بھی وہیں تشریف لے آئے۔

ٹھیک دس بجے رات جنرل محمد ایوب خان تشریف لے آئے۔ اُن کے ہمراہ لفٹیننٹ جنرل ڈبلیو اے برکی اور لفٹیننٹ جنرل اعظم خان بھی تھے۔ اسکندر مرزا کو سیلوٹ کے بعد جنرل ایوب خان گویا ہوئے۔

Everything OK Sir Operation is complete ہاتھ ملائے گئے، قہقہے بلند ہوئے۔ اسکندر مرزا نے اشارہ کیا۔ چار پانچ خدمت گار ٹرے میں وسکی سوڈا کے چھلکتے ہوئے گلاس سجائے ایک ساتھ داخل ہوئے۔ کمرے میں اب نوش صرف میں اور نصرت تھے، ہمارے لیے جوس کے گلاس آ گئے۔

اسکندر مرزا چسکیاں لیتے لیتے یکدم سنجیدہ ہو گئے۔ ایوب خان کا بازو پکڑا اور کان کے پاس منہ لے جا کر پوچھا

'Ayoub, will I be alive tomorrow?

ایوب خان نے مسکرا کر اسکندر مرزا کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ زبان سے کچھ نہ کہا

تبسمے بہ لب اور سید و ہیچ نہ گفت

گیارہ بجے کھانا آگیا۔ کھانے کے بعد میں اور نصرت گھر کے لیے کھسکنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ہمارے تیسرے ساتھی جنرل شیر بہادر ہمیں ایک طرف لے گئے۔ رات تقریباً تمام وفاقی سیکرٹریوں کو طلب کیا گیا۔ دو بجے رات غیر ملکی سفیر بلائے گئے۔ وسکی، کوک، چائے، کافی، سگریٹ، سگار، صلائے عام تھی یارانِ نکتہ داں کے لیے۔

میرا اور نصرت کا گھر گورنر جنرل ہاؤس کی چار دیواری کے اندر ہی واقع تھا۔ صبح چار بجے گھر پہنچے۔ میری بیگم رات بھر جاگتی رہیں کہ میں کہاں فرار ہو گیا۔ کہنے لگیں ساری رات ٹیلیفون خراب رہا۔ میں نے کہا اب دیکھیے۔ ریسیور اُٹھایا تو کہنے لگیں ہائے اللہ! اب تو ٹھیک ہے۔

شروع میں اسکندر مرزا خوش باش تھے اور مورال بھی ہائی تھا۔ پھر بتدریج فرق پڑنا شروع ہو گیا۔ اسکندر مرزا اور ایوب خان کے بیانات میں تضاد نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ بیگم ناہید اسکندر مرزا شوہر سے ناخوش نظر آنے لگیں اور مزاج چڑچڑا ہو گیا۔ شوہر کے ساتھ بات چیت میں لہجہ درشت۔ آخر آنے والی گھڑی آگئی۔ ستائیس اور اٹھائیس اکتوبر کی درمیانی رات صبح پانچ بجے میں حسبِ معمول سیر کی غرض سے گھر سے نکلا تو دُور سے پولیس انسپکٹر چوہدری بہاول بخش آتے دکھائی دیے۔ مجھے ہاتھ سے سلام کر کے کچھ اشارہ کیا۔ قریب آئے تو سرگوشی میں کہا "لے گئے۔"

کسے لے گئے؟ میں نے پوچھا۔

"اسکندر مرزا کو۔"

"کہاں؟"

"پتہ نہیں"، پھر بغیر توقف کے تفصیل بتانے لگے۔ "رات دس بجے مجھے ٹیلیفون پر بلایا گیا۔ میں پہنچا تو میری کرسی پر ایک میجر صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ایوانِ صدر کی ساری پولیس فورس سے اسلحہ لیا جا رہا تھا۔ دو

ٹرکوں میں آئے ہوئے فوجی Battle dress میں ملبوس پوزیشن
لے رہے تھے۔ حکم کے مطابق میں نے اپنا پستول میجر صاحب کے حوالے
کر دیا۔ مجھے اور میرے ماتحت افسروں کو ساتھ والے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔
باہر ذرا ہٹ کر باقی پولیس فورس بیٹھتی جاتی۔
کافی رات گئے کچھ گاڑیاں گیٹ سے باہر نکلیں۔ انہی میں سے کسی
ایک گاڑی میں اسکندر مرزا اور بیگم صاحبہ سوار تھے۔ ہم نے اسی کمرے میں
رات گزاری۔ اب اجازت ملی ہے۔"
ناشتے کے بعد دفتر پہنچا تو ایوانِ صدر میں پُراسرار سکوت طاری تھا۔
تھوڑی دیر بعد چپڑاسی کارروائی کی سنی سنائی روداد اپنے اپنے افسروں
کو سنا رہے تھے۔ دیکھا کسی نے بھی نہ تھا۔ چپڑاسی نے بیرے سے، بیرے
نے خدمت گار سے، خدمت گار نے سنتری سے اور سنتری نے کسی اور سے
سُنا تھا۔ راویوں کی کڑی لمبی اور روایت کی تصدیق دشوار تھی۔ مگر حدیث
اگرچہ ضعیف است راویاں ثقہ اند کے مطابق رات گیارہ بجے جنرل برکی،
جنرل اعظم خان اور جنرل کے ایم شیخ اپنے سپریم کمانڈر جنرل ایوب خان
کی ہدایت پر تشریف لائے۔
اسکندر مرزا اور بیگم ناہید مرزا اپنے بیڈ روم میں جا چکے تھے۔ اُنھوں
نے دروازہ کھلوایا اور اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ اسکندر مرزا بغیر کسی مزاحمت
کے آمادہ ہو گئے مگر بیگم مرزا کے چیخ چیخ کر بولنے کی آوازیں آئیں۔ پھر
"چٹاخ" کی آواز جس کے بعد مکمل سکوت۔ ایک بجے تک ضروری سامان
تیار کر چکے تھے۔ تینوں جرنیل دونوں میاں بیوی کو "تیغوں کے سائے"
میں ماڑی پور (موجودہ مسرور) کے ہوائی اڈے پر لے گئے جہاں ایئر فورس
کا خصوصی طیارہ منتظر کھڑا تھا۔
بہادر شاہ ظفر کے بعد یہ دوسرے مغل فرمانروا تھے جنہیں دفن کیلئے

؎ دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں۔

سکندر مرزا اپنی وصیّت کے مطابق اپنے سسرال (تہران) میں دفن ہیں۔

بقول سیف الملوک کے مصنّف میاں محمد بخشؒ

پینگھاں بہت ہلارے چڑھیاں ٹٹ زمین تے جھڑیاں
گڑیاں فیر نہ مڑیاں پیکے سوہریاں چھک کھڑیاں
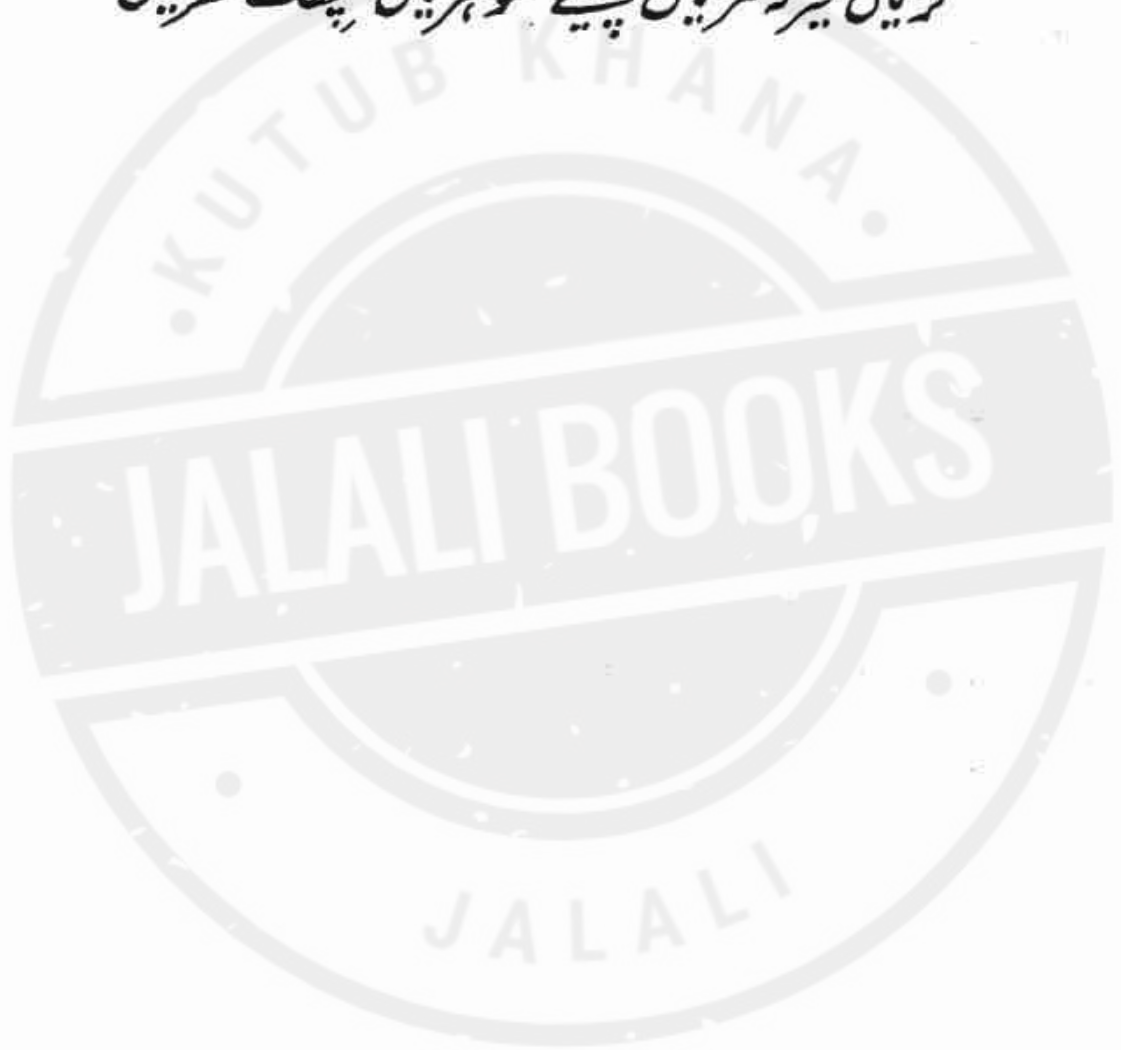
جمہوریہ پاکستان کے پہلے صدر کو آخری سلام

نوائے وقت نے ۱۰ مئی ۱۹۸۵ء کو ڈرامے کے ایک کردار لیفٹیننٹ جنرل کے ایم شیخ کا انٹرویو شائع کیا جس میں جنرل صاحب نے فرمایا:

"میں اور صدر ایوب مرحوم مشرقی پاکستان گئے ہوئے تھے۔ کراچی واپسی پر فوج کے ڈائریکٹر انٹیلی جنس بریگیڈیر حیات ہمیں ماڑی پور ایئر پورٹ پر آکر ملے اور مجھے کہا کہ میں جنرل ایوب خاں سے ایک نہایت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں اگر آپ اُن سے کار میں بیٹھنے کی اجازت لے دیں تو میں کار میں ہی بات کروں گا۔ میں نے جنرل ایوب سے اِس موضوع پر بات کی۔ انھوں نے اجازت دے دی۔ راستے میں بریگیڈیر حیات نے بتایا کہ آپ کی غیر حاضری میں کموڈور عبدالرب جو ایئر فورس کے وہاں پر انچارج تھے کو سکندر مرزا نے کہا ہے کہ کراچی کی فوج کا محاصرہ کر کے انقلاب لے آئیں۔ مگر ایئر کموڈور نے یہ اطلاع بریگیڈیر حیات کو دے دی۔ اس سازش کا سُننے کے دُوسرے دن فیصلہ کیا گیا کہ اسکندر مرزا کو دست بردار ہونے کو کہا جائے۔ اس کے لیے میں جنرل برکی اور جنرل اعظم ایوانِ صدر گئے۔ انھیں پیغام بھیجا کہ نیچے تشریف لے آئیں آپ سے بات کرنا ہے۔ اسی دوران فوج کا ایک دستہ ایوانِ صدر کا محاصرہ کر چکا تھا۔ صدر اسکندر مرزا

آئے، میں نے انھیں سیلوٹ کیا اور کہا:

Sir I have a very unpeasant duty to perform and I will be grateful if you will kindly sign this paper

یہ کہہ کر میں نے انھیں کاغذ پیش کر دیا۔ اسے پڑھنے کے بعد وُہ مُسکرائے اور اُس پر دستخط کر دیے۔ انھیں اس موقع پر نہ کسی نے چانٹا مارا اور نہ کسی نے ریوالور دکھایا۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ صدر کے اسٹاف کے لوگ عجیب و غریب باتیں کر رہے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس وقت ہمیں خطرہ تھا کہ بیگم اسکندر مرزا نیچے تشریف نہ لے آئیں۔ اگر وُہ نیچے آجاتیں تو یقیناً کچھ نہ کچھ ضرور کہتیں، اس موقع پر صورتِ حال ناخوشگوار ہو جاتی۔ لیکن خُدا کا شکر ہے سکندر مرزا تنہا ہی تشریف لائے۔ اُنھیں دُوسرے دن کوئٹہ پہنچا دیا گیا جہاں وُہ ریذیڈنسی میں دو دن ٹھہرے۔ اسی اثنا میں اُن کی دو پنشن ایک بحیثیت صدر اور دُوسری بحیثیت سی ایس پی آفیسر جاری کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ اس انتظام کے بعد انھیں کراچی لا کر باعزت طریقہ سے لندن روانہ کیا گیا۔"

اسی اخبار (نوائے وقت) نے ۱۴ جون ۱۹۸۵ء کو سینیئر بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) محمد حیات کا انٹرویو شائع کیا۔ بریگیڈیئر حیات مارشل لا کے نفاذ کے وقت کراچی میں ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ تھے۔ وُہ فرماتے ہیں:

" یہ بات غلط ہے کہ ایوب خان نے ہوسِ اقتدار سے مجبور ہو کر سکندر مرزا کا تختہ اُلٹا۔ سکندر مرزا اور ایوب خان کے باہمی تعلّقات بے حد دوستانہ تھے۔ ۱۹۵۸ء سے قبل یہ صورتِ حال تھی کہ آئے دن وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہتی تھیں۔ وزیرِاعظم نامزد

ہوتے اور چند روز بعد گھروں کو واپس بھیج دیے جاتے۔ سیاسی راہنما اپنی جماعتیں تبدیل کرتے رہتے۔ ان حالات میں سکندر مرزا نے حالات پر قابو پانے کے لیے ایوب خان کو مارشل لا لگانے کا مشورہ دیا اور سکندر مرزا نے انھیں وزیرِ اعظم بنانے کی خواہش ظاہر کی، لیکن اُس زمانے میں وزیرِ اعظم آئے دن بنتے رہتے تھے۔ کئی جرنیلوں نے ایوب خان کو مشورہ دیا کہ وُہ وزارتِ عظمیٰ قبول نہ کریں کیونکہ عین ممکن ہے سکندر مرزا وزیرِ اعظم کے بعد ایوب خان کو بھی چلتا کر دے۔ تین دن تک ۲۰ سینیئر فوجی افسران ایوب خان کے گرد رہے کہ سکندر مرزا کو فارغ کرو۔ چنانچہ ایوب خان نے سکندر مرزا کی چھٹی کرانے کا فیصلہ کیا۔ اِس نے دُہ استعفےٰ ٹائپ کیا جس پر سکندر مرزا نے دستخط کیے جس کی عبارت یہ تھی:

"لوگ مجھے سربراہ مملکت قبول نہیں کرتے لہٰذا میں استعفےٰ دیتا ہوں۔"

یہ عبارت ٹائپ کرنے کے بعد تین جرنیلوں جنرل برکی، جنرل اعظم اور جنرل شیخ نے اسے پڑھا اور جنرل اعظم یہ چِٹ لے کر سکندر مرزا کی رہائش گاہ میں لے گئے۔ اس سے قبل ملٹری نے سکندر مرزا کی رہائش گاہ میں موجود پولیس اور گارڈ کو ہٹا دیا تھا۔ جنرل اعظم نے وُہ چِٹ آگے کر دی اور سکندر مرزا نے خاموشی سے اس پر دستخط کر دیئے۔ تاہم اُنھوں نے کہا "میں آپ سے متفق ہوں آگے کیا ہو گا۔" اِس پر اُنھیں بتایا گیا کہ وُہ کوئٹہ چلے جائیں اور ایک ہفتہ آرام کریں۔ اس دوران وُہ غور و خوض کر کے بتائیں گے کہ وُہ ایران جانا چاہتے ہیں یا کہیں اور اُنھیں پہنچا دیا جائے گا۔ اِس کے بعد اُن کا سامان وغیرہ

تیار کروایا گیا اور انتہائی عزت و احترام سے انھیں کوئٹہ اور پھر کوئٹہ سے لندن بھیجا دیا گیا۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ سکندر مرزا کے ساتھ بدتمیزی کی گئی۔"

جنرل صاحب اور بریگیڈیئر صاحب کے مذکورہ بالا بیانات میں تضادات ہیں۔ جنرل صاحب کے مطابق سکندر مرزا سے سبکدوشی پر دستخط کروانے کیلئے جنرل شیخ کے علاوہ جنرل برکی اور جنرل اعظم خان بھی ایوان صدر تشریف لے گئے تھے اور سبکدوشی کا کاغذ جنرل شیخ نے سکندر مرزا کو پیش کیا تھا جب کہ بریگیڈیئر صاحب فرماتے ہیں کہ صرف جنرل اعظم خان نے اکیلے یہ کارنامہ انجام دیا تھا اور جنرل شیخ جائے واردات پر سرے سے موجود ہی نہ تھے۔

گورنر جنرل غلام محمدؒ

اکتوبر ۱۹۵۱ء — اکتوبر ۱۹۵۵ء

غلام محمد

لاہور کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہونے والا غلام محمد بچپن میں شاید گاماں کہلاتا ہوگا کیونکہ لاہور کے اکثر غلام محمد گامے اور معراج دین ماجھے کہلاتے تھے۔ اہلِ زبان کے ہاں جن لوگوں کو ایرے غیرے نتھو خیرے کہا جاتا ہے۔ لاہور والے اُنھیں محاورتاً ماجھے گامے کہتے ہیں۔

ماجھے گاموں میں اور کوئی خوبی ہو یا نہ ہو ایک خوبی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے یعنی دبنگ اور دلیر ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بزدل ہے تو پھر وہ گاماں ماجھا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

ایرے غیر نتھو خیروں کو کب کسی نے پوچھا ہے کہ بڑے ہو کر کیا بنو گے؟ ڈاکٹر یا انجینئر؟ بالکل یہی سلوک ماجھے گاموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر بھی بقول سعدی شیرازی۔

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

ماجھے گاموں میں کوئی نہ کوئی "دانہ" کام کا نکل ہی آتا ہے جیسے کہ مشہورِ زمانہ گاماں رستمِ زماں۔ وہ تو خیر عین شباب میں محض طاقت کے بل بوتے پر رستمِ زماں بن بیٹھا مگر ہمارے غلام محمد کو خاصے پاپڑ بیلنے پڑے۔ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے باوجود پہلے گامے سے غلام محمد، اُس کے بعد جی ایم، پھر ایف ایم (فنانس منسٹر) اور بڑھاپے میں جا کر جی جی (گورنر جنرل) بن سکا۔ پانچ قسطوں میں شخصیت کی تکمیل ہوئی۔

جی ایم کی جوانی کے کئی قصّے مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ریلوے میں اکاؤنٹس آفیسر تھے کہ اُن کے مشورے پر سپیشل ٹکٹ چیکنگ سٹاف کی بھرتی کا کام اُن کے سپردِ کیا گیا۔ روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ اُنھوں نے اخبارات میں اشتہار دیا کہ امیدوار فلاں دن انٹرویو کے لیے حاضر ہوں۔ مقررہ دن ضرورت سے کہیں زیادہ امیدواروں کا مجمع لگ گیا۔ آپ کمرے سے باہر نکلے۔ پہلے سب امیدواروں کو لائن میں کھڑا کیا پھر حکم دیا کہ مسلمان امیدوار ایک طرف کھڑے ہو جائیں۔ جب مسلمان علیٰحدہ کھڑے ہو گئے تو اعلان کیا کہ غیر مسلم جا سکتے ہیں۔ بھرتی مکمل ہو گئی ہے۔ انگریز کا دورِ حکومت تھا ایک واویلا مچ گیا۔ ہندوستان کے صوبہ یو پی میں جہاں یہ ڈرامہ کھیلا گیا تھا ہندو پریس میں زبردست اداریے لکھے گئے اور تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

جی ایم نے ریلوے میں مسلمانوں کے کوٹہ کو پورا کرنے کا جواز پیش کر کے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کو نوکریاں دلا دیں۔

دُوسری جنگِ عظیم کے دوران گورنمنٹ آف انڈیا کی وار سپلائز ڈیپارٹمنٹ میں جوائنٹ سیکرٹری تھے۔ ماتحت افسروں کے منہ پر فائلیں مارنا اور کمرے سے نکال دینا اُن کے لیے معمولی بات تھی۔ اس سلسلے میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی میں کوئی تمیز نہیں برتی جاتی تھی۔ انگریز آفیسر بھی زد میں آجاتے مگر جنگ اس قدر خطرناک صورت اختیار کرتی جاتی تھی اور وار سپلائز کا معاملہ اتنا اہم تھا کہ جی ایم جیسا مستعد اور برق رفتار سول سرونٹ نہ صرف گوارا بلکہ ناگزیر تھا۔

جنگ کے اختتام پر جی ایم کی قابلیت کی شہرت اُنھیں حیدر آباد دکن لے گئی جہاں نظام دکن کے وزیرِ خزانہ کی حیثیت سے نہ صرف مالی امور بلکہ ریاست حیدر آباد کی سیاست میں بھی اہم کردار ادا کرتے رہے۔

۱۹۴۶ء میں انٹیرم گورنمنٹ میں شمولیت کے وقت قائدِ اعظم کا مسلم لیگ

کے لیے وزارتِ خزانہ پر اصرار غلام محمد کے مشورہ سے تھا۔ برِعظیم کی تقسیم کے وقت ٹاٹا انڈسٹریز سے منسلک تھے اور دس ہزار روپیہ ماہوار وصول کرتے تھے۔ تقسیم کے وقت ٹاٹا نے بیس ہزار ماہوار کی پیش کش کی۔ بمبئی کے پارسی سیٹھ سر ہومی موڈی نے بڑی ترغیب دی مگر غلام محمد نے قائدِ اعظم کی دعوت پر تین ہزار روپیہ ماہوار کے عوض مملکتِ خداداد پاکستان میں وزارتِ خزانہ کا قلمدان سنبھال لیا۔

بھارت نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان کا سارا اثاثہ روک لیا۔ آنے والے مسلمان اپنی تمام پونجی بھارت چھوڑ آئے اور جانے والے ہندو سکھ اپنی بیشتر جائیداد منقولہ ساتھ لے گئے۔ دُنیا بھر کے ماہرین اقتصادیات پاکستان کی اقتصادی صلاحیتوں کے منکر تھے۔ غلام محمد نے جو جی ایم سے ایف ایم بن چکے تھے اپنے پہلے ہی بجٹ سے پاکستان کی اقتصادی توانائی کو ثابت کر کے دکھا دیا۔ قائدِ اعظم وزارتِ خزانہ کے لیے اپنے انتخاب پر فخر کرتے تھے۔

طبیعت کی تیزی اور سخت محنت کی وجہ سے فشارِ خون میں خوفناک حد تک اضافہ ہو گیا۔ نتیجتاً فالج کے پے در پے حملے ہوئے۔ زبان میں لکنت آ گئی اور چال میں لنگ۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ دریں اثنا قائدِ ملت لیاقت علی خان شہید کر دیے گئے۔ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل سے وزیرِ اعظم بن گئے اور غلام محمد کو اُن کی بے انتہا خدمات کے صلے میں گورنر جنرل بنا دیا گیا اور یوں وُہ ایف ایم سے جی جی کہلانے لگے۔

لاٹ صاحب

پاکستان کی تاریخ سے باخبر لوگ جانتے ہیں کہ پاکستان کا پہلا آئین ۱۹۵۶ء میں چودھری محمد علی کی وزارتِ عظمٰی کے زمانے میں پاس ہوا اور پاکستان اسلامک ریپبلک بنا۔ اس سے قبل ہم تاج برطانیہ سے منسلک رہے اور ملک کا سربراہ گورنر جنرل کہلاتا رہا جس کے تقرر کی منظوری لندن سے آیا کرتی تھی چنانچہ قائدِ اعظم، خواجہ ناظم الدین، غلام محمد اور کچھ مدت کے لیے اسکندر مرزا گورنر جنرل کہلائے جنھیں وائسرائے ہاؤس دہلی سے آیا ہوا عملہ لاٹ صاحب اور ایچ ای یا ہز ایکسی لینسی کہتا تھا۔

۲۲ اگست ۱۹۵۲ء کو جب میں نے گورنر جنرل کے پرنسپل اسسٹنٹ (P.A) کی حیثیت سے ڈیوٹی کے لیے رپورٹ کیا تو سیکرٹری ٹو ایچ ای مسٹر کے ایچ اسلام کے ذریعہ لاٹ صاحب کا حکم ملا کہ یوسف پیرزادہ صاحب کے سامنے بیٹھ کر کام دیکھتا رہوں جو اپنی خواہش پر وزارتِ خزانہ میں واپس جارہے تھے اور جن کی جگہ پر میرا تقرر ہوا تھا۔ کچھ روز بعد کاغذات اور فائلیں پڑھنے کی اجازت ملی۔

یوسف پیرزادہ کی میز پر تین مختلف رنگوں کے ٹیلیفون تھے۔ سرخ رنگ کا ٹیلیفون جس کے ایک طرف سرخ رنگ کا بلب لگا ہوا تھا۔ گورنر جنرل سے رابطہ کے لیے مخصوص تھا۔ پہلے روز جب اس ٹیلیفون کی مدھم سی گھنٹی بجی اور سرخ بلب روشن ہوا تو پیرزادہ صاحب نے اچھل کر سگریٹ بجھایا اور ریسیور اٹھا کر بس سر یس سر کہنا شروع کیا تو مجھ سے مسکرائے بغیر

نہ رہا گیا۔

بات ختم ہونے پر ریسیور رکھ چکے تو میں نے عرض کیا پیرزادہ صاحب ایش ٹرے آپ کے عین سامنے پڑی ہوئی تھی پھر آپ نے سگریٹ کو قلمدان میں رکھی ہوئی دوات میں کیوں ڈبویا اور اپنی انگلیاں گندی کیں۔ پیرزادہ صاحب نے میری طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ پھر کہنے لگے، صبر کریں خود بخود سمجھ جائیں گے۔ جس تن لاگے سو تن جانے۔

قریب ہی چپڑاسی کھڑا تھا کہنے لگا حضور جب بھی لاٹ صاحب کا ٹیلیفون آتا ہے یا وہ کمرے کے سامنے برآمدے سے گزرتے ہیں تو صاحب گھبرا کر سگریٹ کو اکثر دوات میں بجھاتے ہیں۔ میں دن میں کئی بار دوات کو صاف کر کے سیاہی بدلتا ہوں۔

ریلوے بورڈ کو خیرباد کہہ کر گورنر جنرل کے پرسنل سٹاف میں شمولیت میرے لیے باعثِ افتخار تھی مگر روزِ اوّل ہی مجھے ایک انجانے خوف نے آ لیا۔ میں نے دیکھا کہ سٹاف کا ہر ممبر گھبرایا گھبرایا اِدھر سے اُدھر یوں بھاگتا پھرتا ہے جیسے کوئی اُن کے تعاقب میں ہو۔ گفتگو رازدارانہ انداز میں سرگوشیوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ عجیب پراسرار ماحول ہے۔ اپنی ہی آواز سے ڈر لگتا ہے اور ٹیلیفون کی گھنٹی دہشت میں مزید اضافہ کا باعث بنتی ہے۔

کچھ روز قبل میں اپنی تقرری کے سلسلے میں گورنر جنرل سے انٹرویو کے دوران مل چکا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُنھوں نے مسکرا کر اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میرے بیٹھنے سے پہلے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ آپ کا نام؟ باپ کا نام؟ تعلیم؟ کالج؟ پروفیسروں کے نام؟ مضامین؟ باپ دادا کیا کرتے تھے؟ بتایا طبیب تھے حکمت کرتے تھے۔ پوچھا طبیب کیوں تھے؟ حکمت کیا ہوتی ہے؟ کتنے بہن بھائی ہو؟ شادی شدہ ہو؟ بچے کتنے ہیں؟ بتایا کہ بچہ ابھی کوئی نہیں تو مسکرا کر

پوچھا بیویاں کتنی ہیں؟ اس عجیب سوال پر جب میں مسکرایا تو سنجیدہ ہوگئے جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ اُس وقت تو میں اُن کی اچانک تبدیلیٔ مزاج کو بالکل نہ سمجھ سکا مگر کچھ روز کام کرنے کے بعد پتہ چل گیا کہ لاٹ صاحب اپنے سٹاف میں سے کسی کو بھی بے تکلف ہونے کی اجازت نہ دیتے تھے اور میں تو ابھی سٹاف ممبر بنا بھی نہ تھا، صرف امیدواروں کی فہرست میں شامل تھا۔

پیرزادہ صاحب مختصر جسم و جان کے مالک شکل و صورت سے متشرع اور بڑے نیک سیرت انسان تھے۔ انھوں نے بڑی شفقت سے مجھے کام سمجھانا شروع کیا۔ وہ مجھے کام سمجھا کر جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دو ہفتے یوں گزر جانے کے بعد انھوں نے گورنر جنرل صاحب سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی تو لاٹ صاحب کی طرف سے میری طلبی ہوئی۔

میں نے دروازے کو آہستہ سے "ناک" کیا تو کان میں آواز پڑی "کم اِن" دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو رہا تھا تو آواز آئی "سِٹ ڈاؤن" دروازے اور لاٹ صاحب کی میز کے درمیان دس بارہ قدم کا فاصلہ تھا۔ میں نے سلام کیا اور شاید ایک ہی جَست میں (اب ٹھیک یاد نہیں رہا) میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کی کوشش میں تھا کہ آواز آئی "کم ہیر" نظر اُٹھا کر دیکھا تو گورنر جنرل کے چہرے پر شدید غصّے کے آثار تھے اور اپنے قریب والی کرسی پر اشارہ کر رہے تھے۔ بڑی بڑی سُرخ آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ اُن کے تنفس کے ساتھ الائچی کی خوشبو بھی الائچی کی خوشبو نہیں رہی تھی۔ کرخت لہجے میں نام پوچھا حالانکہ پہلے سے جانتے تھے، صرف مجھے دہشت زدہ کر کے میرے ہوش و حواس کی پیمائش مقصود تھی۔ پھر میز کی دراز سے ایک ٹائپ شدہ خط نما چیز نکالی جسے میرے ہاتھ میں تھما کر گرجے۔

What is this ? Tell me in two minutes

یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گئے اور آخری لفظ کے ساتھ ہی

میرے ہاتھ سے کاغذ دبوچ کر واپس میز کی اُسی دراز میں رکھ لیا اور اپنی شہادت کی اُنگلی سے مجھے نشانہ بناتے ہوئے فرمایا:

You are wasting my time. You can go

اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلنے لگا تو راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اپنے کمرے میں واپس آ کر اپنے مستقبل کے بارے میں غور کرنا شروع کیا تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ پیرزادہ صاحب میرا چہرہ پڑھ چکے تھے۔ اتنے میں لاٹ صاحب کا بلاوا آ گیا اور وہ سگریٹ کو دوات میں جھونک کر نکل بھاگے تو میں سر کو پکڑ کے بیٹھ گیا۔ تمام رات کٹی دل سے گفتگو کرتے۔

مجھے ایک ہفتہ مزید مطالعہ کرنے کا حکم موصول ہوا۔ پھر ایک اور ہفتہ کا اضافہ ہوا۔ بالآخر پورے ایک ماہ کے بعد پیرزادہ صاحب نے چارج میرے سپرد کیا۔ صوفہ پر بیٹھ کر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیے۔ دوات اور ایش ٹرے میں تمیز کرنا اُن کے لیے آسان ہو گیا تھا جیسے آئی سائٹ بحال ہو گئی ہو۔ مجھ سے بغل گیر ہو کر ڈھیروں دُعائیں دیں اور ٹوپی سر پر رکھ کر رخصت ہو گئے۔ دل چاہا کہ اُنھیں کہوں۔

مینوں لئی چل اپنے نال ٹکٹاں دو لے لے

سمجھوتا

خوف جو ابتدا میں غالب آگیا تھا آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ خود اعتمادی رفتہ رفتہ بحال ہونا شروع ہوئی۔ پوری بحالی یا آبادکاری میں تو کچھ وقت ضرور لگا۔ لاٹ صاحب کی زبان میں لکنت کی وجہ سے اُن کی گفتگو کو سمجھنا جتنا پہلے مشکل تھا اب ویسا مشکل نہ رہا۔ ہونٹوں کی کپکپاہٹ کو دیکھ کر اور زبان کی بڑبڑاہٹ کو سُن کر فقرے مرتب کرتا آ گئے۔ ٹیڑھے ٹکڑوں جیسی تحریر کو مناسب الفاظ میں تبدیل کرنا سیکھ لیا۔ لاٹ صاحب کے مزاج کی تلخی سے الجھن پیدا ہونا کم ہوتی گئی بلکہ آہستہ آہستہ میٹھے درد کی طرح کا لُطف آنے لگا۔

دفتر میں خسرو نام کا ایک اُردو ٹائپسٹ تھا جو دفتری کاغذات کے علاوہ گورنر جنرل صاحب کے اُردو خطوط ٹائپ کیا کرتا۔ ادھیڑ عُمر کا اور تمباکو والا پان کھانے کا عادی تھا۔ اس لیے ہونٹوں کو سختی سے دبائے رکھتا اور بات چیت کے لیے بڑی احتیاط سے اُونچا کر کے بھونپا سا منہ کھولتا۔ ایک روز گورنر جنرل نے بلا لیا۔ چونکہ اُس کے بیٹھنے کی جگہ سیکرٹریٹ بلاک میں قدرے دُور تھی آتے میں تقریباً پانچ منٹ لگ گئے۔ جیسے ہی وُہ کمرے میں داخل ہوا گورنر جنرل نے چیخ کر کہا Quick بیچارے کا سانس پہلے ہی پھولا ہُوا تھا گھبرا کر پھسل گیا اور منہ کے بل گرا۔ اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے سمجھا بچا کھچا پان تلاش کر رہا ہے مگر وُہ سامنے کے دو دانت ڈھونڈ رہا تھا جو نقلی تھے۔

کہتے ہیں کہ انسان واحد جاندار ہے جو ہنستا ہے کیونکہ وُہ اتنے شدید مصائب جھیلتا ہے کہ اُسے ہنسی ایجاد کرنی پڑتی ہے۔ انسان ہونے کے ناطے سے ہماری

بھی یہی مجبوری تھی۔ غلام محمد کی متلون مزاجی سے مزاح کی گنجائش نکل آتی تھی۔
جس دن لاٹ صاحب کی طبیعت ناساز ہوتی یا اُن کی کسی نجی مصروفیت کی وجہ سے ہماری چھٹی ہوتی تو سارا دن اُداس رہتا۔ وقت گزارے نہ گزرتا۔ چائے کافی کے دور یا گپ شپ سب بے لطف اور بقول شاعر

"فسردہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے"

اگر صورتِ حال نارمل ہوتی یعنی لاٹ صاحب معمول کے مطابق ٹھیک ٹھاک ہیں، سٹاف اپنی باری بھگتا رہا ہے تو طبیعت ہشاش بشاش رہتی گویا

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شُد

خدا مغفرت کرے مرحوم منظور الٰہی ہاؤس ہولڈ کے انچارج Comptroller تھے۔ سب سے پہلے صبح ناشتہ کے موقع پہ لاٹ صاحب کو سلام کرتے پھر نیچے آتے اور میرے کمرے میں بیٹھ کر سگریٹ کے کش لگاتے۔ میرا کمرہ ایسی جگہ تھا جہاں سے ہر آتا جاتا دُور سے دکھائی دیتا تھا۔ منظور مُسکراتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوتے اور عموماً پہلا فقرا یہی ہوتا "یار بڈھا اج فیر چڑھ گیا" باقی تفصیل وقفے وقفے سے سُناتے اور یُوں ہم دونوں میں تفصیلوں کا تبادلہ ہوتا۔ وُہ آج کی تازہ خبر اور میں گزشتہ کل والی گفت وشنید کی تفصیل بیان کرتا۔ اتنے میں لاٹ صاحب آتے دکھائی دیتے اور منظور پچھلے دروازے سے نکل کر روپوش ہو جاتا۔ حالات سے سمجھوتے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔

ایک تقریر

گورنر جنرل صاحب نے پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول میں سلامی لینا تھی
کراچی سے راولپنڈی تک کا سفر گورنر جنرل کے خصوصی طیارے Viking
سے تھا اور راولپنڈی سے ایبٹ آباد بذریعہ کار جانا تھا۔ طیارے نے کراچی
سے پرواز کی تو لاٹ صاحب نے یاد فرمایا کہ کاکول میں کرنے والی تقریر لکھنا تھی
جہاز کے اُس کیبن میں آمنے سامنے چار نشستیں تھیں۔ ایک پر لاٹ صاحب
خود، اُن کے سامنے وفاقی وزیر شعیب قریشی، دُوسری طرف سیکرٹری دفاع اور
اُن کے سامنے والی نشست پر گورنر جنرل کے ذاتی معالج کرنل سرور کی
بیگم صاحبہ تشریف فرما تھیں۔ میرے بیٹھنے کے لیے وہاں کوئی نشست
خالی نہ تھی، میں نے دو تکیے فرش پر بچھائے اور ڈکٹیشن لینی شروع کر دی۔
جہاز کی گونج اور لاٹ صاحب کی بُڑبُڑاہٹ گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ لاٹ
صاحب کو ٹوکنا آبیل مجھے مار کے مترادف تھا۔ اُلٹی سیدھی لکیروں سے شارٹ ہینڈ
کاپی کے پندرہ بیس صفحے بھر دیے۔ اتنا کچھ سمجھ آسکا کہ تقریر میں سیلاب کے
دنوں میں فوج کے کردار کو بھی سراہا گیا ہے۔ کیونکہ دریائے راوی میں تازہ
سیلاب آیا تھا جس سے لاہور کا مصری شاہ کا علاقہ زیرِ آب آگیا تھا اور فوج
نے سیلاب زدگان کی مدد کی تھی۔ تقریر لکھانا مکمل کی تو فرمایا سیکرٹری صاحب
کو جا کر سنا دو۔

سیکرٹری ٹو ایچ ای، اے جی رضا سی ایس پی پچھلی کیبن میں تشریف رکھتے
تھے۔ اُن کے علاوہ ملٹری سیکرٹری، اے ڈی سی اور میری نشستیں تھیں۔ ہم

دونوں لاٹ صاحب کو بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے آہستہ سے رضا صاحب کو بتایا کہ میرے کچھ پلے نہیں پڑا، میں بیٹھ کر خود تقریر بنا لوں گا۔ اِس وقت صرف ہونٹ ہلاتے ہوئے صفحے پلٹتا جاؤں گا۔ آپ کہہ دیجیے گا تقریر سُن لی ٹھیک ہے۔

جب میں یوں ایکٹنگ کر چکا تو لاٹ صاحب نے رضا صاحب سے پوچھا تقریر سُن لی؟ انھوں نے فوراً جواب دیا جی سُن لی، سب ٹھیک ہے۔ مجھے حکم ملا کہ جب لاہور رکیں تو ٹائپ کر کے دے دینا۔

لاہور میں جہاز نے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے رکنا تھا کیونکہ غلام محمد لاہور چھاؤنی میں اپنی والدہ کو ملنے جایا کرتے تھے۔ ملٹری سیکرٹری کرنل سید نیر رضا سے میں نے درخواست کی کہ رُک جائیں اور تقریر بناتے میں میری مدد کریں مگر اُنھیں ساتھ جانا پڑا اور میں وی آئی پی لاؤنج میں اکیلا رہ گیا۔ ٹائپ رائٹر کھولا اور چل میرے خامے بسم اللہ تقریر بنانا شروع کر دی۔ اِدھر غلام محمد کی سواری کا سائرن سُنا اُدھر میں آخری صفحہ ٹائپ رائٹر سے اتار رہا تھا۔

جہاز ہوا میں بلند ہوا تو فرمایا تقریر لاؤ۔ چل تو جلال تو، کے ورد کے ساتھ تقریر پیش کی اور واپس اپنی نشست پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ ابھی جہاز کے عملے کو آرڈر ملتا ہے کہ کھڑکی کھول کر پی اے کو نیچے گرا دو۔ لاٹ صاحب نے آخری صفحہ بھی پڑھ لیا تو جان میں جان آئی۔ رضا صاحب نے بھی ماتھے سے پسینہ پونچھ لیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کا شکریہ ادا کیا مگر ابھی عشق کے امتحاں اور بھی تھے۔

رات ایبٹ آباد میں بسر کرنا تھی۔ میں کھانا کھانے کے بعد شہر میں گھومنے نکل گیا تو پیچھے گاڑی دوڑائی گئی۔ لاٹ صاحب کے پاس سفید ڈنر جیکٹ میں ملبوس جنرل ایوب خاں تشریف فرما تھے۔ تقریر پاس پڑی ہوئی دیکھی تو ماتھا ٹھنکا۔

غلام محمد نے خلافِ معمول مسکرا کر پوچھا کہ تقریر میں کمانڈر اِن چیف کے بارے میں جو لکھا یا تھا وہ کہاں گیا؟ مسکراہٹ میرے لیے نہیں بلکہ جنرل ایوب خان

کو متاثر کرنے کے لیے تھی۔ میرے لیے اشارہ کافی تھا۔ کاپی کے صفحے یونہی اُلٹ پلٹ کرنا شروع دیئے۔ ایک جگہ رک کر پانچ چھ فقرے کمانڈر ان چیف کی اعلیٰ قیادت کی تعریف میں کہہ دیئے اور معذرت کی کہ یہ صفحہ جلدی میں ٹائپ ہونے سے رہ گیا تھا۔ غلام محمد نے جنرل ایوب کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں "اتنا کافی ہے یا کچھ اور؟" جنرل صاحب نے مسکرا کر تقینک یو کہا۔ میں اجازت لے کر تقریر کو دوبارہ ٹائپ کرنے کے لیے لے گیا۔ دوسرے دن گورنر جنرل صاحب نے عینک لگا کر پڑھ دی اور اگلے دن اخبارات کی زینت بنی۔

قائد اعظم محمد علی جناح اور ملک غلام محمد مرحوم کی ایک یادگار تاریخی تصویر۔ قائد اعظم ملک غلام محمد کی بات پر مسکرا رہے ہیں۔

سرکاری دَورے

غلام محمد جسمانی اعتبار سے ناتواں ہوتے ہوئے سرکاری دوروں اور سیر و تفریح کے بڑے شوقین تھے۔ نمونہ مشتے از خروارے۔ ایک اندرون ملک اور دو بیرونِ ملک دوروں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

سندھ کا دورہ

صوبہ سندھ کے دورے پر تھے، حیدرآباد اور بھٹ شاہ سے ہوتے ہوئے موہنجوڈارو اور لاڑکانہ پہنچے۔ لاڑکانہ شہر میں ایک سندھی کہاوت سُنی "ہتھیں نہ نانا تے گھُم لاڑکانہ" یعنی پلے پیسے نہیں اور لاڑکانہ میں گھومنے آ گئے ہیں۔ وہاں عام لوگوں کے نزدیک سندھ کا بادشاہ ایوب کھوڑو اور دوسری قابلِ ذکر ہستی نواب غیبی خاں چانڈیو کی تھی۔ بھٹو فیملی کا ستارہ جس نے ستر کے عشرے میں لاڑکانہ کو دُنیا بھر میں روشناس کرایا اُن دنوں امریکہ کی کسی دانشگاہ میں زیرِتربیت تھا۔ سندھ کے وزیرِاعلیٰ عبدالحفیظ پیرزادہ کے والد پیرزادہ عبدالستار تھے۔ اُن کی بیگم لیڈی ڈاکٹر بیلی اور وُہ خود موسیقی کے بڑے رسیا تھے اور پکّا گانا بڑی لگن سے گاتے تھے۔

سکھر میں گورنر جنرل کو دریائے سندھ میں کشتی کی سیر کرائی گئی۔ ایک بڑی کشتی میں گورنر جنرل اور اُن کا عملہ، دوسری کشتی میں مقامی انتظامیہ، تیسری کشتی میں سیکورٹی سٹاف اور چوتھی میں کھانے کی دیگیں رکھ دی گئیں۔ ایک صوبائی وزیر جو پیشے کے اعتبار سے صحافی تھے گورنر جنرل کی میزبانی کے فرائض انجام دینے کے لیے ہمراہ تھے۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو مقامی انتظامیہ کے ایک افسر نے وزیر صاحب کے کان میں کہا "سائیں مانی تیار آہی"۔ چاروں کشتیاں جُڑ گئیں اور وزیر صاحب نے مقامی افسروں کے ہمراہ بیرے خانساموں کے فرائض انجام دیئے۔

یہ وزیر صاحب جو بعد میں وفاقی وزیر اور آخر میں سفیرِ کبیر اور بھٹو کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران مشیر تھے، بڑے کائیاں تھے۔ غلام محمد سلیم شاہی جوتی پہنے ہوئے

تھے جیسے اُن کا ذاتی خدمت گار قاسم اُتارتا اور پہنایا کرتا تھا مگر کیا مجال کہ وزیر صاحب نے قاسم کو ایک موقع بھی دیا ہو۔ وزیر صاحب تیر کی طرح کہیں نہ کہیں سے نکل آتے۔ گورنر جنرل صاحب کو جوتی پہناتے اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو بوسہ دیتے۔

علاوہ اور بے شمار خوبیوں کے وزیرِ موصوف کی اضافی خوبی یہ بھی تھی کہ سگریٹ نہ پیتے تھے البتہ بیڑی پینے کا شوق تھا۔ بھرم رکھنے کے لیے ٹریپل فائیو سگریٹوں کے ڈبے میں بیڑیاں رکھتے اور باربرداری کا کام اپنے سرکاری پرائیویٹ سیکرٹری سے لیتے تھے۔ بیڑی کی طلب ہوتی تو پیچھے مڑ کر دیکھتے۔ پرائیویٹ سیکرٹری کامل تربیت یافتہ تھا۔ پھرتی سے آگے آتا سر کو جھکاتا اور ادب سے کہتا "سائیں بیڑی" سائیں بیڑی کو سلگا چکتے تو پرائیویٹ سیکرٹری واپس اپنی جگہ پر پہنچ کر سر کو دوبارہ ہلاتا جیسے خدا کا شکر بجا لا رہا ہو۔ جب وزیر اتنا اچھا ہو تو اِس کا پرائیویٹ سیکرٹری تو بہت ہی اچھا ہو گا — سچ ہے۔

"گھر وچ جنہاں دے ٹینے چیلے جان شڑپ"

سعودی عرب کا دَورہ

۱۹۵۳ء کے شروع میں غلام محمد نے سعودی عرب کا دَورہ کیا اور یہ دورہ پاکستانی سربراہِ مملکت کا سعودی عرب کا پہلا دورہ تھا جس میں پاک سعودی دوستی کی بنیاد رکھی گئی۔

خصوصی طیارے میں کراچی سے روانہ ہو کر بحرین میں رکے جہاں رات بسر کی اور روایتی عرب مہمان نوازی سے آشنا ہوئے۔ دُوسرے دن وہاں سے روانہ ہو کر براستہ داہران سعودی دار الحکومت ریاض پہنچے۔ ملک عبدالعزیز ابنِ سعود کے مہمان بنے اور اُنھیں کے قلعہ نما محل میں ٹھہرائے گئے۔

چھوٹے چھوٹے فنجانوں میں الائچی کی خوشبو والی کافی سے ابتدا ہوئی۔ رات کی ضیافت اُس وقت کے سعودی دستور کے مطابق فرش پر تھی۔ ایک بڑے کشادہ ہال میں قالینوں کے اُوپر لمبا سا دستر خوان بچھا تھا۔ درمیان میں بالمقابل بیٹھنے کی بجائے شانہ بشانہ ملک عبدالعزیز بن سعود اور غلام محمد تشریف فرما تھے۔ اُن کے دونوں طرف شاہی خاندان کے افراد، غلام محمد کا سٹاف، شاہ کا عملہ اور دُوسرے مہمان جہاں جس کو جگہ ملی بیٹھ گیا۔ کوئی پروٹوکول نہیں تھا۔ دستر خوان پر کنگ سائز کی پراتیں پلاؤ اور گوشت سے پُر، پورے کا پورا بُھنا ہُوا دُنبہ اور اُونٹ کی بُھنی ہوئی ران۔ چھُری اُٹھائیں کاٹیں اور کھائیں۔ کھانا ہاتھوں سے کھایا گیا۔ جب شاہ اور غلام محمد کھا چکے تو سب لوگ اُٹھ گئے۔ کھانا سیر ہو کر کھایا تھا مگر پراتیں ویسی کی ویسی بھری نظر آتی تھیں۔ ہم ابھی ہاتھ دھو کر تولیے سے خشک کر رہے تھے کہ اسی دستر خوان پر کھانے پکانے اور کھلانے

والا عملہ بیٹھ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دُم "ہو نجا" پھیرا کر پراتوں میں صرف ہڈیاں محفوظ رہیں۔

پورے محل میں عورت نام کی کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ شہر میں بھی کوئی خاتون نظر نہ آئی۔

مکہ مکرمہ میں گورنر کے محل میں قیام تھا۔ غلام محمد کی خاطر سیڑھیاں چڑھ کر بیت اللہ کا دروازہ کھولا گیا اور ہم سب نے اندر جا کر نماز اور نوافل کی سعادت حاصل کی۔ وَمَا تَوْفِيقِيٓ إِلَّا بِاللّٰه۔ سعودی عرب میں دولت کی ریل پیل ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ بھیک مانگنے والے مسجد الحرام کے اندر بھی موجود تھے۔ زائرین عبادت میں مشغول اور بھیک مانگنے والے بازو کھینچ کھینچ کر للّٰہ خیرات للّٰہ خیرات پکارتے۔ غلام محمد نے مجھے سعودی ریالوں کی تھیلی دی کہ بھیک مانگنے والوں میں تقسیم کر دوں۔ میرے گرد ہجوم جمع ہو گیا۔ اتفاق سے کچھ ریال زمین پر گر گئے مگر کسی بھیک منگے نے گری ہوئی چیز اٹھانے کی جسارت نہ کی۔

اُن دنوں صفا اور مروا کے درمیان نیم پختہ سڑک تھی۔ سڑک کے ایک طرف شہر کی جانب دکانیں تھیں۔ دُوسری طرف حرم شریف کی جانب بھی لوگ چادریں بچھا کر دکانیں سجائے بیٹھے تھے۔ اِن دکانوں میں زیورات اور کرنسی تبدیل کرنے والی دکانیں بھی تھیں۔ حرم شریف میں اذان کے ساتھ ہی سب دکاندار جوتے پہن کر نماز کے لیے اُٹھ بھاگتے۔ چوری چکاری یا اٹھائی گیری کا تصور تک نہ تھا۔

مدینہ منورہ میں بابِ جبریل کے عین سامنے والے گھر میں قیام کیا جسے ملک عبدالعزیز نے غلام محمد کو تحفتاً دے دیا۔ یہ مکان اب پاکستان ہاؤس کے نام سے موسوم ہے اور پاکستان کے وی آئی پی حضرات کے لیے مخصوص ہے۔

مدینہ منورہ میں بھی غلام محمد اور اُن کے سٹاف کو مسجدِ نبویؐ میں روضۂ اقدسؐ تک رسائی اور درود و سلام کی عظیم سعادت نصیب ہوئی۔

مدینہ منورہ ہی میں تھے کہ وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کا پیغام موصول ہُوا کہ

اینٹی قادیانی تحریک کی وجہ سے لاہور کو فوج کے حوالے کرنا پڑا ہے۔ غلام محمد کو بغداد کا دورہ ملتوی کر کے واپس کراچی آنا پڑا۔ اِس مختصر دورے میں ہم نے تھوڑی سی گفتگو عربی زبان میں کرنا سیکھ لی۔ جس سے ملتے سلام کرنے کے بعد پوچھتے کیفَ حَالُکَ۔ جواب ملتا طیّب۔ احسن۔

بھارت کا دورہ

۱۹۵۵ء کے آغاز میں دہلی (بھارت) کا دورہ کیا۔ بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد تھے جنہیں راجن بابو بھی کہتے تھے۔ راجن بابو نے صفدر جنگ کے ہوائی اڈے پر استقبال کیا تو میں اُن کی شیروانی کو دیکھتا رہ گیا ایسے لگتا تھا جیسے گندم کی بوری کھول کر شیروانی سلوالی ہو بعد میں پتہ چلا کہ کپڑا راجن بابو نے خود چرخہ کات کر بنا تھا۔

پرانے وائسریگل لاج آج کل کے راشٹرپتی بھون میں ہمارا قیام تھا۔ بالکل آخری سرے پر راجن بابو اور اُن کی پتنی (بیوی) کی رہائش تھی جہاں قدیم ہندو رسم و رواج کے مطابق چولہا چوکا بنایا ہوا تھا جسے بھارت کی خاتونِ اول روزانہ گائے کے گوبر سے خود لیپ کرتیں اور اُس کے بعد دال پھلکا بناتیں۔ نوکر چاکر سرکاری مہمانوں کیلئے مخصوص تھے۔ بھارت کے دوسرے صدر یعنی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے بعد بننے والے صدر راجہ گوپال اچاریہ غلام محمد سے ملنے کیلئے آئے۔ یہ گاندھی کی طرح سوکھے سکھائے کرتہ دھوتی میں ملبوس سر سے ننگے چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آئے۔ راستہ میں عملہ کا کوئی آدمی اُنھیں ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا تو یہ وہیں رُک جاتے۔ اُس کی طرف منہ کرتے چھڑی کو بغل میں دبا لیتے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کا جواب دیتے اور پھر آگے چل پڑتے۔ یہ وہی کانگریسی لیڈر تھے جنھوں نے سب سے پہلے پاکستان کے مطالبے پر رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ غلام محمد کو ملنے کے لیے بیشتر ہندو اور مسلمان لیڈر آئے۔ سب سے طویل ملاقات جامعہ ملیہ دہلی کے ڈاکٹر ذاکر حسین سے اور سب سے مختصر مولانا ابوالکلام آزاد سے ہوئی تھی۔

غلام محمد اور جواہر لال نہرو کے درمیان کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک ملاقات میں ڈاکٹر راجندر پرشاد بھی شریک ہوئے۔ کشمیر کے بارے میں ایک زبانی معاہدہ طے پایا جس سے بھارت بعد میں حسبِ معمول منحرف ہو گیا۔ معاہدے کا مسودہ میں نے ٹائپ کیا تھا۔ متن تو اب یاد نہیں مگر اس قدر یاد ہے کہ تقریباً آدھے صفحہ پر تھا اور اس کی رو سے جموں پر بھارت کے قبضہ کو تسلیم کرنا اور وادی میں ریفرنڈم کروانا تھا۔ جواہر لال نہرو نے مسودہ رکھ لیا کہ کابینہ کی منظوری حاصل کر کے اطلاع دیں گے۔ بعد میں جواب آیا کہ بھارتی کابینہ نے تجویز مسترد کر دی ہے۔ ہمارے سفیر کی رپورٹ کے مطابق معاہدے کی سب سے شدید مخالفت مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف سے تھی۔ واللہ اعلم۔

بھارت کا یہ دورہ غلام محمد نے بظاہر خیر سگالی کے طور پر مگر دراصل مسئلہ کشمیر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اختیار کیا تھا۔ اگرچہ ماضی میں انھیں ہندو لیڈروں کے ساتھ سیاسی نوعیت کے مذاکرات کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ تاہم وہ سمجھتے تھے کہ مسٹر جواہر لال نہرو کو اس مسئلہ کے مستقل اور پرامن حل کی اہمیت پر قائل کر سکیں گے۔ چنانچہ وہ معاہدہ پر مسٹر نہرو کی زبانی رضامندی لے کر واپس لوٹے تو بہت خوش تھے کہ دورہ کامیاب رہا۔ مگر ہندو تحریری معاہدوں سے پھر جایا کرتا ہے یہ تو صرف زبانی کلامی بات چیت تھی۔

دہلی میں برصغیر کے کئی نامور صوفیائے کرام کے مزارات ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ حضرت خواجہ باقی باللہ اور حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہم جیسے بزرگ وہیں دفن ہیں۔ صوفیائے کرام سے گہری عقیدت کے باعث غلام محمد بزرگانِ دین کے مزاروں پر حاضری دینے کو اپنے پروگرام کا لازمی حصّہ بنانے پر مصر ہوا کرتے تھے مگر بھارت کے دارالحکومت میں اپنے پانچ روزہ قیام کے دوران وہ کہیں نہ جا سکے تھے کیونکہ بھارتی حکومت کو یہ گوارا نہ تھا کہ غلام محمد کے اس اقدام سے بھارتی مسلمانوں میں اسلامی یک جہتی کے جذبے کو تقویت ملے۔

چڑیوں کے سرتاج

۱۹۵۵ء کے شروع میں غلام محمد بیمار ہو گئے اور انھیں صاحبِ فراش ہونا پڑا۔ دیویٰ شریف (لکھنؤ۔ بھارت) میں اُن کے مرشد سید وارث علی شاہ کے دربار کے سجادہ نشین، سید رضی احمد صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ اور غلام محمد کے مہمان تھے۔ اُنھوں نے مشورہ دیا کہ ڈاکٹری علاج معالجہ کے ساتھ ساتھ دیسی طریقہ علاج سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔ گورنر جنرل کے سرکاری معالج کرنل محمد سرور کی شدید مخالفت کے باوجود سید رضی احمد کے مشورے کو پذیرائی نصیب ہوئی۔ ممکن ہے غلام محمد نے یہ سوچا ہو کہ علامہ اقبال بھی کرنل امیر چند اور کرنل الٰہی بخش کے علاج کے ساتھ ساتھ حکیم محمد حسن قرشی کی دوا بھی استعمال فرماتے تھے بلکہ دلی کے حکیم نابینا بھی دوا بھیجتے رہتے تھے۔ چنانچہ سید رضی احمد ہی کی سفارش پر لکھنؤ سے ایک حکیم صاحب تشریف لے آئے۔

حکیم صاحب کی عمر شریف پچانوے برس سے کچھ اُوپر بتائی جاتی تھی۔ ریش مبارک اور بھنویں برف کی طرح سفید مگر باقی ماندہ صحت قابلِ رشک تھی۔ کمر بانس کی طرح سیدھی اور فنِ طب میں سند کے طور پر تیس یا پینتیس سالہ زوجہ اور چھ سات برس کی بچی ہمراہ لائے تھے۔ بڑی خوبی یہ کہ دلی کے حکیم نابینا کی طرح یہ بھی نابینا تھے اور اضافی خوبی یہ کہ وارثی تھے۔ لہٰذا غلام محمد کے پیر بھائی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ انھیں سیکرٹریٹ بلاک کے ساتھ ٹھہرانے کا بندوبست کر دیا گیا۔

دو تین دن تحقیق و تشخیص میں لگ گئے۔ پھر نسخہ تجویز ہوا۔ نسخہ میں دیگر مرکبات اور مقویات کے علاوہ چڑوں کے مغز کا کشتہ (کشتہ مغز کنجشک نر) بھی شامل تھا۔ مطلوبہ تعداد میں چڑوں کی فراہمی عملے کے سپرد ہوئی اور کشتہ کی تیاری قبلہ حکیم صاحب اور اُن کی "اندرونِ خانہ" نے اپنے ذمے لے لی۔

کراچی اور حیدرآباد کے چڑی مار جال بھر بھر کر لاتے اور جھولیاں بھر بھر کر جاتے۔ جب سب چڑی مار عاجز آ گئے اور حکیم صاحب کی زبان پر ابھی ھَلْ مِنْ مَزِیْد تھا تو حیدرآباد کے کمشنر چوہدری نذیر احمد نے دستِ تعاون بڑھایا۔ چڑوں کو ذبح کر لیا جاتا اور ان کی نصف بہتر کو ہوا میں آزاد چھوڑ دیتے۔ چڑوں کا کشتہ بنتا اور چڑیاں کشتۂ ستم ایک نرمرد کے لیے نر مغز درکار تھے کہ شکار مردہ سزاوارِ شہباز نہیں۔ کل کتنے چڑے کام آئے اور کتنی چڑیوں کا سہاگ لٹا اُن کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ بہرحال کشتہ تیار ہوا تو ہوالشافی کے ورد کے ساتھ یک مثقال بعد از طعام نوش جان فرمانے کا عمل شروع ہو گیا۔

کافی روز گزر جانے کے بعد بھی غلام محمد کی صحت میں کسی افاقہ کے آثار نمودار نہ ہو سکے۔ کرنل سرور پریشان تھے کہ دیسی اور بدیسی دواؤں کے کاک ٹیل سے گورنر جنرل صاحب کی رہی سہی صحت کا بھی کباڑا ہو جائے گا۔ کسی نے یہ شوشہ بھی چھوڑ دیا کہ چڑوں کے مغز کا کشتہ جو لاٹ صاحب کے لیے تیار ہوا تھا، قبلہ حکیم صاحب خود استعمال کر رہے ہیں اور لاٹ صاحب کو ویسی ہی کوئی اور کشتہ نما چیز کھلائی جا رہی ہے۔ ہر کوئی اِس لطیفہ نما افواہ سے لُطف اندوز ہو رہا تھا مگر بات ایسی تھی جس کی تصدیق یا تردید صرف حکیم صاحب ہی فرما سکتے تھے۔

شہید چڑوں کا لال لال لہو رنگ لے آیا۔ کشتہ مغز کنجشک نر کی بدولت گورنر جنرل صاحب کئی عوارض کا کشتہ بن گئے۔ جسمانی تکالیف کے علاوہ دماغی کیفیت بھی متاثر ہوتی نظر آئی تو سید رضی احمد صاحب اور قبلہ حکیم صاحب

مع اہل و عیال لکھنؤ سدھارے۔

کاروبارِ مملکت میں خلل واقع ہونے لگا تو وزیر و وزراء فکر مند ہوئے۔ سب سے زیادہ متفکر امورِ داخلہ کے وزیر باتدبیر میجر جنرل اسکندر مرزا نظر آتے تھے۔ غور و فکرِ بسیار کے بعد اگست میں کابینہ نے غلام محمد کو دو ماہ کی رُخصت دیدی اور اسکندر مرزا کو ایکٹنگ گورنر جنرل بنا دیا گیا لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ اس ساری کارروائی کو غلام محمد سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔
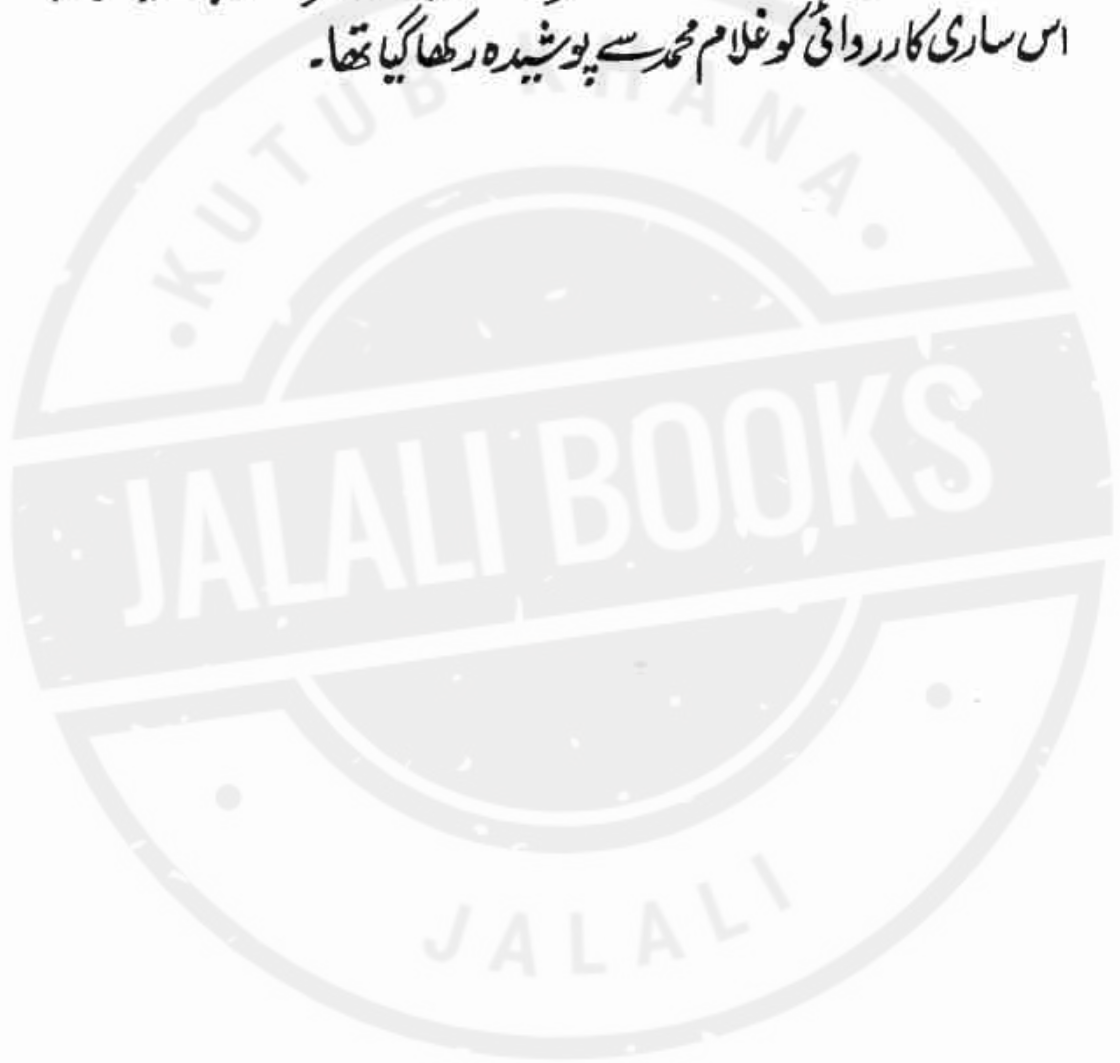
غلام محمدؐ کی شخصیت کے چند پہلو

بے حد فعال اور تیز رو غلام محمدؐ جسمانی اعتبار سے بے شک کسی حد تک مفلوج تھا مگر دماغی الحاظ سے حسبِ سابق چاق و چوبند، تن آسانی سے شدید نفرت کی وجہ سے کسی بھی تن آسان سے نباہ نہ کر سکتا تھا۔ قوّتِ ارادی اور قوت فیصلہ کا مالک، جرأت اور خود اعتمادی کا پیکر، ہر دم رواں ہر دم جواں ہے زندگی کا قائل۔ اللہ تعالیٰ نے غلام محمد کو غیر معمولی کام کرنے کے لیے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ مگر بقولِ شاعر

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

ایک مخصوص طبقے نے اُن کی درشت مزاجی کے کئی خود ساختہ افسانے پھیلا رکھے تھے۔ مشہور کر رکھا تھا کہ وُہ لوگوں کو پنجابی زبان میں ماں بہن کی گالیاں دیتا ہے۔ حالانکہ میں نے چار سالوں کے دوران اُن کے منہ سے کبھی کوئی غلیظ گالی نہ سُنی۔ اپنے ذاتی اور دیرینہ ملازم محمد دین اور قاسم خاں کو بیوقوف بابا تو کہہ دیتے تھے۔ سٹاف کے ساتھ لہجہ درشت ضرور تھا مگر الفاظ درست ہوتے۔ ایک دفعہ اپنے ایک سٹاف ممبر کو پہلے اُس کی غلطیاں بتائیں پھر چلتے وقت کہا۔

I thought I was the only 'fool here but there are bigger fools around me.

غلطیاں جن کی اُنھوں نے نشاندہی کی تھی وہ یقیناً غلطیاں تھیں لیکن ہدایات دیتے وقت اُنھوں نے جس تیزی و تندہی کا مظاہرہ کیا تھا اُس میں غلطیوں کا ارتکاب ناگزیر تھا۔

غلام محمد گرمیوں کے ایک دو مہینے کسی ٹھنڈی جگہ پر گزارا کرتے تھے۔ ایک

سال ایبٹ آباد کے قریب نواں شہر میں قیام تھا۔ دونوں نواسیاں (بیگم حسین ملک کی بیٹیاں) بھی ہمراہ تھیں۔ ساتھ والے کمرے میں مقیم چھوٹی چھوٹی بچیاں صبح اُٹھ کر کھیلنے لگ جاتیں۔ ایک دن اُنھوں نے قدرے زیادہ اُودھم مچایا۔ گورنر جنرل صاحب کو اپنے شور کے علاوہ کسی اور کا شور گوارا نہ تھا۔ بچیوں کو بلایا گیا۔ جب وہ سامنے آکر لائن میں کھڑی ہو گئیں تو کڑک کر بولے کیوں شور مچا رہی ہو؟ وہ بیچاری سہم کر ایک دُوسری کی طرف دیکھنے لگیں۔ یہ پھر گرج کر بولے دوبارہ شور کرو گی؟ دونوں بے حد ڈر گئیں تھیں بھرائی ہوئی آواز میں گھبرا کر ایک ساتھ بولیں۔

جی کریں گے

یہ پھر کڑک کے

کرو گی؟

جی کریں گے۔

دوبارہ تو نہیں کرو گی؟

جی نہیں کریں گے۔

آیا نے آگے بڑھ کر معافی مانگی اور سُبکتی ہوئی بچیوں کو لے گئی۔ گورنر جنرل کی خشمناک نظروں نے دروازے تک اُن کا تعاقب کیا

غلام محمد گفتگو ہمیشہ اُردو یا انگریزی میں کیا کرتے تھے۔ میں نے چار برس کے عرصے میں اُن کی زبان سے پنجابی کا صرف ایک فقرا سُنا۔ اپنے دیرینہ دوست ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کو بتا رہے تھے کہ چوٹ کی وجہ سے اُن کے گھٹنے میں درد ہے۔ فقرہ کو دہرایا بھی مگر خلیفہ صاحب سمجھ نہ سکے۔ غلام محمد نے خلیفہ صاحب کے کان کے قریب منہ کر کے کہا:

"میرے گوڈے وچ پیڑ اے۔ سٹ لگ گئی سی۔"

یہ کہا اور منہ کو واپس اپنی اصلی پوزیشن میں لاتے ہوئے اتنے زور سے ہنسے کہ تھوک کی چھینٹوں سے اچھا خاصا چھڑکاؤ ہو گیا۔

مالی معاملات میں غلام محمد کی احتیاط اور دیانت قابلِ ستائش تھی اور یہ وہ نعمت ہے جو خدا کی طرف سے بہت کم لوگوں کو عنایت ہوتی ہے۔ ذاتی خط و کتابت کے لیے بازار سے رائٹنگ پیڈ لفافے اور ڈاک کے ٹکٹ خریدے جاتے تھے جس کا ماہانہ حساب دینا پی اے کے فرائض میں شامل تھا۔ گزشتہ ماہ کا حساب دیکر اگلے ماہ کے لیے ایڈوانس مل جاتا۔

اپنے دوستوں کو اکثر تحفے تحائف بھیجتے اور پارسلوں پر ذاتی حساب سے ٹکٹ لگائے جاتے۔ سرکاری مصارف اور نجی مصارف کے فرق کو ملحوظ رکھنے کی سختی سے ہدایت تھی۔ اس قسم کی احتیاط نہ سکندر مرزا میں دیکھی نہ فیلڈ مارشل ایوب خان میں۔ پرانے سٹاف سے سنا تھا کہ الحاج خواجہ ناظم الدین بھی ان باتوں میں لاپروا تھے اور قائدِ اعظمؒ کے دنوں میں حساب کتاب محترمہ فاطمہ جناح کے ہاتھ میں تھا۔

صبح آٹھ بجے غلام محمد کو نماز پڑھتے ہوئے اکثر دیکھا۔ جمعہ کے روز کوٹ پتلون کی بجائے پاجامہ اور شیروانی پہننا اُن کا معمول تھا۔ اُس روز بارہ بجے دفتر سے اُٹھ جاتے، وضو کرتے۔ باہر لان میں یا برآمدے میں دریاں بچھ جاتیں۔ چپڑاسیوں میں سے ایک باریش بزرگ (مولوی نذیر احمد جو میرے چپڑاسی تھے) امامت کے فرائض سرانجام دیتے۔ غلام محمد بالعموم چپڑاسیوں کے درمیان عموماً پچھلی صف میں نماز ادا کرتے۔ میں نے انھیں شراب کو ہاتھ لگاتے کبھی نہ دیکھا۔ جوانی میں پیتے ہوں تو مجھے علم نہیں واللہ اعلم

ایک دفعہ جمعہ کے روز مولوی نذیر احمد بیمار ہو گئے۔ میں نے ملٹری سیکرٹری کرنل حامد نواز خاں کو اطلاع دی تو انھوں نے مجھے کہہ دیا کہ کسی دوسرے مولوی

کا انتظام کر دوں۔ میں نے انسپکٹر پولیس بہاول بخش کی ڈیوٹی لگائی کہ باہر سے کسی مولوی صاحب کو لے آئیں۔ غلام محمد اپنے وقت پر نماز کے لیے تشریف لائے تو مولوی صاحب نہیں تھے۔ لاٹ صاحب ابھی ملٹری سیکرٹری پر ناراض ہو ہی رہے تھے کہ مولوی صاحب تشریف لے آئے۔ بعد میں بہاول بخش نے مجھے بتایا کہ اِن مولوی صاحب کو جب معلوم ہوا کہ گورنر جنرل ہاؤس میں نماز پڑھانی ہے تو نئے کپڑے پہن کر عربی چوغہ زیبِ تن کیا۔ منہ میں پان کی گلوری رکھی اور موٹر میں سوار ہوئے۔ شاہی محل کی گاڑی میں بیٹھنے کا اعزاز ناگہاں طور پر میسر آیا تھا۔ گاڑی کے شیشے صاف شفاف تھے۔ مولوی صاحب نے مُنہ آگے کر کے پان کی پیک سڑک پر پھینکنا چاہی تو شیشے سے ٹکرا کر واپس مولوی صاحب کے چہرے مبارک اور کپڑوں پر تجریدی آرٹ کے شہپارے بن گئی۔ مولوی صاحب کو واپس اندرونِ خانہ جا کر کپڑے تبدیل کرنا پڑے۔ اس وجہ سے پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔

مہمان نوازی میں غلام محمد بڑے فراخ دل تھے۔ دو چار مہمان ہر وقت قیام پذیر رہتے۔ سرکاری دعوتوں میں صرف سرکاری لوگ بلائے جاتے: نجی دوست کوئی نہ ہوتا۔ نجی دعوتوں میں دوست احباب ہوتے سرکاری آدمی کوئی نہ ہوتا۔

ہر ماہ خوراک وطعام خانے کی مَد کی رقم کا حساب ہوتا۔ جتنی رقم بچ رہتی اسے قانوناً اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع کر لینے کے مجاز تھے جس طرح کہ سکندر مرزا اور ایوب خان کے دور میں ہوتا تھا۔ مگر غلام محمد رقم الگ۔ جمع رکھتے اور ہر دُوسرے تیسرے مہینے شہر کے یتیم خانوں کے بچّوں کی دعوت ہوتی۔ دیگیں پکتیں دریاں بچھ جاتیں۔ بچّوں کے ساتھ خود بھی بیٹھ جاتے اور اُن کو زبردستی کھلاتے جاتے۔ جاتے وقت سب بچّوں کو کچھ روپے تقسیم کرتے۔ یتیم خانوں کے مینیجروں کو البتّہ ہمراہ آنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔

اُن کے ایک دیرینہ دوست اور پیر بھائی اسمٰعیل صاحب ہوتے تھے بر صاحب ریلوے کے درمیانہ درجہ کے ریٹائرڈ ملازم اور لکھنوی تہذیب و تمدن کا نمونہ تھے۔ ہمیشہ شیروانی اور کھلی موری کا پاجامہ اور سر پہ کپڑے کی ٹوپی پہنتے۔ جس دن شام کو کوئی سرکاری مصروفیت نہ ہوتی اسماعیل صاحب کے کوارٹر سے موٹر انھیں لے آتی اور رات کھانے کے بعد واپس چھوڑ آتی، تصوّف کے راز و رموز پر گفتگو ہوتی رہتی۔

ایک دفعہ ہزارہ کے دورے پر تھے۔ مانسہرہ کے سرکٹ ہاؤس میں عمائدینِ شہر استقبال کے لیے موجود تھے۔ غلام محمد قطار میں کھڑے لوگوں سے ہاتھ ملا رہے تھے کہ دور عوام الناس کے مجمع میں ایک شخص پر نظر ٹھہر گئی۔ قطار چھوڑ کر اس کی طرف چل دیے اور پوچھا تم غلام ربانی ہو۔ اُس کے سر اثبات میں ہلانے پر بغلگیر ہو گئے۔ معلوم ہُوا کہ غلام ربانی صاحب اُن کے پرانے ہم جماعت ہیں اور مانسہرہ کے پرائمری سکول میں ٹیچر ہیں۔ دو دن مانسہرہ میں رہے اور غلام ربانی کو اپنے ساتھ سرکٹ ہاؤس میں رکھا۔ رخصت ہوتے وقت ڈپٹی کمشنر کو ہدایت کی کہ اِن کا خیال رکھنا۔ اِنھیں کوئی تکلیف نہ ہو۔

غلام محمد کے دوستوں میں سیاست دان خال خال ہی تھے۔ سب دانشور قسم کے لوگ تھے۔ مثال کے طور پر بنگال کے ڈاکٹر عبدالرحمٰن صدیقی۔ لاہور کے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، پطرس بخاری اور شعیب قریشی۔ سیاستدانوں میں صرف چوہدری خلیق الزماں سے دوستی تھی۔ سر سلطان شاہ محمد آغا خاں سوئم سے ذاتی مراسم تھے اور باقاعدہ خط و کتابت تھی حتیٰ کہ اپنی وصیّت کے متعلق بھی سر آغا خان نے غلام محمد کو آگاہ کر رکھا تھا کہ اپنے بیٹے پرنس علی خان کی بجائے پوتے پرنس کریم کو اپنا وارث اور گدی نشین بنائیں گے۔ سر آغا خان کا اصرار تھا کہ عربی کو پاکستان کی قومی زبان کے طور پر اختیار کیا جائے۔ غلام محمد کو آغا خان سے اِتفاق تھا مگر ایک طبقہ شدید مخالف تھا اور قائدِ اعظم کا حوالہ دے کر صرف اُردو ہی کو قومی زبان قرار

دینے پر مصر تھا۔ بنگالی زبان کا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور سر آغا خان کے خیال میں اس بحث کا واحد حل عربی زبان اختیار کرنا تھا تاکہ نہ صرف پاکستانی متحد ہوں بلکہ عالم اسلام کو تقویت ملے۔

غلام محمد کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹی اقبال بیگم بڑی تھیں اور اپنے کزن مسٹر حسین ملک کی اہلیہ تھیں۔ حسین ملک نجی کاروبار کرتے تھے۔ بیٹا انعام محمد ایک کاروباری فرم Grieves Cotton میں ایک ہزار روپے کے لگ بھگ تنخواہ پر ملازم تھا اور بیوی و دو بچوں کے ہمراہ کراچی ہی میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ ہفتہ دس روز بعد بیوی بچوں کے ہمراہ والد سے ملنے گورنر جنرل ہاؤس آ جایا کرتا۔ اُس نے باپ کے ساتھ نہ گورنر جنرل ہاؤس میں رہائش اختیار کی اور نہ کسی سرکاری سہولت سے فائدہ اٹھایا۔ غلام محمد اپنے بیٹے کی مالی مدد کر دیتا تھا مگر کسی بہتر نوکری کی تلاش یا کوئی اور منافع بخش دھندہ کرنے میں مدد نہ کی، بیٹا بھی اپنے باپ کی طبیعت سے واقف تھا اِس لیے باپ کے نام یا عہدے کو استعمال کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔

غلام محمد کا صرف ایک ہی ذاتی مکان لاہور چھاؤنی میں تھا جس میں اُنکی والدہ، بیوی اور چھوٹا بھائی ملک عبدالحمید رہتے تھے۔

ستم ظریفی دیکھئے کہ بیوی کا نام بادشاہ بیگم تھا مگر بادشاہ اور بیگم کے درمیان ایک مُدّت سے تعلقات کشیدہ تھے۔

سوئے اتفاق کہ سکندر مرزا کی پہلی بیگم کا نام تاج بخت تھا۔ مگر سر تاج جب تاج و تخت کا مالک بنا تو تاج بخت دیکھتی رہ گئی اور خاتونِ اوّل ہونے کا شرف ایرانی نژاد ناہید خانم کو حاصل ہوا۔

غلام محمد کی خوبیوں اور کمزوریوں دونوں میں شدّت تھی۔ اِن کی سب سے بڑی کمزوری حسن تھا۔ حسین صورت اُنھیں میلوں دُور سے نظر آ جاتی۔ پھر جس سے ایک دفعہ دوستی ہو گئی تمام عُمر نبھایا۔ جغرافیائی سرحدیں بھی حائل نہ ہو سکیں۔

غلام محمد کے کیریکٹر میں جہاں بھی تضاد تھا کھلا اور واضح تھا اور انھوں نے اپنی کسی کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی۔ اس اعتبار سے وہ کھلی کتاب تھے۔ مندرجہ بالا مذکورہ کمزوری کے ساتھ ساتھ مذہب سے والہانہ لگاؤ تھا اور ایسے لگتا تھا جیسے ؎

گھبرا کے کبھی اُٹھے تو مے خانے سے ہو آئے
پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خُدا میں

ایک دفعہ ایبٹ آباد میں جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فخریہ کہا:

نازم بنامِ خود کہ غلام محمد است

اپنے لڑکے کا نام انعام محمد تجویز کرنا ضرور اسی جذبہ کا مظہر ہو گا۔ جناب رسالتمآبؐ سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی۔ اُن کی شدید خواہش تھی کہ زندگی کے آخری ایام مدینتہ الرسولؐ میں مسجدِ نبوی کے پاس بسر ہوں۔ ملک عبدالعزیز ابنِ مسعود نے اسی خواہش کو محسوس کر کے مسجدِ نبویؐ کے بابِ جبریل کے عین سامنے والا مکان پیش کر دیا تھا۔ یہ مکان آج کل پاکستان ہاؤس کہلاتا ہے اور پاک سعودی دوستی کی سب سے پہلی نشانی ہے۔

فقرا اور اصفیا سے بڑی عقیدت تھی۔ بزرگوں کے مزارات پر حاضری دیتے وقت جذبات سے مغلوب ہو جاتے۔ لاہور میں قیام کے دوران داتا گنج بخشؒ کے مزار پر حاضری ضروری ہوتی۔ مجاور اور گدی نشین قسم کے لوگوں کو ناپسند کرتے۔ سندھ کے دورے پر بھٹے تو بھٹ شاہ میں شاہ عبداللطیفؒ اور سیہون شریف میں لال شہباز قلندر کے مزاروں پر محفل سماع میں شرکت کی۔ اوچھ میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور ملتان میں خواجہ بہاؤالدینؒ، خواجہ صدرالدین اور خواجہ رکن الدین المعروف رکن عالم کے مزاروں تک کچھ فاصلہ پیدل طے کرتے۔ ایک مرتبہ وادیِ کاغان جاتے وقت بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد شہیدؒ کے مزار پر رک گئے اور فاتحہ خوانی کے دوران رومال کو آنسوؤں سے تر کر لیا۔ خود سید

وارث علی شاہ سے بیعت تھے جن کا مزار لکھنؤ (بھارت) کے قریب دیوی شریف میں مرجع خاص و عام ہے۔ اپنے مرشد کی پیروی میں ہمیشہ فرش پر سوتے اور سرہانے شاہ صاحب کی تصویر رہتی۔ دورے پر یہ تصویر ساتھ جاتی۔

جس روز غلام محمد کا انتقال ہونا تھا اُس روز دوپہر کو سو کر اُٹھے تو گھر والوں کو کہا کہ لکھنؤ جانے کے لیے ہوائی جہاز چارٹر کرو کیونکہ شاہ صاحب (سید وارث علی شاہ) خواب میں ملے ہیں اور اُنھوں نے رات دس بجے ملاقات کا وقت دیا ہے۔ اسماعیل صاحب کو بھی بلا کر ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ سب لوگ سمجھانے لگے کہ آپ بیمار ہیں اور سفر کے قابل نہیں ہیں مگر وُہ خفا ہو کر غصّے سے کانپنے لگے حتیٰ کہ دل کا دورہ پڑا اور بے ہوش ہو گئے۔ اُن کے ذاتی معالج ڈاکٹر سرور کو بُلایا گیا۔ تقریباً آٹھ بجے رات ہوش میں آئے تو پوچھا جہاز تیار ہے؟ سب نے پھر سمجھانا شروع کیا اور وُہ پھر بے ہوش ہو گئے۔ یہ اُن کی آخری بے ہوشی تھی۔ ٹھیک دس بجے رات جان جانِ آفریں کے سپرد کر کے شاہ صاحب سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

غلام محمدؒ اور خواجہ ناظم الدینؒ

غلام محمد کا نام سنتے ہی ہر محب وطن پاکستانی کے ذہن میں وہ تلخ یادیں جاگ اٹھتی ہیں جو ۱۹۵۰ء کے عشرے میں وقوع پذیر ہوئیں اور جن کو دوررس نتائج کی وجہ سے ہماری تاریخ کا ایک المناک باب تصور کیا جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ غلام محمد کے بارے لوگوں کا عام تاثر اور اس کے متنازعہ سیاسی اقدامات کا سرسری جائزہ سیاق وسباق کے حوالے سے لیا جائے۔

صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے ۲ مارچ ۱۹۸۵ء کو اپنی نشری تقریر میں فرمایا تھا:

"جب قائداعظم اس دنیا سے کوچ کر گئے اور تین سال بعد ان کے دست راست قائد ملت لیاقت علی خان کو شہید کر دیا گیا تو اختیارات کی سابقہ تقسیم ہی سیاسی بحران کا شکار بن گئی۔ یعنی عبوری آئین تو وہی رہا لیکن شخصیات بدلنے سے ساری فضا ہی بدل گئی اور اس پار یساتی دور میں ایک سربراہ مملکت ایسا بھی آیا جس نے جسمانی اور ذہنی طور پر مفلوج ہونے کے باوجود اپنے اختیارات کا آمرانہ استعمال کیا اور محض اقتدار کی خاطر ملک کی دستور ساز اسمبلی کو توڑ کر ملک کو سیاسی بحران سے دوچار کر دیا۔"

یوں تو "کلام ملوکاں ملوک الکلام" لیکن صدر محترم کے بیان سے یہ تاثر ضرور ملتا ہے کہ عبوری آئین کے تحت دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کے اختیارات غلام محمد کو حاصل تو تھے البتہ اُس نے اُن اختیارات کا استعمال آمرانہ طور پر اور محض اقتدار پر فائز رہنے کی خاطر کیا تھا حالانکہ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر ایک مفلوج شخص تھا۔

جن امور کے لیے غلام محمد کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے وہ دو ہیں۔ اوّل یہ

کہ اپریل ۱۹۵۳ء میں خواجہ ناظم الدین کو وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کر دیا حالانکہ خواجہ صاحب کو اسمبلی میں اکثریت حاصل تھی اور ایک ماہ پہلے وہ بجٹ منظور کروا چکے تھے۔ دوم غلام محمد نے اکتوبر ۱۹۵۴ء میں بغیر کسی جواز کے اور بقول جنرل ضیاء الحق، محض اقتدار کی خاطر دستور ساز اسمبلی توڑ دی۔ علاوہ ازیں ایک مخصوص طبقہ ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خان کی شہادت کو سازش قرار دیکر اس "سازش" میں غلام محمد کو ملوث کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

ہر حادثے کے پیچھے کوئی نہ کوئی حماقت ضرور ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کردار و واقعات کو پرکھنے کے لیے اُس وقت کے حالات، واقعات و محرکات کا مجموعی جائزہ لیا جائے۔ کسی ایک واقعہ کو اُچک کر اور حالات سے علیحدہ کر کے اُس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کر لینا عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔

افلاطون کے مطابق کسی کی افتادِ طبع کا سُراغ آدمی کے معمولی معمولی کاموں سے ملتا ہے۔ بڑے بڑے کاموں سے نہیں۔ بڑے بڑے کام تو انسان خوب سمجھ سوچ کر کرتا ہے جو بسا اوقات اُس کے ذاتی طبع اور میلان کے خلاف بھی ہو سکتے ہیں۔ گزشتہ صفحات میں غلام محمد کے مزاج، طبع اور ذاتی میلان کے متعلق جتنی معلومات مجھے تجربہ کی بنیاد پر حاصل تھیں وُہ میں نے من و عن تحریر کر دیں۔ غلام محمد کی جو مجموعی تصویر اُبھرتی ہے۔ اُس کے مطابق وُہ جسمانی طور پر مفلوج ہونے کے باوجود انتہائی چاک و چوبند، نڈر اور بیباک شخص تھا۔ اُس کا ماضی غیر معمولی جراُت اور اسلام دوستی سے رقم ہے۔

۱۹۳۰ء کے عشرے میں ریلوے کے محکمہ میں ایک اکاؤنٹس آفیسر کی حیثیت سے جس بے باکی اور دلیری سے مسلمانوں کو ملازمتیں دلوائیں اُس کی مثال کسی چھوٹے بڑے صاحبِ اختیار سول سرونٹ کے کردار میں نہیں ملتی۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے سپلائز ڈیپارٹمنٹ میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا کہ ملازمت چھوڑ دی۔

ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست حیدرآباد دکن کا وزیرِ خزانہ بنا۔ قیامِ پاکستان پر ٹاٹا اینڈ سٹرینز سے منسلک تھا کہ قائدِ اعظم کی دعوت پر پاکستان کے پہلے وزیرِ خزانہ کا قلمدان سنبھالا اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا ہر ایک سے لوہا منوایا۔ اپنے اور غیروں میں Financial Wizard مشہور ہوا ۱۹۵۱ء میں فالج کا شدید حملہ ہوا مگر ذہنی توانائی اور جرأت و ہمت میں کوئی فرق نہ آیا۔ مالی معاملات میں امانت و دیانت کا یہ عالم کہ سرکاری کاغذ کے ٹکڑے کو بھی نجی استعمال میں لانا گوارا نہ تھا۔

اِن بے شمار خوبیوں اور غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بے صبری، بے رحم قسم کی صاف گوئی اور درشت مزاجی ایسی جو سب خوبیوں پر پانی پھیر دینے کے لیے کافی ہو۔

اُس وقت کے وزیرِ اعظم الحاج خواجہ ناظم الدین شریف النفس، وضع دار اور اُن تمام خوبیوں کے حامل تھے جو ایک نیک سیرت اور بے ضرر انسان میں پائی جاتی ہیں۔ سینہ بے کینہ اور دل گرد و غبار سے پاک صاف، یہاں تک کہ جب غلام محمد کی وفات کی خبر سُنی تو تعزیت کے لیے پہنچنے والوں میں سب سے پہلے۔ ہمیشہ مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات اور ۱۹۴۷ء میں سلہٹ کے ریفرنڈم میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ یہ ڈھیروں خوبیاں مگر حُسنِ تدبر اور قائدانہ صلاحیتوں سے بالکل تہی دامن۔ خواجہ صاحب کئی اعتبار سے مشرقی بنگال کے نواب ممدوٹ تھے۔

جنوری ۱۹۴۸ء میں جب خواجہ صاحب مشرقی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ تھے تو ہندو ممبرانِ اسمبلی کے اُکسانے پر طلبہ کے ایک قلیل طبقے نے ایجی ٹیشن کی جس کی وجہ سے خواجہ صاحب نے پہلے تو پُرزور مذمت کی اور ایجی ٹیشن کے پیچھے غیر ملکی ہاتھ قرار دیا۔ مگر کچھ روز بعد اُنھی طلبہ کے وفد سے ملاقات کے دوران اُن کے وہ تمام مطالبات منظور کر لیے جن میں بنگلہ کو قومی زبان بنانے سمیت بہت سے مطالبات سیاسی نوعیت کے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ اپنے گزشتہ

بیان کی تصحیح میں تازہ بیان دیں گے۔ یہ وُہ مطالبات تھے جنھیں لیاقت علی خان قومی اسمبلی میں ملکی سالمیت اور قومی یک جہتی کے خلاف ایک سازش قرار دے چکے تھے۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں قائدِ اعظم کو خود ڈھاکہ جاکر پلٹن میدان کے پبلک جلسہ میں اعلان کرنا پڑا کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو اور صرف اُردو ہو گی۔ اُنھوں نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ قیام پاکستان کے مخالفین اپنی تمام تر کوششوں کے ناکام ہونے پر مایوسی اور جھنجلاہٹ کے سبب پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کے درپے ہیں جس سے ہمیں ہوشیار رہنا ہوگا۔ یہ فتنہ وقتی طور پر دب گیا۔ ۱۹۵۲ء میں دوبارہ جاگ اُٹھا مگر افسوس اُس وقت نہ قائدِ اعظم اس دُنیا میں موجود تھے اور نہ لیاقت علی خان۔ ڈھاکہ میں نورالامین اور کراچی میں خواجہ ناظم الدّین خود تھے۔

خواجہ صاحب ۱۹۵۱ء میں گورنر جنرل بنے تو اپنی تن آسانی کے سبب مرغوں اور کتّے ریچھ کی لڑائی جیسے لہو و لعب میں مشغول رہے۔ اپنی بسیار خوری کے باعث گورنر جنرل ہاؤس میں خواجہ ناظم الدّین کے بجائے خواجہ ہاضم الدّین کہلائے۔ صُبح کو ناشتہ میں کِنگ سائز مرغابی پوری تناول فرما لیتے اور بھی کئی لطیفے اُن کی بسیار خوری کے پرانا سٹاف سنایا کرتا تھا۔ وزیرِ اعظم بنے تو کابینہ کی قیادت کرنے کے بجائے وزیروں کے ہاتھ میں کھلونا بنے رہے۔ وزیرِ تجارت فضل الرّحمان اور وزیرِ خوراک پیرزادہ عبدالستار کے ہاتھوں ناقص منصوبہ بندی کے باعث دونوں امور کا ستیاناس ہُوا تو خواجہ ناظم الدّین عوام الناس میں قائدِ قلت مشہور ہوئے۔

لیاقت علی خاں کی شہادت کے وقت خواجہ صاحب نتھیا گلی میں قیام پذیر تھے اور غلام محمد فالج کے حملے سے صحت یاب ہو کر راولپنڈی میں مقیم تھے۔ کہتے ہیں کہ کابینہ میں اِتفاق رائے تھا کہ غلام محمد کو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ پیش کیا جائے۔ خواجہ صاحب نتھیا گلی سے واپس تشریف لائے تو اُنھوں نے وزارتِ عظمیٰ کیلئے اپنا انتخاب کیا اور گورنر جنرل کے لیے غلام محمد کا نام تجویز کیا۔ اس فیصلے پر

حمید نظامی مرحوم کا تبصرہ جو اُنھوں نے اپنی ذاتی ڈائری میں ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو درج کیا لاجواب ہے۔ کوزے میں دریا بند کرنا اسے کہتے ہیں۔

"خواجہ ناظم الدین نے وزیراعظم کا عہدہ خود سنبھال لیا ہے۔ اس بوالعجبی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ گورنر جنرل کو وزیراعظم بننے کی کیا ضرورت تھی؟ یوں تو خواجہ صاحب بڑے نیک آدمی ہیں نمازی، پرہیزگار، خدا ترس، مگر یہ کام اُن سے چلنے کا نہیں۔ مسٹر غلام محمد کو جو راولپنڈی میں پڑے تھے گورنر جنرل بنا دیا گیا ہے۔ عجیب لوگ ہیں۔ ایک طرف کہتے ہیں کہ ملک کو جنگ کا خطرہ درپیش ہے۔ دُوسری طرف ایک بیمار آدمی کو ہیڈ آف سٹیٹ بنا دیتے ہیں اور جب حلفِ وفاداری کی رسم ادا ہو جاتی ہے تو پھر بسترِ مرض پر لٹا دیتے ہیں۔"

وزیراعظم کا عہدہ خواجہ ناظم الدین کا اپنا انتخاب تھا۔ گورنر جنرل کا عہدہ غلام محمد کا اپنا انتخاب نہ تھا۔ اُسے پیش کیا گیا تھا حالانکہ اُس وقت مغربی پاکستان کی دو بہت پُروقار اور تدبیر و تدبر کی حامل شخصیتیں موجود تھیں، سرحد سے سردار عبدالرب نشتر اور پنجاب سے راجہ غضنفر علی خان۔ یہ دونوں حضرات پرانے مسلم لیگی تھے۔ قائدِاعظم کے معتمد ساتھیوں میں سے تھے اور ملک کے اندر اور باہر بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی وزارتِ عظمیٰ یا سربراہِ مملکت کے عہدے پر فائز کیے جانے کا اہل تھا۔ اِن دونوں کو خواجہ صاحب یا اُن کی کابینہ نے کیوں نظر انداز کیا؟ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اِس کا یہ مطلب ہے کہ بیماری کے باوجود خواجہ صاحب اور اُن کی کابینہ کے دل میں غلام محمد کا اتنا احترام موجود تھا کہ اُسے ہیڈ آف سٹیٹ کے عہدے کی پیش کش کر دی گو اُن کی نگاہ اُس حد تک آگے نہ جا سکی کہ یہ ہے بے حد محنتی اور غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل۔ جب صحت مند ہو جائے گا تو پھر نچلا نہیں بیٹھ سکے گا۔

کرنی پڑے تو کیوں ڈرے کر کے کیوں پچھتائے
بوئے پیڑ ببول کے تو آم کہاں سے کھائے

ہندو شاعر تلسی داس کے اس شعر کا پہلا مصرع غلام محمد کے لیے اور دوسرا خواجہ صاحب پر صادق آتا ہے۔

غلام محمد اور خواجہ ناظم الدین جب اپنا اپنا عہدہ سنبھالتے ہیں تو بیمار مگر مستعد گورنر جنرل غلام محمد کا صحت مند مگر کاہل اور کمزور وزیرِ اعظم سے تصادم ناگزیر تھا۔ محبِ وطن دونوں تھے مگر دونوں کی سوچ اور طریقِ کار میں واضح تضاد موجود تھا۔ ایک سمجھے بیٹھا تھا کہ اسمبلی کے ممبران اور مسلم لیگ پارٹی کی اکثریت اُس کے ساتھ ہے تو دوسرے کے خیال میں ملک کی مالی، اقتصادی اور خوراک کی صورتِ حال، کمزور قیادت اور ناقص منصوبہ بندی کے ہاتھوں تباہی کے دہانے پر پہنچنے والی تھی۔

غلام محمد ملکی حالات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اُسے خواجہ صاحب کی طرح مُرغ یا بٹیر بازی سے کوئی رغبت نہ تھی۔ وہ چوہدری فضل الٰہی بھی نہیں تھا کہ فقط غیر ملکی سفیروں سے کاغذاتِ نامزدگی وصول کرنے ہی پر اکتفا کرتا۔ جنرل ضیاء الحق ٹھیک فرماتے ہیں کہ شخصیتوں کے بدل جانے سے صورتِ حال بدل جاتی ہے۔

خواجہ ناظم الدین دولتِ مشترکہ کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تو ملکۂ برطانیہ سے پُر زور اپیل کی کہ غلام محمد کو گورنر جنرل کے عہدہ سے سبکدوش کر دیا جائے مگر ملکہ نے خواجہ صاحب کی اِس درخواست کو رد کر دیا۔ اگلے سال غلام محمد نے خواجہ صاحب کو سبکدوش کر دیا تو خواجہ صاحب سیدھے اُسی ملکہ کے سفیر یعنی برطانوی ہائی کمشنر کے گھر شکایت لے گئے۔

میر کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

غلام محمد پکا کام کرنے کا عادی تھا۔ کوئی تار ڈھیلی نہ چھوڑتا تھا۔ اپنی ذات

پر پورا اعتماد تھا۔ خود سوچتا تھا۔ خود کرتا تھا اور شاید اسی لیے ابھی تک خود بھگت رہا ہے۔

چونکہ غلام محمد کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا اس لیے وزیراعظم کا مشرقی پاکستان سے ہونا ضروری تھا۔ پاکستان میں موجود تمام بنگالی سیاست دان آپس کے جوڑ توڑ میں ملوث ہو چکے تھے۔ نورالامین بھی مشرقی پاکستان میں اپنی مقبولیت کھو چکے تھے جیسا کہ ۱۹۵۴ء میں ایک طالبِ علم کے ہاتھوں اُن کی شکست سے ثابت ہو گیا تھا۔ وزارتِ عظمیٰ کے لیے کسی ایسے بنگالی کی ضرورت تھی جو اندرونی سازشوں سے مبرا ہو اور چاق و چوبند تر و تازہ اور "نوان نکور" بھی۔ غلام محمد کے خیال میں محمد علی بوگرا اِس خلا کو پُر کر سکتے تھے۔ لیاقت علی خان نے اُنھیں امریکہ جیسے اہم مُلک میں سفیر مقرر کیا تھا۔ اس سے پہلے وُہ مشرقی پاکستان اسمبلی کے مسلم لیگی ممبر تھے۔

ان واقعات پر فلمی اور ڈرامائی انداز میں افسانے گردش کرتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ غلام محمد کو خواجہ صاحب کی ملکہ کے حضور درخواست کا پتہ چلا تو وُہ غصّے سے کانپنے لگا اور بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ محمد علی بوگرا کو وزارتِ عظمیٰ پیش کی تو "اُس نے انکار کیا۔ اِس پر غلام محمد نے تکیہ کے نیچے سے پستول نکالا اور جنرل محمد ایوب خان کو آواز دی جو پردے کے پیچھے سٹین گن لیے کھڑے تھے"، وغیرہ وغیرہ۔

واقعہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی سبکدوشی پر ملک کے کونے کونے سے اور آج کل کے سرکاری ذرائع ابلاغ کی زبان میں "زندگی کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے محبِ وطن شہریوں"، کی جانب سے لاتعداد خطوط اور ٹیلیگرام موصول ہوئے جن میں گورنر جنرل کے فیصلے کو سراہا گیا تھا۔ مسلم لیگ کی صوبائی تنظیموں نے قراردادوں کے ذریعے اس فیصلے کی تائید کی۔ دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی نے (جس کی اکثریت کا خواجہ صاحب کو دعویٰ تھا) اتفاق رائے سے محمد علی بوگرا

کو قائدِ حزبِ اقتدار منتخب کرنے میں ذرا بھر تامل نہ کیا۔ نہ کسی کو پستول دکھانا پڑا، نہ سٹین گن سے ڈرانے دھمکانے کی نوبت آئی تھی۔ خواجہ ناظم الدین کی کابینہ کے بیشتر وزراء نے محمد علی بوگرا کی وزارت میں شمولیت اختیار کر لی۔ خواجہ صاحب اپنی پارٹی اور کابینہ کے رویّے سے اتنا دل برداشتہ ہوئے کہ کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔
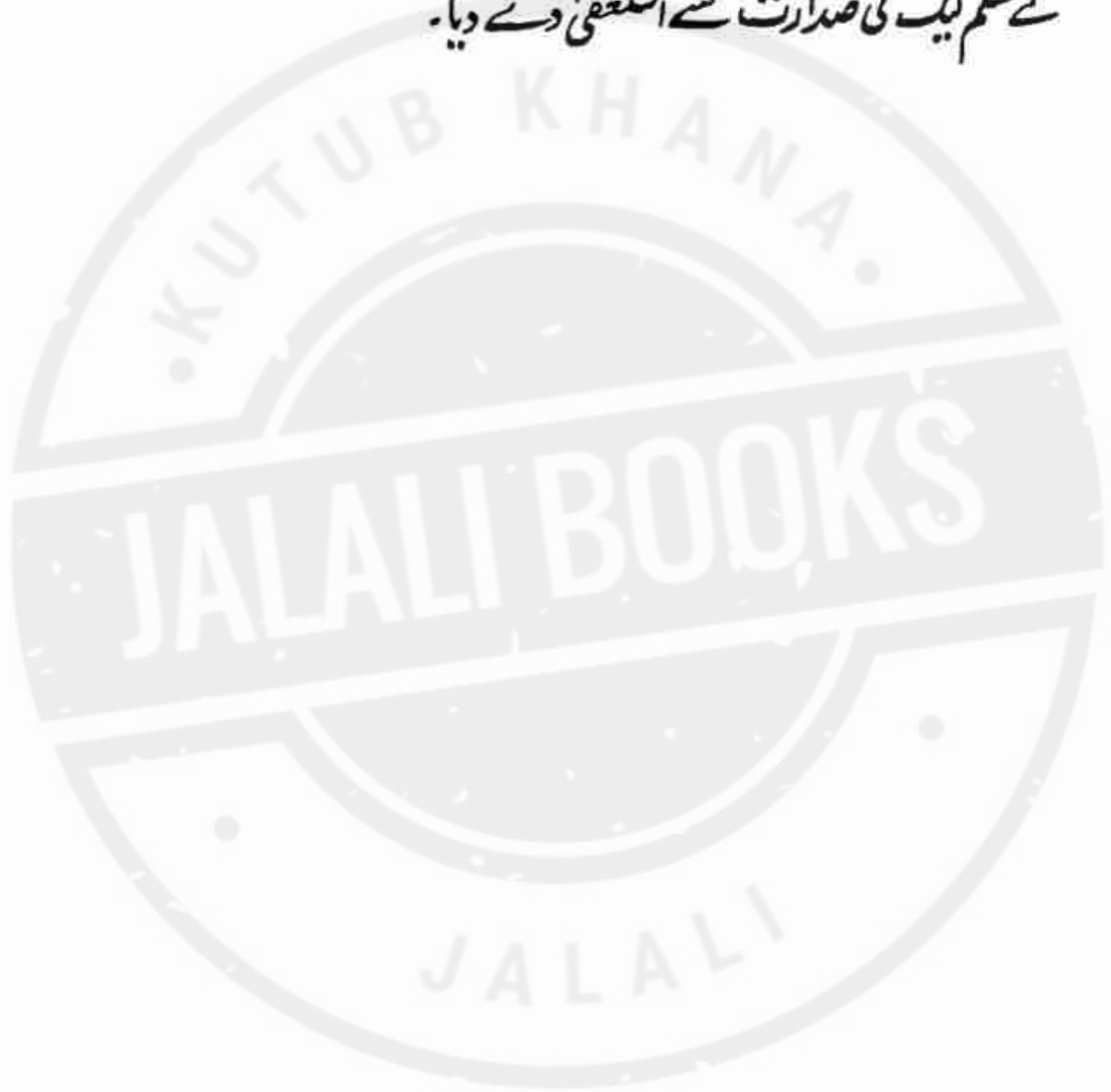
غلام محمد اور دستور ساز اسمبلی

غلام محمد کا دُوسرا قدم جس کی بازگشت اکثر سُننے میں آتی ہے وُہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں قومی دستور ساز اسمبلی کو توڑنا تھا اور جنرل ضیاء الحق کے مطابق "محض اقتدار کی خاطر" اسمبلی کو توڑ کر مردِ مفلوج نے ملک کو آئینی بحران سے دوچار کر دیا۔

اپنی تاریخ سے آگہی رکھنے والوں کو معلوم ہو گا کہ قیام پاکستان کے وقت جو حضرات ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات کی بدولت انڈین دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے وہی پاکستان کی قومی دستور ساز اسمبلی کے ممبر قرار پائے۔ اسی طرح صوبائی اسمبلیوں کے لیے منتخب شدہ ارکان نئی پاکستانی صوبوں کی اسمبلیوں کے ممبر قرار پائے۔ مقصد یہ تھا کہ مجلسِ دستور ساز پاکستان کا نیا آئین مرتب کرے جس کے تحت مرکز اور صوبوں میں عام انتخابات کروائے جائیں۔

بدقسمتی سے مجلس دستور ساز نہ آئین مرتب کر سکی تھی اور نہ عام انتخابات کا انعقاد ممکن ہو سکا تھا۔ ہر بات کی انتہا ہوتی ہے بالآخر لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلکنے لگتا ہے۔ بھارت دو سال کے عرصے میں اپنا آئین مرتب کر کے تاج برطانیہ کے جُوئے سے آزاد ہو کر جمہوری ری پبلک بن چُکا تھا۔ پاکستان کو قائم ہوئے سات برس ہونے کو تھے لیکن مجلسِ دستور ساز آئین کے بنیادی اُصول بھی طے نہ کر سکی تھی۔ کب تک انتظار ہوتا۔ عام انتخابات کا مطالبہ ہونے لگا بالخصوص مشرقی پاکستان میں یہ مطالبہ قابو سے باہر ہوتا نظر آتا تھا بلکہ صورتِ حال یہ تھی کہ صوبائی اسمبلی کی تیس تیس نشستیں خالی ہو چکی تھیں جن پر ضمنی انتخابات بھی نہ کروائے گئے کیونکہ حکومت خائف تھی کہ ضمنی انتخابات

کروائے گئے تو بیشتر نشستیں اپوزیشن کو چلی جائیں گی۔

عوام کے روزافزوں مطالبے کے سامنے صوبائی حکومت کو سرنگوں ہونا پڑا اور ۱۹۵۴ء کے اوائل میں مشرقی پاکستان میں عام انتخابات کا اعلان کردیا گیا۔ اس اعلان کے ہوتے ہی اپوزیشن پارٹیوں نے (پاکستان عوامی لیگ، کرشک سرامک پارٹی، نظام اسلام پارٹی اور گنا نتنتری دل) مشترکہ محاذ (جگتو فرنٹ) بنا کر مسلم لیگ کو عبرت ناک شکست دی، ۳۰۹ میں سے ۳۰۰ نشستیں جگتو فرنٹ نے جیت لیں۔

مشرقی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ اور صوبائی مسلم لیگ کے صدر نورالامین ایک طالب علم کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہوئے۔ جگتو فرنٹ میں حسین شہید سہروردی، شیخ مجیب الرحمٰن، شیرِ بنگال مولوی فضل الحق، مولانا عبدالحمید خان بھاشانی، ابوحسین سرکار اور مولوی فرید احمد جیسے طاقتور رہنما شامل تھے۔

انتخابات جیتنے کے بعد اُنھوں نے مطالبہ کیا کہ قومی دستور ساز اسمبلی اپنی نمائندہ حیثیت کم از کم مشرقی پاکستان کی حد تک کھو چکی ہے لہٰذا اسے توڑ کر نئی اسمبلی انتخابات کے ذریعہ وجود میں لائی جائے۔

اس مطالبے سے موجودہ دستور ساز اسمبلی کے اراکین میں سراسیمگی پھیل گئی اور اُنھوں نے جمہوری راستہ اختیار کرنے کی بجائے اندرونی سازبازی کی راہ اختیار کی تاکہ اسمبلی میں اپنی غیر آئینی اور غیر طبعی عمر کو غیر معینہ عرصے تک طول دیا جاسکے۔

جگتو فرنٹ سے محاذ آرائی کے ساتھ اُن کو سب سے زیادہ خطرہ گورنر جنرل غلام محمد کی طرف سے تھا کیونکہ وُہ غلام محمد کی قوتِ فیصلہ اور کسی بھی مخصوص جماعت سے غیر وابستگی سے آگاہ تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے پیش قدمی کے طور پر پہلا فیصلہ یہ کیا کہ گورنر جنرل کے اختیارات کو کم کردیا جائے تاکہ وُہ کابینہ کو برطرف نہ کر سکے۔ اور نہ ہی کابینہ کے مشورے اور پیشگی رضامندی کے بغیر کوئی قدم اُٹھا سکے۔

غلام محمد اُن دنوں ایبٹ آباد میں مقیم تھا۔ مشرقی پاکستان کے ممبران نے مغربی پاکستان کے اراکین بالخصوص سندھ سے تعلق رکھنے والے اراکین سے صلاح مشورے شروع کر دیے۔ سپیکر مولوی تمیز الدین اور پیرزادہ عبدالستار پیش پیش تھے۔ محمد ہاشم گزدر ڈپٹی سپیکر کے مکان پر خفیہ اجلاس منعقد ہوتے تھے۔ اس ساری کھُسر پھُسر کی خبریں ٹیلی فون پر ملک فیروز خان نون برابر غلام محمد کو فراہم کرتے رہے مگر غلام محمد نے فوری طور پر کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا اور ایبٹ آباد میں مقیم رہا۔

محمد ہاشم گزدر کے مکان پر عبوری آئین میں ترمیم کا مسودہ تیار ہوا اور راتوں رات ممبران میں تقسیم کر دیا گیا۔ ممبران کو ٹیلی فون پر اور دوسری طرح اطلاع دے دی گئی۔ صبح کو نو بجے مجلسِ دستور ساز کا اجلاس بلا کر آدھ گھنٹے سے کم عرصے میں ترمیم کا بل پاس کر کے اسی دن گزٹ نوٹیفیکیشن چھپوا کر پریس کو تقسیم کر دیا گیا۔ تمام کارروائی غیر جمہوری اور غیر اخلاقی انداز میں پوری کر لی گئی اور ہر کوئی مطمئن ہو گیا کہ شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم۔ اس تمام کارروائی میں محمد علی بوگرا پوری طرح ملوث رہا۔

غلام محمد ایبٹ آباد سے واپس کراچی پروگرام کے مطابق آیا اور پرائم منسٹر بوگرا پر اپنے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا جس سے بوگرا مزید مطمئن ہونے کی بجائے اُلٹا خوف زدہ رہنے لگا۔ کچھ دنوں بعد وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق چوہدری محمد علی، سکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خان کو ساتھ لے کر امریکہ روانہ ہو گیا۔

عبوری آئین میں ترمیم جس "چورا چوری" کے طریقے سے کی گئی اُس پر ملک کے سنجیدہ حلقوں میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا اور اپوزیشن پارٹیوں کو مزید تقویت ملی کہ وہ دستور ساز اسمبلی جو دستور تو کجا دستور کے بنیادی اصول بھی سات برس گزر جانے کے باوجود طے کرنے میں ناکام رہی ہو، اِس نے اپنے ذاتی مفاد میں اور محض اقتدار میں رہنے کی خاطر راتوں رات ترمیم جیسا اہم بل پاس کر دیا۔ اس اسمبلی کو توڑ کر نئی

دستور ساز اسمبلی کا قیام مشرقی پاکستان یعنی ملک کی اکثریت کا مطالبہ تھا۔ سربراہِ مملکت کے لیے اس کا نوٹس نہ لینا غیر جمہوری اور خطرناک عوامل کا حامل ہو سکتا تھا۔ اس مطالبے کے حق میں سب سے بلند اور پر زور آواز حسین شہید سہروردی کی تھی۔

آئین میں ترمیم ۲۱ ستمبر ۱۹۵۴ء کو کی گئی۔ اس ترمیم کا مقصد وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کے تحفظ کے پس پردہ موجودہ غیر نمائندہ اسمبلی کو محفوظ کرنا مطلوب اور غلام محمد کو چوہدری فضل الٰہی بنانے کی ناکام کوشش تھی۔ حالانکہ اگر دستور ساز اسمبلی کے ممبر چاہتے تو وہ دو تہائی اکثریت سے گورنر جنرل کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر کے اُس کی برطرفی کی سفارش کر سکتے تھے۔ اُس صورت میں غلام محمد کسی بھی انتقامی یا تادیبی کارروائی کا مجاز نہ رہ سکتا تھا مگر شاید وہ لمبا اور مشکل کام تھا یا چوں قضا آید طبیب ابلہ شود والی بات ہو۔ بہرحال گورنر جنرل نے مشرقی پاکستان کے مطالبے کے پیشِ نظر اور آئین مرتب کرنے میں ناکامی کے سبب ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو دستور ساز اسمبلی توڑ دی۔ اسی دن محمد علی بوگرا کی سرکردگی میں ۱۵ وزراء کے علاوہ جگتو فرنٹ سے حسین شہید سہروردی اور ابو حسین سرکار کو شامل کر کے نئی کابینہ نے حلف اُٹھایا۔

لُطف کی بات یہ ہے کہ "زندگی کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے محبِ وطن شہری" حسبِ معمول پھر ٹوٹ پڑے اور ٹیلی گرام و خطوط کے ذریعہ گورنر جنرل غلام محمد کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ ان دنوں مبارک دینے کے لیے وفود کی آمد کا رواج نہیں تھا۔ مولوی تمیز الدین نے البتہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سندھ چیف کورٹ نے گورنر جنرل کے فیصلہ کو غیر قانونی مگر فیڈرل کورٹ نے قانونی قرار دیا۔

اسمبلی کو توڑنے کے علاوہ ایک غیر جمہوری ہی سہی مگر غیر معمولی تجویز بھی غلام محمد کے ذہنِ رسا میں تھی اور وہ تھی بری فوج کے کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خان کو

اقتدار کی پیشکش جسے جنرل صاحب نے دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قبول نہ کیا۔ یہ پیش کش مشروط تھی۔ شرط یہ تھی کہ جنرل ایوب خان اقتدار سے تین ماہ یعنی نوّے دن کے اندر آئین کا مسودہ مرتب کر کے دیں گے جس پر ریفرنڈم کرایا جا سکے۔ جنرل صاحب کی سادہ لوحی کہئے کہ وہ نوّے دن کو حتمی اور سچ مچ کے نوّے دن سمجھ بیٹھے، شاید غلام محمد کے خوف سے ورنہ یہی سوچ لیتے کہ

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

نوّے دن گزرنے سے پہلے دو چار باشعور سیاست دان اصرار کرنے کے لیے بآسانی دستیاب ہو سکتے تھے یا زندگی کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے محب وطن تو کہیں نہیں گئے تھے کچھ نہ کچھ بندوبست ضرور ہو سکتا تھا۔ کس چیز کی کمی ہے مولا تری گلی میں۔ جنرل صاحب حامی بھر لیتے تو کام چل سکتا تھا جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس پر کیا فرق پڑ جانا تھا۔

اس سارے ٹلے گلے کا یہ فائدہ ہوا کہ سات آٹھ سالہ بوڑھی اور بانجھ مجلسِ دستور ساز کی تکفین و تدفین کے بعد نئی نویلی مجلسِ دستور ساز وجود میں آئی جس نے ایک سال سے بھی کم مدت میں ملک کا آئین مرتب کر کے تاریخ ساز کردار ادا کیا۔

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

لیاقت علی خاں کی شہادت اور غلام محمدؒ

ایک مخصوص طبقے کو جو افراد کے حوالے سے صوبوں کے درمیان منافرت اور شکوک و شبہات پیدا کرتے رہنا اپنے فرائض میں شامل سمجھتا ہے۔ اصرار ہے کہ لیاقت علی خان کے قتل میں غلام محمد ملوث تھا۔ ہر سال سولہ ستمبر کے دن یہ الزام دہرایا جاتا ہے۔ تاکہ آگ ٹھنڈی نہ ہو جائے۔ دلائل یہ دیے جاتے ہیں۔

- بنگال کے خواجہ شہاب الدین اور پنجاب سے نواب گرمانی اور غلام محمد پس پردہ لیاقت علی خان کو برا بھلا کہتے رہتے تھے اور لیاقت علی خان نے بقول نواب صدیق علی خان، ان تینوں کو وزارت سے سبکدوش کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ غلام محمد کو اس کا علم ہو گیا اور اس نے سازش کر کے لیاقت علی خان کو قتل کروا دیا۔
- جس روز لیاقت علی خان قتل ہوئے غلام محمد راولپنڈی میں ہوتے ہوئے بھی لیاقت علی خان کے جلسے میں نہ آئے حالانکہ وزیراعظم ایک بہت اہم تقریر کرنے والے تھے۔
- قاتل سید اکبر (افغان) کا ایبٹ آباد کی حدود سے باہر نکلنا سرحد حکومت نے ممنوع کیا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ راولپنڈی پہنچ گیا اور جلسہ گاہ میں صف اول میں بیٹھنے میں کامیاب ہوا حالانکہ وہاں پنجاب پولیس کا پہرہ تھا۔
- سید اکبر نے گولی چلائی تو لوگوں نے اسے پکڑ لیا، اتنے میں پنجاب پولیس کا سب انسپکٹر (شاہ محمد) آیا اور اس نے ریوالور نکال کر سید اکبر کو ہلاک کر دیا۔
- پنجاب پولیس نے شاہ محمد کو ڈسچارج کر کے پنشن پر بھیج دیا اور کمشنر راولپنڈی

مسٹر انعام الرحیم کو جبری طور پر ریٹائر کر دیا گیا کیونکہ وہ قدرے منہ پھٹ تھے اور سچی بات کہہ دیتے تھے۔

و۔ بیگم لیاقت علی خان نے بار بار کہا کہ اُن کے خاوند کا قتل کسی گہری سازش کا نتیجہ ہے جس میں کوئی غیر ملک بھی ملوث ہے۔ بیگم لیاقت علی خان کا منہ بند کرنے کے لیے اُنھیں سفیر بنا کر ملک سے باہر بھیج دیا گیا۔

ر۔ کراچی پولیس کے انسپکٹر جنرل اعتزاز الدین تحقیق مکمل کر کے لاہور سے کراچی آتے ہوئے ہوائی حادثہ میں ہلاک ہو گئے یا کر دیئے گئے۔ اُن کے ساتھ سارے دستاویزی ثبوت تلف ہو گئے۔

یہ سارے دلائل یا مفروضے خود اپنی تکذیب کرنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ لیاقت علی خان نے غلام محمد کو سبکدوش کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا تو اس سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا گیا کہ غلام محمد نے پیش قدمی کے طور پر لیاقت علی خان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا؟ لیاقت علی خان کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی سے خواجہ ناظم الدین اور دُوسرے وزراء اتنے بے خبر تھے کہ لیاقت علی خان کی شہادت پر بیمار غلام محمد کو سربراہ مملکت کا عہدہ پیش کر دیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہُوا کہ خواجہ ناظم الدین بھی غلام محمد کی سازش میں شریک ہوں گے جبھی تو وہ جھٹ وزیراعظم بن گئے اور غلام محمد کو گورنر جنرل بنا دیا۔ شہادت والے دن غلام محمد راولپنڈی میں موجود ضرور تھے مگر فالج کے حملے کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ پبلک جلسے میں کیسے شریک ہوتے؟ وزیر خزانہ یا کسی بھی وزیر کا وزیراعظم کے پبلک جلسے میں شریک ہونا لازمی نہیں ہوتا ورنہ بصورتِ دیگر اُس کی وفاداری مشکوک ہو جائے گی۔ بجز آنکہ وزیراعظم حکم دیں۔ بیگم لیاقت علی خان کا یہ بیان کہ اُن کے شوہر کا قتل گہری سازش کا نتیجہ ہے اور یہ کہ کسی غیر ملک کا ہاتھ ہے غلام محمد کے خلاف کیسے کہا جا سکتا ہے؟ پھر یہ کہنا کہ فقط بیگم لیاقت علی خان کا منہ بند کرنے کے لیے اُنھیں سفیر بنا کر ملک سے باہر بھیج دیا گیا اُس محترم خاتون کی توہین کرنے کے مترادف

ہے۔ سازش اور بالخصوص قتل کی سازش میں وہ شخص ملوث ہو سکتا ہے جو عیار اور بزدل ہو۔ غلام محمد کے ضمن میں یہ حقیقت شک و شبہ سے بالا ہے کہ وہ نڈر، بیباک اور ہر قسم کے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا اہل بھی تھا اور عادی بھی

ایک طرف یہ واویلا کہ غلام محمد جسمانی اور ذہنی طور پر مفلوج اور پاگل آدمی تھا۔ دوسری طرف یہ غوغا کہ اُس نے سیاستدانوں کی ذاتی چپقلش اور نااہلی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے اختیارات کا بڑی چابکدستی سے استعمال کیا۔ ایک طرف یہ اقرار کہ خواجہ ناظم الدین وزارتی اور قائدانہ ذمہ داریاں نبھانے کے اہل نہ تھے۔ دوسری طرف یہ اصرار کہ اُن کی برطرفی غلام محمد کے ذاتی انتقام پر مبنی تھی۔ یہ اعتراف بھی کہ دستور ساز اسمبلی سات برس میں دستور سازی میں انچ بھر پیش رفت نہ کر سکی اور مزید سات سال بھی نہ کر سکتی۔ دوسری طرف یہ الزام کہ اس اسمبلی کو توڑ کر نئی اسمبلی کو وجود میں لانا (جس نے صرف ایک برس میں آئین مرتب کر لیا) محض ذاتی اقتدار کی خاطر تھا۔ یہ سب بوالعجبیاں نہیں تو کیا ہیں ؟

معروف محقق اور مصنف ڈاکٹر صفدر محمود کے ساتھ گفتگو کے دوران میں ایک دفعہ راقم نے اِس خیال کا اظہار کیا کہ غلام محمد کی کردار کشی میں صوبائی عصبیت کو بڑا دخل ہے تو انہوں نے تصدیق کی اور بتایا کہ اپنی تحقیق کے دوران میں اُنھوں نے جن اکابرین سے انٹرویو لیے اُن میں چوہدری محمد علی بھی شامل تھے اور چوہدری صاحب نے بالکل یہی بات کہی تھی۔
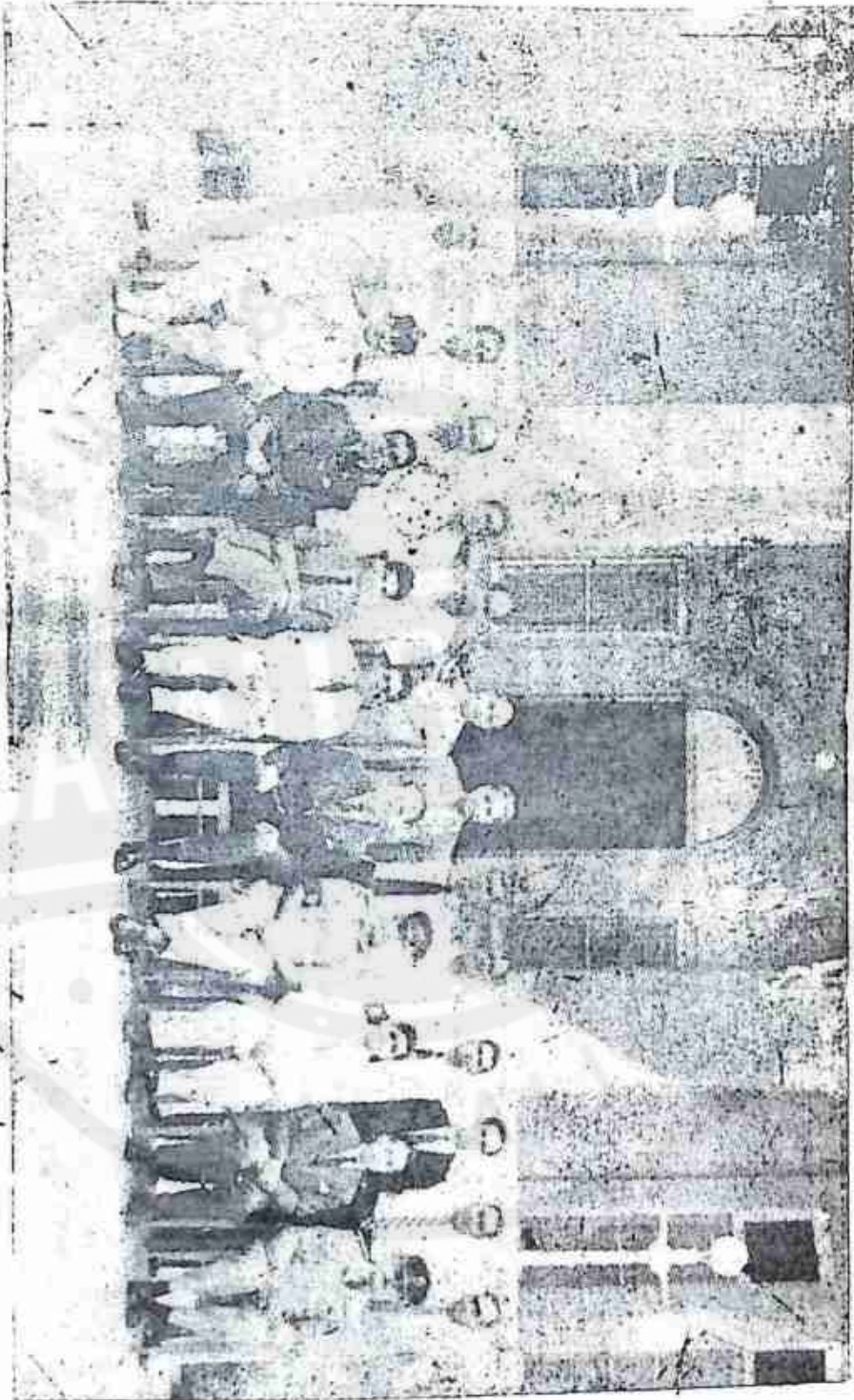
قدرت اللہ شہاب کی ایوانِ صدر سے روانگی کے موقع پر صدارتی عملہ کا ایوب خاں کے ساتھ گروپ فوٹو

دُوسرا حِصّہ

میجر جنرل اسکندر مرزا

اکتوبر ۱۹۵۵ء — اکتوبر ۱۹۵۸ء

اسکندر مرزا کی ایکٹنگ

غلام محمد علیل ہوئے اور کارِ سرکار کے لیے بے کار ہوتے دکھائی دینے لگے تو انھیں دو ماہ کی رخصت مل گئی۔ اُن کی جگہ وزیر داخلہ وامورِ کشمیر میجر جنرل سکندر مرزا کو ایکٹنگ گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ اُن کی اس تقرری سے حکومت مکمل طور پر بیوروکریسی کے قبضے میں چلی گئی۔ ایک سابق وفاقی سیکرٹری چوہدری محمد علی وزیراعظم اور ایک سابق سیکرٹری میجر جنرل سکندر مرزا گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

اسکندر مرزا ہر روز صبح سویرے گورنر جنرل ہاؤس میں تشریف لاتے۔ ان کی گاڑی کے آگے صرف ایک موٹر سائیکل سوار اور پیچھے پولیس کی ایک پک اپ ویَن ہوتی۔ گورنر جنرل ہاؤس کے قریب پہنچنے سے قبل ہی پولیس والے سائرن بجانا بند کر دیتے۔ اسکندر مرزا کی گاڑی مین گیٹ کی بجائے کراچی جم خانہ گیٹ سے داخل ہوتی اور پورچ میں رکنے کی بجائے لان کو روندتی ہوئی مشرقی کونے میں واقع دفتر والے کمرے کے سامنے رُکتی۔ اے ڈی سی اسکندر مرزا کو کمرے میں بٹھا کر سب افسران کو فرداً فرداً اطلاع دے دیتا کہ ایچ ای تشریف لے آئے ہیں کاغذات اور فائلیں بھیج دی جائیں۔ دوپہر ایک بجے کے قریب اسکندر مرزا اسی طرح خاموشی سے اُسی پچھلے دروازے سے واپس گھر تشریف لے جاتے۔

تقریباً پندرہ بیس روز بعد غلام محمد کو قدرے افاقہ ہوا اور وہ کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے وہیل چیئر پر بیٹھ کر کمرے سے باہر نکلنا شروع ہوئے۔ عملے کو حکم دے دیا گیا کہ جیسے ہی غلام محمد صاحب کمرے سے باہر تشریف لانے کا

ارادہ ظاہر فرمائیں اے ڈی سی کو فوراً اطلاع دی جائے تاکہ وہ اسکندر مرزا کو خبردار کر دے۔ اس صورت میں اسکندر مرزا اپنے کاغذات سمیٹ کر دفتر سے "کھسک" کر گاڑی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو جاتے۔ غلام محمد کو علم نہ ہو سکا کہ وہ چھٹی پر ہیں اور کوئی دوسرا شخص ایکٹنگ گورنر جنرل بنا ہوا ہے۔

دو ماہ گزر جانے سے پہلے ہی غلام محمد کو ریٹائر ہونے پر رضامند کر لیا گیا۔ وہ چوہدری محمد علی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ غلام محمد کو رضامند کرنے کی خدمت اسکندر مرزا کے کہنے پر انھوں نے ہی سرانجام دی، علاوہ ازیں غلام محمد کی لڑکی اقبال بیگم کو سمجھایا گیا کہ والدِ محترم کو راضی کریں۔ غلام محمد کو اپنی اکلوتی بیٹی سے بڑی محبت تھی اور اُس کی ہر بات مان لیا کرتے تھے۔ یُوں اسکندر مرزا کی ایکٹنگ اختتام پذیر ہوئی اور غلام محمد کی ریٹائرمنٹ پر وہ باقاعدہ گورنر جنرل بنا دیے گئے۔

غلام محمد کے گورنر جنرل ہاؤس سے رُخصت ہونے سے تقریباً ہفتہ پہلے اقبال بیگم نے اپنے والد کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ خدمت گاروں، بیروں، خانساموں، چپڑاسیوں، مالیوں اور صفائی کے عملے کو حسبِ مراتب اور حسبِ خدمات بخشش تقسیم کی۔ زیادہ سے زیادہ پانچ سو روپیہ اور کم سے کم ایک سو روپیہ فی کس دیا گیا۔

پرسنل سٹاف کے لیے غلام محمد نے اپنی تصویر پہ دستخط کر کے چاندی کے فریم میں تحفتاً دی۔ راقم کے لیے تصویر پر جب دستخط کرنے لگے تو ملٹری سیکرٹری کرنل سید نیّر رضا کو جو دستخط کروا رہے تھے کہا کہ اسے چھوڑ جاؤ۔ بعد میں راقم کو بلایا۔ کالے رنگ کے بکس سے تصویر نکالی اور قلم لے کر اُوپر لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ وصول کی تو ٹیڑھی میڑھی لکھائی یُوں تھی۔

For Khalid, in appreciation of his devoted service

واپس آنے لگا تو کہا ٹھہرو۔ کالا بکس دوبارہ کھلا اور شیفر فونٹن پین اور پنسل کا ڈبہ نکالا۔ پوچھا یہ نیا سیٹ لینا پسند کرو گے یا پرانا استعمال شدہ؟ میں

ے جذباتی ہوتے ہوئے موخر الذکر کی طرف اشارہ کیا۔ واپس کمرے میں آکر خیال آیا کہ خواہ مخواہ جذبات میں بہہ گیا۔ نیا بیٹ بہتر تھا۔ یہ پرانا استعمال شدہ قلم تو وہی ہے جس سے خواجہ ناظم الدین کا کام تمام اور دستور ساز اسمبلی کا قلع قمع کیا تھا۔ سبز رنگ کا یہ قلم میرے پاس ابھی تک محفوظ ہے۔ البتہ تصویر خراب ہو گئی ہے اور چاندی کے فریم کا رنگ سیاہ ہو چکا ہے۔

اسکندر مرزا پانچ یا چھ ماہ تک گورنر جنرل رہے۔ اگلے سال یعنی مارچ ۱۹۵۶ء میں پاکستان کے اسلامی جمہوریہ بن جانے پر دستور ساز اسمبلی نے انھیں اتفاقِ رائے سے مملکتِ خداداد پاکستان کا پہلا صدر منتخب کر لیا۔

صدر کے انتخاب کے لیے دستور میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے کاروبار کو قرآن و سنتِ رسولؐ کے مطابق چلانے کی خاطر تین شرائط درج ہوئی تھیں۔ اوّل یہ کہ وُہ پاکستان کا شہری اور مسلمان ہو۔ دوم اُس کی عمر چالیس سال سے کم نہ ہو اور سوم وُہ اسمبلی کا ممبر بننے کا اہل ہو۔

اسکندر مرزا بفضلِ تعالیٰ تینوں شرائط پر کماحقہٗ پورا اترتے تھے، چوتھی شرط جو کسی بھی دستور میں کبھی بھی لکھی نہیں جاتی وُہ ہے صدر بننے کی خواہش اور بروقت مناسب منصوبہ بندی، اسکندر مرزا کی کامیابی اس آخری شرط کی مرہونِ منت تھی۔

دستور ۱۹۵۶ء کے ساتھ منسلک قرار دادِ مقاصد کا مطالعہ کیا جائے۔ دستور ساز اسمبلی کے معزّز اراکین کی فہرست کو سامنے رکھا جائے اور پھر اسکندر مرزا کے ماضی حال اور مستقبل کا جائزہ لیا جائے تو اِس حُسنِ انتخاب پر بانگِ درا میں ظریفانہ کلام کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

دَورِ سکندری

غلام محمد کے بعد سکندر مرزا تشریف لائے تو ماحول میں یک گونہ تبدیلی کا احساس ہوا۔ سکندر مرزا ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک تھے نہ جوش میں آتے نہ طیش کھاتے۔ اپنے سٹاف اور عملے سے شفقت کا برتاؤ کرتے۔ فارسی اور پشتو خوب جانتے اور بڑی روانی سے بولتے تھے۔ پشتو سے بالخصوص اُنس تھا۔ صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے مالیوں سے پشتو میں گفتگو کر کے لُطف اُٹھاتے۔ ایران اور افغان سفیروں اور اُن کی بیگمات کے ساتھ فارسی میں بات چیت ہوتی۔

ایوانِ صدر کے سٹاف میں غلام محمد کی روانگی کے بعد گھٹن کی فضا میں جیسے ہی کمی واقع ہوئی تو زندگی کے دُوسرے مشاغل اور فرائضِ منصبی کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ پریذیڈنٹ کے سیکرٹری قدرت اللہ شہاب نے بسم اللہ کی اور ڈاکٹر عفت سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ڈاکٹر عفت کا تعلق سیالکوٹ کے ایک اوسط درجہ کے گھرانے سے تھا۔ وُہ تازہ تازہ ایم بی بی ایس کی ڈگری لینے کے بعد لاہور میں مقیم تھیں کہ شہاب صاحب کے دوستوں کی وجہ سے رشتہ طے ہو گیا۔ مسعود کھدر پوش اِن دوستوں میں شامل تھے۔ ڈاکٹر عفت سادہ طبیعت کی مالک اور صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔ عقد سادہ طریق سے ہُوا۔ اُن کے جہیز میں فقط دو چیزیں تھیں۔ ایک عفت دُوسری شرافت۔ کراچی آ کر میاں بیوی کی طرف سے ایک استقبالیہ دعوت دی گئی جس میں سکندر مرزا اور بیگم ناہید سکندر مرزا نے شرکت کی۔ دعوت نامہ میں تحائف قبول نہ کرنے کی پیشگی معذرت درج تھی۔

شنید ہے کہ ایک موقع پر قدرت اللہ شہاب مشہور افسانہ نویس قراۃ العین حیدر سے شادی کے خواہش مند تھے مگر موصوفہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ موصوف پست قد اور حسب و نصب کے اعتبار سے اُن کے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ بعد میں شہاب صاحب گورنر جنرل کے سیکرٹری کی حیثیت سے معروف ہوئے تو موصوفہ نے اپنے گزشتہ انکار سے رجوع کر لینے کا اظہار کیا تو موصوف نے انکار کر دیا۔ اس روایت کے راوی ماہنامہ ساقی کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی تھے اور بقول اُن کے پیغام رسانی کے فرائض بھی اُنھیں نے ادا کیے تھے۔ واللہ واعلم!

شہاب صاحب کے بعد بری فوج کی طرف سے آئے ہوئے اے ڈی سی کیپٹن سعید احمد نے امریکی سفیر کی لڑکی سے شادی رچائی اور فوج سے ریٹائر ہو کر امریکہ اپنے سسرال چلے گئے۔ ایک خربوزے کو دیکھ کر دُوسرے خربوزے نے رنگ پکڑا اور پاکستان نیوی کے سفید پوش اے ڈی سی لیفٹیننٹ سید اقبال امام نے سکندر مرزا کی لڑکی سے شادی کر ڈالی جو سکندر مرزا کی پہلی بیگم سے تھیں۔ سید اقبال امام نے بھی نیوی کو خیر باد کہہ دیا۔ پاکستان ائیر فورس سے آئے ہوئے اے ڈی سی فلائٹ لیفٹیننٹ عبدالحلیم قلتِ وقت کے باعث البتہ شادکام ہونے سے رہ گئے۔

ہر نئے سربراہ کے آنے پر ایوانِ صدر میں تھوڑی بہت تطہیر کا عمل ضرور ہوتا ہے۔ سکندر مرزا تشریف لاتے ہوئے وزارتِ داخلہ میں اپنے پرائیویٹ سیکرٹری نصرت الدین احمد (این ڈی احمد) کو ہمراہ لیتے آئے تھے جن کے لیے پرسنل سیکرٹری کا عہدہ مہیا کیا گیا۔ موجودہ پرسنل سیکرٹری مس روتھ بورل جسے غلام محمد جرمنی میں پاکستانی سفارت سے اٹھا لائے تھے اور جو سویڈش تھیں وطن رخصت ہو گئیں۔ فرخ امین جو ۱۹۴۷ء میں قائدِاعظم کے پرسنل اسسٹنٹ اور خواجہ ناظم الدین کے زمانے میں اسسٹنٹ سیکرٹری بنائے گئے تھے تبدیل کر دیے گئے۔ فرخ امین کو قائدِاعظم، محترمہ فاطمہ جناح، خواجہ ناظم الدین اور غلام محمد کا کامل اعتماد حاصل رہا تھا۔ اُن کی جگہ ایک شخص عبدالوحید نے لے لی۔ یہ صاحب قادیانی

تھے انھیں کئی سال پہلے چوہدری محمد ظفراللہ خان نے وائسرائے ہاؤس دہلی میں کلرک رکھوایا تھا۔ تقسیم کے وقت مسلمانوں میں سب سے سینئر کلرک قرار پائے گئے۔ پاکستان پہنچ کر سپرنٹنڈنٹ بن گئے۔ عبدالوحید نے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے بعد رنگ برنگے تجربات کیے اور خوب خوب ہاتھ رنگے جس کی تفصیل آگے چل کر ایوب خاں کے تذکرے کے دوران بیان کی جائے گی۔

نصرت بہت ہشیار اور تربیت یافتہ تھے۔ اُن کے سُسر بھی کبھی کبھی کسی کام سے نصرت کے پاس دفتر میں آتے تو میرے کمرے میں بھی تشریف لاتے کہ میرے کچھ بزرگوں کو جاننے کا دعویٰ تھا۔ ان صاحب کا نام خواجہ عبدالغنی تھا۔ لاہوری پارٹی کے مرزائی اور مشہور مبلغ خواجہ کمال الدّین کے عزیز تھے۔ انھیں مل کر بڑی عبرت ہوتی کہ یا اللہ اس شخص کو آخر کیا ہو گیا ہے اور اسے کیوں اس عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ساٹھ اور ستر کے درمیان عمر، چہرے پر مرزائی کٹ داڑھی، بغل میں کاغذات کا پلندہ، اس کوٹھی کی خرید، اُس زمین کی رجسٹری، اس پلاٹ کا قبضہ، پورے ملیر کی زرعی اراضی کو اپنے نام الاٹ کروا لینے کی دھن سر پر سوار، سارا سارا دن دھوپ میں مارے مارے پھرتے۔ مجھے بھی بڑی محبت اور شفقت سے سمجھانے کی کوشش کی۔ فرمایا برخوردار ماشاء اللہ آج اچھی پوزیشن میں ہو۔ کل کا کسی کو پتہ نہیں۔ انسان کو کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ بہت سے پلاٹ اب بھی خالی پڑے ہیں۔ میرے پاس پوری اور مکمل لسٹ ہے۔ نقشے بھی ہیں۔ آج 'لکھ' میں لے سکتے ہو کل یہی 'لکھ' کے ہوں گے۔ نصرت تو خیر اُن کا داماد تھا تابعدار، فرمانبردار، کام کرنے اور کروانے میں ماہر، مجھ سے البتہ خواجہ صاحب کو مایوسی ہوئی۔ اللہ نے مجھے محفوظ رکھا۔ تاہم اُن کے بتائے ہوئے نزلہ زکام کے نسخے سے ضرور مستفید ہوا اور اب تک دُعا دیتا ہوں۔

اسکندر مرزا بہت سے قومی اعزازات کے حامل تھے جو ابھی تک برقرار اور ناقابلِ شکست ہیں۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پہلے "منتخب صدر" اور

پہلے بیوروکریٹ جنھیں سیاست دانوں اور منتخب قومی نمائندوں نے خوشی خوشی اور مکمل اتفاق رائے سے سربراہِ مملکت کے عہدہ پر فائز کیا۔ اُن کا دوسرا قومی اعزاز "منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے" کا ہے یعنی وُہ پہلے سربراہِ مملکت جو مسلمانوں کی سیاسی کشمکش کے دوران میں سلطنتِ برطانیہ کے پُرخلوص خیر خواہ اور وفادار رہے اور جن کا جنگِ آزادی میں رتی بھر حصّہ نہ تھا اس کے باوجود آزادی کے صرف آٹھ برس بعد اُس وقت کی قومی اسمبلی کے عزت مآب اراکین نے انھیں ۳۱ توپوں کی سلامی کا حقدار ٹھہرایا۔ اگر مسئلہ صرف دانے پانی کا ہوتا تو کہہ سکتے تھے" بناداں آں چناں روزی رساند کہ داناں اندراں حیراں بماند" مگر یہ ایک نو آزاد ملک کی باگ ڈور حوالے کر دینے کا معاملہ تھا لیکن ان عزت مآب بزرگوں نے پہلے کون سے نیک کام کیے تھے ایک بیمار اور مفلوج وزیرِ خزانہ کو اُٹھا کر گورنر جنرل اور ایک تن آسان "ڈھلل" نیک آدمی کو حکومت کا سربراہ بنا کر دونوں کی مٹی پلید کی تھی۔

اسکندر مرزا مغربی بنگال کے شہر مرشد آباد میں نواب خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ ملازمت کا آغاز انڈین آرمی سے کیا تھا۔ چار پانچ برس ہی میں اصلی صلاحیتیں اجاگر ہونا شروع ہوئیں تو انڈین پولیٹیکل سروس میں تبدیل کر دیا گیا۔ جہاں اُس نے تقریباً بیس برس تک ہمارے صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں انگریز حکمرانوں کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ آزادی سے ایک سال قبل ۱۹۴۶ء میں وزارتِ دفاع میں جوائنٹ سیکرٹری کے عہدے پر ترقی ملی۔ پاکستان کے قیام پر وزارتِ دفاع کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ کہتے ہیں لیاقت علی خان اُنھیں ناپسند کرتے تھے۔ مئی ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان کے گورنر بنے۔ اُسی سال اکتوبر ۱۹۵۴ء میں داخلہ اور سرحدی امور کی وزارت کا قلمدان سپرد ہوا۔

اگست ۱۹۵۵ء میں ایکٹنگ گورنر جنرل بنا دیے گئے۔ مارچ ۱۹۵۶ء میں پہلے آئین کے نفاذ پر قومی اسمبلی نے اتفاق رائے سے اسلامی جمہوریہ پاکستان

کا پہلا صدر منتخب کیا۔ سیکرٹری دفاع کے عہدے تک کرنل اسکندر مرزا تھے۔ مشرقی پاکستان کے گورنر بنے تو میجر جنرل اسکندر مرزا کہلائے۔ بعد میں اگرچہ رتبہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا مگر فوجی رینک کے سلسلے میں گنجائش کے باوجود کسر نفسی سے کام لیا۔ جو تھے اُسی پر اکتفا کیا۔ ایک بیورو کریٹ کا صرف دو سالوں میں اس تیزی سے بام عروج کو پھلانگ کر سربراہ مملکت کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہونا ایک غیر معمولی بات تھی بیوروکریٹ بھی وُہ جس کا ماضی یا حال کسی غیر معمولی نوعیت کا نہ ہو اور بھی تعجب کا موجب ہونا چاہیئے۔

اس سبک روی کی مختصر تفصیل دلچسپی سے خالی نہیں ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں عام انتخابات کے نتیجے میں جگتو فرنٹ کی کامیابی دور رس نتائج کی حامل ثابت ہوئی۔ مسلم لیگ کا ایسا صفایا ہُوا کہ پُوری کی پوری صوبائی کابینہ مع وزیر اعلیٰ نورالامین عبرتناک شکست سے دوچار ہوئی۔ جگتو فرنٹ کے لیڈر اے کے فضل الحق (شیر بنگال) مشرقی پاکستان کے نئے وزیر اعلیٰ بنے۔ انتخاب کے دوران مغربی پاکستان بالعموم اور پنجاب بالخصوص کے خلاف جس طرح جذبات کو بھڑکایا گیا تھا اب اُس کے عملی اظہار کا موقع تھا۔ فسادات کی لہر ایک سرے سے دُوسرے سرے تک پھیل گئی۔ انہی دنوں فضل الحق نے کلکتہ (بھارت) جاکر مشرقی اور مغربی بنگال کو دوبارہ ایک کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ نتیجتاً اُس کی وزارت کو مرکزی حکومت نے برخاست کر کے مشرقی پاکستان میں گورنر راج کے نفاذ کا اعلان کیا اور سیکرٹری دفاع اسکندر مرزا کو وہاں کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ ایک سینئر سول سرونٹ کو کسی صوبے کا گورنر بنانا اُس زمانے میں کوئی اچنبے کی بات نہ تھی۔ کئی دوسرے سول سرونٹ بھی گورنر بنائے جا چکے تھے۔ مثال کے طور پر اختر حسین، میاں امین الدین، خان قربان علی خان اور جسٹس دین محمد، مگر جن حالات میں جس غرض سے اسکندر مرزا کو مشرقی پاکستان بھیجا گیا وہ واضح تھی۔ اسکندر مرزا مشرقی پاکستان میں امن و امان بحال کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اسی سال اکتوبر

۱۹۵۴ء میں قومی اسمبلی کو توڑنے اور بوگرا وزارت کی سبکدوشی پر جب دوبارہ محمد علی بوگرا کی وزارت تشکیل دی گئی تو اسکندر مرزا کو بطورِ وزیرِ داخلہ شامل کر لیا گیا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے قومی اسمبلی اور بوگرا وزارت کو سبکدوش کرتے وقت غلام محمد نے جنرل ایوب خان کو اقتدار کی پیش کش کی تھی جسے کچھ اس وجہ سے کہ پیشکش مشروط تھی یعنی نوے دن میں آئین مرتب کر کے دینا اور کچھ اس بنا پر کہ پیشکش بالکل اچانک اور قطعی غیر متوقع تھی جنرل ایوب نے جھجھک محسوس کی اور معذوری کا اظہار کر دیا مگر اقتدار کی کشش نے موقع کو بالکل ہاتھ سے جانے بھی نہ دیا اور وہ نئی وزارت میں وزیرِ دفاع کا عہدہ قبول کرنے میں رضامند ہو گئے۔ غلام محمد نے اِس جوابی پیشکش کو قبول کیا۔ نئی وزارت تشکیل ہونے لگی تو غلام محمد نے ایوب خان سے وزارت سازی پر تجاویز مانگیں۔ ایوب خان نے محمد علی بوگرا سے مشورہ کر کے اسکندر مرزا کا نام تجویز کیا۔ اسکندر مرزا درمیان میں آئے تو اُنھوں نے ڈاکٹر خان صاحب، ایم اے ایچ اصفہانی، ابراہیم اسمٰعیل رحمت اللہ اور لاء کالج کراچی کے نوجوان لیکچرار ذوالفقار علی بھٹو کو شامل کرنے کا مشورہ دیا اور یوں وزارت کی تشکیل مکمل ہوئی۔ حسین شہید سہروردی پہلی بار مرکزی وزارت میں بیٹھے لیکن اُن کے مقابلے میں ایک طاقتور گروپ سامنے آیا جو جنرل ایوب خان، میجر جنرل اسکندر مرزا اور ڈاکٹر خان صاحب پر مشتمل تھا۔

اگست ۱۹۵۵ء میں جب ایکٹنگ گورنر جنرل بنانے کا سوال اُٹھا تو اسی گروپ نے اسکندر مرزا کا نام تجویز کیا۔ اس تجویز کی بھرپور تائید چوہدری محمد علی نے بھی کی۔ اسکندر مرزا ایک بار ایکٹنگ گورنر جنرل بن گئے تو غلام محمد کی ریٹائرمنٹ پر باقاعدہ گورنر جنرل بنائے جانے کا حق دار ٹھہرے۔ گورنر جنرل کی حیثیت میں اُنھوں نے اپنی پوزیشن اتنی مستحکم کر لی کہ صدارت کے وہی حقدار ٹھہرائے گئے اور یوں سیکرٹری دفاع سے صدرِ پاکستان تک کا سفر چٹکیوں میں طے ہو گیا۔

انڈین پولیٹیکل سروس میں تربیت کی بدولت سکندر مرزا کو لوگوں کو ایک دوسرے

کے خلاف استعمال کرنے کا وسیع تجربہ تھا۔ اس وسیع تجربے سے وسیع پیمانے پر اور قومی سطح پر استفادہ کرنے کا موقعہ ہاتھ آیا لہٰذا بغیر وقت ضائع کیے مصروف ہو گئے طریقہ کار بالکل سیدھا سادھا تھا۔ نہ کاغذی گھوڑے دوڑائے جاتے نہ ہرکارے اِدھر سے اُدھر بھاگے پھرتے۔ بیٹھے بٹھائے اشارے کنائے سے سب کام بطریقِ احسن نپٹائے جاتے۔ نہ شور نہ شرابا۔ صدرِ پاکستان سگریٹ ہونٹوں میں دبائے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ایوانِ صدر کے وسیع و عریض ٹیرس پر چہل قدمی فرماتے۔ اسی دوران میں بڑے بڑے جغادری سیاستدان حاضرِ خدمت ہو کر کورنش بجا لاتے۔ کسی کو تھپکی سے نوازا جاتا۔ کسی کو سرزنش جسے سرزنش ہوتی اُسے بلطفِ کمال نیک چلنی کی ضمانت پر رہا کر دیا جاتا۔ رات کو تاش کی میز پر مخصوص صنعت کار بازی ہار کر نذرانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے۔ رات گئے تک ہنسی کھیل میں امورِ سلطنت پر ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو ہوتی رہتی۔ گپ شپ لگتی۔ مشورے ہوتے۔ فیصلے بھی ہو جاتے۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔

رفتار ملاحظہ ہو۔ ایکٹنگ گورنر جنرل بنے ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ خاطر خواہ اور مثبت نتائج برآمد ہونا شروع ہو گئے۔ محمد علی بوگرا کو مستعفی ہونا پڑا۔ چوہدری محمد علی وزیر اعظم بنے۔ اسکندر مرزا کے بعد یہ دوسرے سول سرونٹ تھے جو سول سروس سے براہِ راست اہم ترین سیاسی منصب پر فائز ہوئے۔ حسین شہید سہروردی کی جگہ فضل الحق کو ملے پر دولہا بنا کر لایا گیا۔ جنرل محمد ایوب خان وزارت سے الگ ہوئے اور واپس جی ایچ کیو چلے گئے۔ چوہدری محمد علی اپنے تدبر اور خلوصِ نیت کی وجہ سے دستور مرتب کرنے میں کامیاب ہوئے اور انہی کی بھرپور حمایت سے اسکندر مرزا مارچ ۱۹۵۶ء میں صدر منتخب ہوئے تھے۔ صدر بنے ابھی ایک ماہ ہُوا تھا کہ نیا شوشہ چھوڑا۔ دبستانِ سیاست میں ریپبلکن پارٹی کا شگوفہ نمودار ہوا جس کا سربراہ اپنے معتمد خاص ڈاکٹر خان صاحب کو بنایا گیا۔ ریپبلکن پارٹی کے قیام کے ساتھ ہی سیاسی وفاداریوں کا جمعہ بازار لگا اور عزت مآب اراکین اسمبلی ٹکے سیر بکنے شروع

ہو گئے۔ چوہدری محمد علی مسلم لیگ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو سکے تو مسلم لیگ نے اُنھیں چھوڑ دیا اور وہ مستعفی ہو گئے۔ حسین شہید سہروردی کو آگے لاکر دوسری کولیشن وزارت بنائی گئی۔ اُن سے ون یونٹ بنوایا مگر اُنھیں بھی ایک سال سے زیادہ نہ دیا گیا۔ قائدِ اعظم کے دیرینہ ساتھی خاموش طبع اسماعیل ابراہیم چندریگر تشریف لائے جو بمشکل دو ماہ گزار سکے۔ پھر ملک فیروز خان نون کی باری تھی۔ اُنھیں صرف دس ماہ میّسر آئے۔ یوں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پہلے صدر میجر جنرل اسکندر مرزا نے اپنے تین برسوں میں پانچ وزرائے اعظم خرچ کر ڈالے۔ ان پانچوں حضرات میں سے ہر ایک سیاست، صداقت، شرافت، امانت کے اعتبار سے اسکندر مرزا پر پانچ گنا بھاری تھا۔

اپنی صدارت کی اِس قلیل مُدت میں اسکندر مرزا نے سیاست اور سیاستدانوں کی دل بھر کر مٹی پلید کی، قوم کو مارشل لاء کی بھٹی میں جھونک دیا اور آخر میں ملک ہی کو داؤ پر لگانے سے گریز نہ کیا مگر۔ ۔ ۔ مگر وہ خوش قسمت تھا کہ اُس کا تعلق صوبہ پنجاب سے نہیں تھا ورنہ ہمارے تاریخ نویس اور تجزیہ نگار سکندر مرزا سے یوں صرفِ نظر نہ کرتے۔

پنجاب میں پیدا ہونے والا غلام محمد اکثر کہا کرتا تھا کہ میرا مرنا جینا پاکستان کے ساتھ ہے۔ اُس کے الفاظ یہ تھے۔

Who lives if Pakistan dies who dies if Pakistan lives.

اُس کے یہ الفاظ اِس کی طبع شدہ تقریروں اور اخبارات کے صفحات پر کئی جگہ ملیں گے۔ اِس کے برعکس اسکندر مرزا کے ساتھ کام کرتے ہوئے اُس کے قریب سے کبھی حب الوطنی کی روح پرور خوشبو نہ آئی۔ اپنے وطن سے لگاؤ کا اظہار اگر کبھی ہوا بھی تو بڑے بھونڈے طریقہ سے اور ایمان و خلوص سے عاری انداز میں۔ ایک دفعہ وکلاء کے اجتماع میں صدارتی خطبہ دینا تھا۔ قدرت اللہ شہاب نے تقریر لکھ دی جس میں سکندر مرزا نے بزعمِ خود گرانقدر اضافہ کیا

جو مجھے کبھی نہیں بھولا اور اکثر سوچتا ہوں کہ وہ کہنا کیا چاہتے تھے۔ تقریر کے آخر پر فرمایا خواتین و حضرات ایک بات ہمیشہ ذہن میں رکھیں اور وہ ہے۔

My country, Right or wrong

میں اسے ٹائپ کرنے لگا تو رُک گیا کہ جناب صاحب سے مطلب پوچھ لوں۔ وہ جا چکے تھے اور تقریر کا وقت قریب تھا۔ اس لیے تقریر ٹائپ کر کے دیدی۔ سوچتا رہا کہ ہم کس بات میں غلطی پر ہیں۔ کشمیر کے سوال پر؟ عربوں اور فلسطینیوں کی حمایت کے بارے میں؟ بھارت یا افغانستان کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں؟ ہمارے ملک کی بنیاد ہی سچائی اور عدل و انصاف پر ہے۔ ہمارے قائد نے کبھی ہمیں ایسا درس نہیں دیا۔ ہمارا خدا، ہمارا رسول، ہمارا دین، ہمارے اسلاف کوئی ہمیں یہ نہیں سکھاتا۔ یہ کوئی حب الوطنی نہیں بلکہ قرآن کی اصطلاح میں حمیت الجاہلیہ ہے۔ ایسا سبق تو وہی شخص دے سکتا ہے جس کی زندگی کا فلسفہ ابدی صداقتوں سے آنکھیں بند کر کے وقتی خود غرضی اور محض وقتی خود غرضی پر مبنی ہو۔ دراصل یہ سلوگن سکندر مرزا کی پوری زندگی کا لب لباب تھا۔

سکندر مرزا کے لیے یہ خطہ امریکی مفادات کے لیے بڑا سازگار تھا۔ ہماری وزارتِ خارجہ کے کرتا دھرتا دو بھائی تھے جو امریکیوں سے زیادہ امریکی تھے۔ جناب سکندر علی بیگ اور جناب مرزا عثمان علی بیگ جو یکے بعد دیگرے وزارت خارجہ کے سیکرٹری بنے۔ ایران میں شہنشاہ آریہ مہر رضا شاہ پہلوی ایک ذہین و زیرک حکمران تھا۔ ۱۹۵۲ء میں اُسے ڈاکٹر محمد مصدق کے ہاتھوں شدید جھٹکا آیا اور شاہ صاحب ملک سے فرار ہو گئے مگر امریکی سی آئی اے نے فضل اللہ زاہدی کے ذریعے تخت و تاج بحال کروا دیا۔ اس کے بعد ایران میں جدید امریکی اسلحہ کے انبار لگ گئے اور سارے علاقے میں ایران اور پاکستان امریکہ کے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد حلیف سمجھے جانے لگے۔

۱۹۵۷ء میں امریکہ سے ایک فوجی مشن آیا۔ سکندر مرزا نتھیا گلی میں مقیم تھے۔

مشن کو وہیں بلا بھیجا۔ اُن کے ساتھ جی ایچ کیو سے کچھ سینئر افسر بھی کا غذات لیکر تتھیا گلی آ گئے۔ مشن کی موجودگی میں سکندر مرزا نے حکم دیا کہ جی ایچ کیو کے فلاں فلاں کا غذات کی کاپیاں لفافے میں بند کر کے اُنھیں دی جائیں۔ واپس آ کر میں نے کاپیاں بنانی شروع کیں تو جی ایچ کیو سے آئے ہوئے جنرل پیرزادہ جو اُن دنوں بریگیڈئر تھے کھسک کر میرے پاس آئے اور رازداری سے ایک خاص صفحہ کی کاپی کو شامل نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ دیکھا تو وُہ صفحہ انتہائی اہم راز کا حامل تھا۔ چنانچہ میں نے بغیر اُس کاغذ کی کاپی کے لفافہ بند کر کے مشن کے لیڈر کو دے دیا اور یوں وُہ انتہائی اہم فوجی نوعیت کا راز امریکی دست برد سے محفوظ رہا۔ امریکی سفیر، اس کی اہلیہ اور فیملی بغیر کسی پیشگی پروگرام کے جب چاہتے ایوان صدر میں تشریف لا سکتے تھے۔ دُوسرے ملکوں کے سفیروں کی طرح اُنھیں وزارتِ خارجہ سے رابطہ قائم کرنے کی حاجت نہ ہوتی تھی۔ امریکی سفیر کبیر کی دختر نیک اختر کی کیپٹن سعید سے دوستی اور پھر شادی خانہ آبادی اسی آمد و رفت کا نتیجہ تھی۔

سیاست دانوں کو ہضم کرنے کے بعد سات اکتوبر ۱۹۵۸ء کے بعد جب جرنیلوں سے واسطہ پڑا تو اُس کے سب اندازے غلط ثابت ہوئے اور معلوم ہوا کہ اِس گوشت کا گلنا بہت مشکل ہے اور اِس کے گلتے گلتے اُس کے اپنے گل سڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ دو ہفتوں ہی میں جرنیلوں کے مقابلے میں پسپائی کے آثار نمودار ہو گئے۔ جرنیل حضرات بھی بھانپ گئے تھے کہ وُہ سکندر مرزا کی ہٹ لسٹ پر چڑھ گئے ہیں۔ یہ انکشاف ہوا کہ جنرل ایوب خان کے مشرقی پاکستان کے دورے کے دوران سکندر مرزا نے فوج کے انتظامات کو خفیہ طور پر معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ سکندر مرزا بہت عجلت میں تھا۔ اُس کے پاس منصوبہ بندی کے لیے وقت ہاتھ سے نکلتا جا رہا تھا۔ اسی گھبراہٹ کے عالم میں پاکستان ائیر فورس ماڑی پور ائیر بیس کے کمانڈر ائیر کموڈور عبدالرب کو اپنی اور ملک سے

وفاداری کا واسطہ دے کر حکم دے دیا کہ جنرل محمد ایوب خان، جائنٹ چیفس کمیٹی سیکرٹریٹ کے میجر جنرل شیر بہادر اور کراچی کے کمانڈر یحییٰ خان کو ماڑی پور کے ہوائی اڈے پر پہنچتے ہی گرفتار کر لیا جائے۔ یہ حکم زبانی تھا اور صرف ٹیلیفون پر دیا گیا تھا جسے کموڈور عبدالرب ٹال گیا اور یوں سکندر مرزا کا نشانہ خطا گیا۔ وہ تاش کا اچھا کھلاڑی تھا سپورٹس مین سپرٹ رکھتا تھا۔ کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی سبکدوشی کے کاغذ پر بلا تامل دستخط ثبت کر دیئے۔ ملک بدر ہوئے۔ دیارِ فرنگ میں وفات پائی۔ کشورِ غیر میں دفن ہوئے۔ تہران میں شاہی قبرستان جو آرام گاہِ رضا شاہ کبیر کے نام سے موسوم تھا اور جہاں شاہی اعزازات کے ساتھ سکندر مرزا کے جسدِ خاکی کو شہنشاہ نے دفن کروایا تھا ملیامیٹ ہو چکا ہے۔ سکندر مرزا کی قبر بھی ملیامیٹ ہو گئی۔

حذر اے چیرہ دستاں
سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

خاتونِ اوّل ناہید خانم

اکتوبر ۵۸ء جب مسلم لیگ کے صدر خان عبدالقیوم خان کا دس میل لمبا جلوس نکالا گیا تو مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ نواب مظفر علی خان قزلباش اور وزیر اعظم ملک فیروز خان نون بہت گھبرائے، سکندر مرزا نے ٹیلیفون پر دونوں کو تسلی دی اور کہا کہ قیوم سے میں خود نپٹ لوں گا۔ میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں وہ شیر کی کھال میں گیدڑ ہے۔ قیوم خان کراچی آنے والے تھے جہاں اُن کے استقبال کی زبردست تیاریوں کی خبریں سکندر مرزا کو برابر پہنچ رہی تھیں۔ سکندر مرزا کا پروگرام تھا کہ وہ قیوم خان کو کراچی سے پہلے جنگشاہی کے ریلوے اسٹیشن پر اتروالے گا گو قیوم خان سکندر مرزا کے ہتھے نہ چڑھ سکے تاہم سکندر مرزا اپنی سوچی سمجھی سکیم کے تحت سیاسی دفاداریوں کا جمعہ بازار سجا کر اور سیاست دانوں کی ساکھ کو خاک میں ملانے کی دُھن میں ملکی وقار کو شدید نقصان پہنچا چکا تھا۔ ملک کو مارشل لاء کی بھٹی میں جھونکا اور چلتے چلتے ملک کی سلامتی کو بھی داؤ پر لگانے سے دریغ نہ کیا۔ وہ تو رب العالمین کا کرم ہُوا کہ کموڈور عبدالرب نے سکندر مرزا کے آخری حکم کو جو اُسے ٹیلیفون پر دیا گیا تھا ایوانِ صدر میں آنے کے بہانے سے ٹال گیا ورنہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ حالات کیا پلٹا کھاتے۔ خانہ جنگی اور خون خرابہ یقینی تھا۔ انجام کی سکندر مرزا کو پروا نہیں تھی۔ بھارت کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ بلی کے بھاگوں چھکا ٹوٹتا۔

سکندر مرزا کو پیٹھ پیچھے وار کرنے ہی کی تربیت تھی۔ انڈین پولیٹیکل سروس میں اُسے اخلاقیات کے اسباق تو یاد نہیں کرائے گئے تھے۔ وہ بہادر نہیں تھا کہ اُس کے ساتھ بہادر دل جیسا سلوک کیا جاتا۔ وہ پارسا بھی نہیں تھا

کہ اُس پر ترس کھاتے ہوئے "جا چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر" کہہ کر چھوڑ دیتے۔ اُس نے مُلک اور قوم کے خلاف گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ وُہ قرارِ واقعی اور عبرت ناک سزا کا پورا مستحق تھا مگر جنرل ایوب خان ایک بہادر قوم کا سپہ سالار تھا۔ وُہ سکندر مرزا کی پست سطح تک نہ اُتر سکا۔ اُس نے سکندر مرزا کی مرضی اور خواہش کے مطابق ایک خصوصی طیارے کے ذریعے سارے ساز و سامان اور پوری عزت و احترام کے ساتھ لندن پہنچا دیا جہاں انڈین پولیٹیکل سروس میں اس کے ساتھ تربیت پانے والے اور پرانے دوست کیپٹن فرینکلن فرینڈ اپنے دوست کے استقبال کے لیے ائیر پورٹ پر موجود تھے۔ سکندر مرزا خوش قسمت تھا کہ اُسے حریف بھی ملا تو شریف۔

مارشل لاء نافذ کرنے اور اس کے فوراً بعد جنرل ایوب خان اور اُن کے ساتھی جرنیلوں کو نظر سے ہٹانے کی کوشش کے پس پردہ سکندر مرزا کے کیا عزائم تھے اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سکندر مرزا کے مذموم ارادوں کی تفصیل اُس کے ساتھ تہران کے شاہی قبرستان میں دفن ہو چکی ہے۔ اس کے سب سے بڑے معتمد اور سیاسی مشیر ڈاکٹر خان صاحب تھے جو مئی ۱۹۵۸ء کی صبح کو ایک پٹواری کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو میں ابھی سیاسی پختگی نہیں آئی تھی۔ "برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن" تھا۔ طالع آزما ضرور تھے اور مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا، تاہم اُن کے لیے ایک جنرل (ایوب خان) اور دُوسرے میجر جنرل (سکندر مرزا) میں سے ایک کا انتخاب دشوار بھی نہ تھا۔ دوسرے لوگ جن کے ساتھ سکندر مرزا کے راہ و رسم تھے اُن میں راجہ صاحب محمود آباد، مرزا احمد حسن اصفہانی اور جمال میاں فرنگی محلی تھے۔ اُنھیں ملکی حالات سے یقیناً دلچسپی تھی مگر اُن سے کسی غلط مشورے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ صنعت کاروں میں سیٹھ احمد داؤد، امیر علی ایچ فیضی، اے کے سومار، ایم اے رنگون والا، میاں سعید سہگل اور عبدالواحد آدم جی تھے۔ سفارتی سطح پر امریکی سفیر کا تو خیر گھر کے افراد میں شمار ہوتا تھا۔ کینیڈا کے میجر جنرل

کا بھورن کے ساتھ گاڑھی چھنتی تھی۔ ان کے علاوہ ایران کے سفیرِ کبیر میجر جنرل تماں قلیچ اور اُن کی اہلیہ بلا تکلف تشریف لاتے۔ حالات جس تیزی سے رونما ہو رہے تھے وُہ ہر آنے جانے والے کے ساتھ موضوعِ سخن ضرور بنتے ہوں گے۔ گفتگو کے دوران اظہارِ خیال میں چھپا ہُوا مشورہ پیش کرنا انسانی سرشت ہے۔

۱۹۶۰ء میں ایوب خان کو لائف پریذیڈنٹ یا بادشاہ بننے کا مشورہ دینے والے بزرگ ۱۹۵۸ء میں بھی اللہ کے فضل و کرم سے زندہ سلامت تھے۔ حاضری لگوانے اور نمبر بنانے کا شوق اور فنِ قدرت کی طرف سے ودیعت تھا۔ اِن بزرگ کو ۱۹۵۲ء میں غلام محمد کو جوتیاں پہناتے اور پہنا کر اپنے ہاتھوں کو چومتے اور چوم کر جھومتے کا راقم عینی شاہد ہے۔ یہ مردم شناس ہی نہیں موقع شناس بھی تھے، کیسے ممکن ہے اُن سے چوک ہو گئی ہو۔ ان صاحب کو یا اس قماش کے دُوسرے صاحبان کو سانپ تو نہیں سونگھ گیا ہو گا کہ وُہ گھر میں چُپ سادھے آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھے رہے ہوں۔ اقتدار سے وفاداری یا "انسانیت" بھی تو کوئی چیز ہے۔ غلام محمد پنجاب سے تھا۔ سکندر مرزا پنجابی نہیں تھا اس لیے اُس کا حق زیادہ بنتا تھا۔ سکندر مرزا نے جمہوری اور سیاسی اداروں کو ایک ایک کر کے تباہ کرنے کے بعد مارشل لا نافذ کر کے دیکھ لیا تھا۔ بات نہ بن سکی تھی۔ اِدھر اُدھر ہمسایوں پر نظر دوڑائی افغانستان زمانہ قدیم سے بادشاہوں کے زیرِ سایہ چلا آ رہا تھا۔ سکندر مرزا کے اپنے سسرال میں مستحکم بادشاہت قائم تھی۔ اس کے برعکس پاکستان کے غریب صدر کا یہ حال کہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ "راتیں رتی نیند نہ آوے دن وی بہت حیرانی ہو۔" دو سال پہلے پاکستان افغانستان اور ایران کے درمیان کنفیڈریشن کی بات چلی تھی۔ مذاکرات کے موقع پر دو بادشاہوں کے درمیان خود کو ہلکا محسوس کیا ہو گا۔ بھلا کہاں مطلق العنان اور خود مختار بادشاہ اور کہاں صرف دو چار سال کے لیے صدر۔ ہر وقت کا دھڑکا۔ ہر گزرنے والا دن یاد کرائے۔ " اگا نیڑے آ گیا، پچھا رہ گیا دُور" گیا گزرا ہی سہی سکندر مرزا مغل

تو تھا۔ بادشاہوں کی بیشتر خوبیاں کثیر تعداد اور وافر مقدار میں موجود تھیں۔ ظلِ الٰہی کہلوانے کے لیے کسی اچھی نسل کی یعنی ایران نژاد نجیب الطرفین زوجہ کی ضرورت ہوتی ہے جسے مناسب لقب کے ساتھ ملکہ عالیہ بنایا جا سکے اور جو دن بھر کے تھکے ہارے جہاں پناہ کو اپنی پناہ میں لے لے۔ سو ایسی بی بی بھی بفضلِ تعالیٰ دستیاب تھی۔ خوش پوش و خوش ذوق، خوش گفتار و خوش رفتار، ذہانت و فطانت کا شاہکار کہ مملکتِ خداداد پاکستان کے ابھرتے ہوئے تارے کی پیشانی دیکھ کر کشورِ ایران کے معمولی سفارت کار پر ترجیح دی۔ ملکہ نور جہاں ثانی بننے کا حسین خواب محوِ خواب بھی تھا۔

ناہید خانم کا پاکستان میں ورودِ مسعود کچھ ہی سال پہلے ایک ایرانی سفارت کار کی اہلیہ کی حیثیت سے ہوا تھا۔ سرکاری اور سفارتی تقریبات کے علاوہ نجی محفلوں میں سکندر مرزا سے آمنا سامنا ہوا۔ مراسم بڑھے اور بڑھتے چلے گئے۔ کہتے ہیں "عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود"۔ نتیجتاً ناہید خانم نے اپنے ایرانی شوہر سے طلاق حاصل کر لی اور سکندر مرزا کے حرم میں داخل ہو گئیں۔ سکندر مرزا کی پہلی بیگم سے ایک لڑکا ہمایوں مرزا اور دو لڑکیاں تھیں۔ ناہید خانم کی پہلے شوہر سے ایک لڑکی تھی جو کبھی کبھی اپنی مادرِ مہربان سے ملنے آیا کرتی تھی اور ہفتہ دو ہفتہ ایوانِ صدر میں مہمان رہتی۔ ناہید خانم کے ساتھ شادی کے بعد ہی سکندر مرزا کے دورِ عروج کا آغاز ہوا۔ یہی بات ناہید خانم کے لیے باعثِ فخر و افتخار تھی جس کا اظہار بھی گاہے بگاہے کرتی۔ شوہر کو بھی اعتراف تھا کہ "اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست"۔

شروع شروع میں ناہید خانم دوسری ایرانی خواتین کی طرح مغربی لباس زیبِ تن فرماتیں۔ پاکستان کی خاتونِ اوّل کا مرتبہ حاصل کیا تو سرکاری تقاریب میں ساڑھی باندھ کر شرکت فرماتیں تاکہ ننگی ٹانگیں ہدفِ تنقید نہ بن جائیں اور شوہر کیلئے کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔

ایوانِ صدر میں منتقل ہونے کے بعد صدرِ پاکستان شطرنجِ سیاست کی بساط پر اپنی پسند کے مہرے سجانے میں مصروف ہوئے تو خاتونِ اوّل نے گھر کا چارج

سنبھال لیا۔ سب سے پہلے کمروں کی آرائش و زیبائش کی طرف توجہ دی۔ فرنیچر، پردے قالین فانوس تقریباً سبھی کچھ بدل دیا گیا۔ کمروں کو مرتب کرنے کے بعد گارڈن کی باری آئی۔

ایرانی حسین قوم ہے اور ایرانیوں کے اعلیٰ ذوقِ جمال سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ گھر دوکان دفاتر ہر کہیں حسن و سلیقہ نمایاں ہوگا۔ شاید ہمارے اور ایرانیوں ہی کے بارے میں شاعر نے کہا ہو۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

تہران کے اکثر گھروں کے لان میں چھوٹا سا خوشنما حوض اور حوض کے درمیان میں خوبصورت فوارہ موجود ہوتا ہے۔ بہار کے موسم میں جب ہر طرف رنگا رنگ قسم کے پھول کھلے ہوں، فوارے سے اُچھلتا ہوا پانی ماحول کی خوبصورتی کو دوبالا کر دیتا ہے۔ جدید بلڈنگوں اور مارکیٹوں کے اندر بھی تالابوں اور فواروں کا سلسلہ اور چاروں طرف لہلہاتے ان ڈور پودے عجیب بہار دیتے ہیں۔ ممکن ہے یہ ایرانی ثقافت ہی کا اثر ہو کہ مغل بادشاہوں کی تاریخی عمارتوں میں ہم نہریں فوارے اور آبشاریں دیکھتے ہیں۔ ناہید خانم نے لان کے اُس حصے میں جو اُس کی خواب گاہ سے قریب تر تھا، ایک خوبصورت سوئمنگ پول بنوایا جو اُس وقت کراچی میں اپنی نوعیت کا واحد سوئمنگ پول تھا اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے ناہید خانم غیر ملکی اور پاکستانی خواتین و حضرات کو مدعو کرتیں۔ امریکی سفیر کی دختر اور سکندر مرزا کے اے ڈی سی کیپٹن سعید کی دوستی اسی پول پر پروان چڑھی۔

گارڈن کی طرف رُخ کیا۔ وائسرائے ہاؤس دہلی سے آئے ہوئے سال خوردہ اور تن آسان گارڈن سپرنٹنڈنٹ امام الدین کو رخصت کر دیا۔ اُس کی جگہ پشاور کے گورنمنٹ ہاؤس کے ہیڈ مالی حاجی عبدالغنی کو تبدیل کر کے ایوانِ صدر کا نیا گارڈن سپرنٹنڈنٹ بنایا۔ حاجی صاحب کورے اَن پڑھ تھے بس کسی طرح ٹیڑھا میڑھا عبدالغنی لکھنا سیکھ رکھا تھا مگر فنِ باغبانی میں یگانہ روزگار، نہ صرف یہ کہ ہر قسم کے پھولوں کے دیسی اور ولایتی ناموں سے آشنا بلکہ نت نئے تجربات سے خود بھی کئی قسم کے پھولدار پودے تیار کرتے رہتے۔ پرانے عُمر رسیدہ مالیوں کو رخصت کر کے پشاور سے محنت کش اور جوان سال مالیوں کی

کھیپ درآمد کی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایوانِ صدر کا نقشہ بدل دیا۔ پاکستانی اور غیر ملکی سفیروں کی بیگمات خاص طور پر گارڈن دیکھنے کی خاطر تشریف لاتیں اور ناہید خانم اُن کے انتخاب پر اور حاجی عبدالغنی کو اُن کی محنت اور ہُنر پر دل کھول کر داد دیتیں۔ حاجی صاحب نے سبزیوں کی کاشت کے لیے الگ ایک دور افتادہ کونے میں بندوبست کیا اور موسم کی ہر سبزی وافر مقدار میں مہیا کرتے جس سے اسٹاف اور عملہ بھی مستفید ہونے لگا۔

ناہید خانم نے ایک ہی برس میں ایوانِ صدر کی کایا پلٹ دی۔ کچن میں جدید آلات نصب کروائے۔ باورچیوں کو مختلف اقسام کے کھانے بنانے کی ترکیبیں سکھائیں۔ ایرانی کھانے خود بنائیں۔ ایرانی ناشتہ میں عموماً تندوری روٹی، پنیر اور بغیر دُودھ کے چائے پیتے ہیں۔ ناہید خانم رات کو ایمپریس مارکیٹ سے پشاوری خمیری روٹی منگوا لیتیں۔ صبح کو میاں بیوی پنیر اور چائے یا کافی کے ساتھ ناشتہ کرتے۔ ان کی دیکھا دیکھی اونچے طبقہ کی پاکستانی خواتین بھی اپنے گھر میں باورچی خانے میں دلچسپی لینے لگیں۔ ناہید خانم بہت جلد رخصت ہو گئیں ورنہ ہمارے ہاں اُونچے گھرانوں کی خواتین کی مصروفیات میں توازن پیدا ہو جاتا۔

ناہید خانم نے شوہر پر کئی قدغن لگا رکھے تھے۔ مثال کے طور پر شام کے وقت صرف دو پیگ وہسکی چڑھا سکتے تھے۔ تیسرے پیگ کی اجازت نہیں تھی۔ طلب کرنے پر انکار ہو جاتا۔ البتہ شوہر سے سگریٹ نہ چھڑوا سکیں اور سکندر مرزا سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے رہے۔ وہ سگریٹ کو گفتگو کے دوران بھی ہونٹوں سے جُدا نہ کرتے حتیٰ کہ راکھ جھاڑنے کی زحمت بھی گوارا نہ تھی۔ گفتگو کرتے ہوئے سگریٹ تھرکتی تو راکھ کو خود بخود گرنا اور بکھرنا پڑتا تھا۔

ناہید خانم کا ذوقِ لطیف بھدی اور "کوجی" چیزوں کو برداشت کرنے کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ چیل گدھ اور کوے تینوں سے شدید نفرت تھی۔ مالیوں کو حُکم تھا کہ اس نسل کے پرندوں کو کسی دیوار یا درخت پر نہ بیٹھنے دیں۔ وہ سارا دن پرندے اُڑاتے رہتے۔ چیل اور گدھ تو شرافت سے مان گئے اور ایوانِ صدر کو بخش دیا مگر کوا بڑا ڈھیٹ اور خود سر پرندہ ہے وہ نہ مانا۔ ایک درخت سے اُڑایا تو دوسرے پر۔ وہاں سے ڈرایا تو تیسرے پر یا ایک

چکر کاٹ کر پہلے والے درخت کی کسی شاخ پر اُنھیں زیادہ پریشان کیا جاتا تو آسمان سر پر اُٹھا لیتے۔ "کاں کاں کاں میں کیڑی تھاں جاں"! حاجی عبدالغنی نے بتایا کہ کوّے بندوق سے بڑا ڈرتے ہیں اور ختم بھی کیے جا سکتے ہیں۔ آخر کالے کالے کوؤں سے فائدہ بھی کیا ہے۔ تجویز بھی معقول تھی، مان لی گئی۔ پریذیڈنٹ کو تینوں سروسز سے ایک ایک اے ڈی سی ملتا ہے۔ ان تین کے علاوہ ایک اے ڈی سی نچلے درجے کا یعنی جونیئر کمشنر رینک کا بھی ہوتا تھا جسے عملے کے لوگ اُردو اے ڈی سی کہتے تھے اُن دنوں اُردو اے ڈی سی رسالدار میجر اصغر علی تھے۔ اُن کا تعلق صدر کی باڈی گارڈ رجمنٹ سے تھا اور وُہ پولو کے نامور کھلاڑی تھے۔ سکندر مرزا نے اسے پولو کی کوچنگ کے لیے ایران اور ترکی بھی بھیجا تھا۔ واپسی پر اُن کی کوئی خاص ڈیوٹی نہیں لگی تھی کسی نہ کسی کام پر لگا دیا جاتا۔ اُن دنوں وُہ خالی تھے لہٰذا کوّے مارنے پر لگا دیا گیا۔ رسالدار صاحب ذات کے رنگھڑ تھے اس لیے قدرے غصیلے۔ شروع تو ہو گئے مگر اُنھیں اندازہ نہیں تھا کہ کوّا اتنا کائیاں بھی ہو سکتا ہے۔ پہلے ہی گولی چلنے پر وُہ ہنگامہ برپا ہوا کہ اللہ کی پناہ۔ پوری کراچی کے کوّے جمع ہو گئے۔ جتنی دیر میں رسالدار صاحب بندوق کو دوبارہ لوڈ کرتے دو چار کوّے نیچی پرواز کر کے اُن کی گنجی ٹنڈ میں سوراخ کر جاتے۔ بیگم صاحبہ نے اُوپر برآمدے سے دیکھا تو رسالدار پر ترس کھاتے ہوئے سیز فائر کرا دی۔ تاہم کوؤں نے رسالدار صاحب کو معاف نہ کیا وُہ ہاتھ میں چھڑی اور سر پر ٹوپی پہنے بغیر گھر سے باہر نہ نکلتے۔ اُن کے اور حاجی صاحب کے تعلقات ہمیشہ کے لیے خراب ہو گئے۔

ناہید خانم میں نظم و ضبط بدرجہ کمال تھا۔ کھانوں کی تعداد مقدار اور اقدار، نوکروں کی یونیفارم، سروس کے آداب، میز کی ترتیب و تزئین غرضیکہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر خود نگاہ رکھتیں۔ ناہید خانم کو اگر مہلت ملتی تو وُہ یقیناً نورجہاں ثانی کہلانے کی مستحق تھیں۔ اُن کے خوابوں کی تصویر تو یہی تھی تعبیر غلط نکلی، ان میں اور نورجہاں اوّل میں بیشتر خوبیاں ایک جیسی تھیں۔ دونوں ایرانی نژاد۔ دونوں سرو قد۔ دونوں شاعرہ۔ ناہید خانم کے شاعرہ ہونے کا انکشاف راقم کو ایران میں قیام کے دوران ہوا۔ تہران کے انگریزی روزنامہ کیہان انٹرنیشنل میں ایک انگریز صحافی نے لکھا تھا کہ لندن کے ایک خوبصورت

فلیٹ میں پاکستان کی سابق خاتونِ اوّل اپنے مہمانوں کا استقبال اچھے کھانوں اور اپنے تازہ اشعار سے کرتی ہیں۔

مہرالنساء (نورجہان اوّل) اور ناہید خانم (نورجہان ثانی) دونوں ایک جیسے حادثہ سے دوچار ہوئیں۔ مہرالنساء کے مرزا سلیم اور ناہید خانم کے مرزا سکندر دونوں اپنی بیگمات کو داغِ مفارقت دے گئے۔ خود تو جنت مکانی اور خلدِ آشیانی کہلائے مگر ملکہ عالیہ کو دارِ فانی میں سوگوار چھوڑ گئے۔ اہم ترین قدرِ مشترک یہ تھی کہ دونوں نورجہانیں اپنے جہاں پناہوں کو امورِ سلطنت کی انجام دہی میں مشورے دیا کرتی تھیں۔ نورجہاں اوّل کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں کئی واقعات درج ہیں اور جہانگیر کا یہ تاریخی مصرع تاریخ میں محفوظ ہے۔

تو اگر کشتہ نشدی آہ چہ می کردم من

البتہ نورجہانِ ثانی کے بارے میں مصدقہ روایات کی کمی ہے اس کی وجہ اُن کا تاج ہے جو سب کچھ بن گیا مگر شاعرہ نہ بن سکا نہ ہی اپنے نام سے کوئی تزک لکھی یا لکھوائی۔ شاید وقت کی قلت کے باعث البتہ راقم گواہ ہے کہ سات اکتوبر اور ستائیس اکتوبر کے دوران شب و روز ملکہ عالیہ کے مزاج کی تلخی دیدنی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے اس فیصلہ پر ناخوش تھیں کہ جنرل ایوب خاں کو سپریم کمانڈر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا کر اپنے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے۔ ایوب خاں کو ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور خود صدر پاکستان کے علاوہ سپریم کمانڈر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہونا چاہیئے تھا۔ اب نئے حالات میں صدر کی حیثیت ثانوی رہ گئی تھی جو ملکہ کے لیے ناقابلِ قبول تھی کیونکہ بقول شاعر مشرق "چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا"۔ صدرِ پاکستان اور خاتونِ اول کے درمیان تند و تیز تکرار سے قصرِ صدارت پر لرزا طاری ہو جاتا تھا۔ ناہید خانم کا خیال درست تھا کہ سکندر مرزا صدر، سپریم کمانڈر اور سی ایم ایل اے ہوتے تو اگلا مرحلہ یعنی رسمِ تاجپوشی نہایت آسانی سے ادا ہو سکتی تھی۔

ستائیس اور اٹھائیس اکتوبر کی رات کو رونما ہونے والے انقلاب کے ایک اہم کردار لیفٹیننٹ جنرل خالد محمود شیخ کا بیان ہے کہ جب انھوں نے جنرل اعظم اور جنرل برکی کے ہمراہ سکندر مرزا سے اپنی سبکدوشی کے کاغذ پر دستخط لیے تو بیگم ناہید مرزا موجود نہ تھیں ورنہ تلخ کلامی کا قوی امکان تھا۔

بسمان محل عمان کی دعوت میں (بائیں سے دائیں) شاہ حسین، شہزادی منیٰ الحسین، صدر ایوب، بیگم نسیم اورنگ زیب، ولی عہد اُردن شہزادہ محمد اور ان کی اہلیہ شہزادی فریال

تیسرا حصّہ

فیلڈ مارشل محمدؐ ایوبؒ خان

اکتوبر ۱۹۵۸ء ——— مارچ ۱۹۶۹ء

ایوب خان کا اقتدار سے گریز

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ایوب خاں پاکستان کو جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور جمہوری عمل کی بدولت معرضِ وجود میں آیا تھا مارشل لاء کے آمرانہ نظام سے روشناس کرا کے نہ ختم ہونے والے کربناک ابتلا میں مبتلا کر دیا۔ مگر فیلڈ مارشل صاحب اپنی خود نوشت سوانح حیات میں کچھ اور کہانی سناتے ہیں۔ تاحال کسی اہلِ قلم نے اس سلسلے میں غیر جانبدارای سے تجزیہ نہیں کیا کہ اس گھناؤنے جرم کا مرتکب ایوب خاں تھا یا سکندر مرزا۔ دراصل ہم اپنے مزاج اور مرضی کے مطابق یا کسی اور وجہ سے پہلے سے یہ طے کر لیتے ہیں کہ کس کو بُرا کہنا ہے اور کس کو اچھا۔ کس کی خوبیوں کو نظر انداز کرنا ہے اور کس کی بُرائیوں کو اچھالنا ہے۔ یا کسی کی بُرائیوں پر پردہ پوشی کر کے اُس میں خوبیاں تلاش کرنی ہیں۔ ہماری پہلی رائے آخری رائے ہوتی ہے یہ ہمارا قومی مزاج بن چکا ہے۔

ایوب خاں کی بیان کردہ داستان کچھ اس طرح ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں قائدِ ملت لیاقت علی خاں ایک جنونی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ اس سانحہ کے کچھ دنوں بعد ایوب خاں کسی کانفرنس میں شرکت کرنے لندن تشریف لے گئے۔ وہاں قیام کے دوران سر آغا خان نے خط کے ذریعے ایوب خاں کو فرانس آنے اور اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ کانفرنس کے اختتام پر ایوب خان نیس میں سر آغا خاں کے مہمان رہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری۔۔۔ آزادی کی جدوجہد میں سر آغا خاں کا بہت حصہ تھا اور وہ پاکستان کے حالات سے دل برداشتہ رہنے لگے تھے۔ انہوں نے ایوب خاں کو اسی غرض سے اپنے ہاں بلایا تھا۔ دورانِ گفتگو میں انہوں نے ایوب خاں سے کہا: "پاکستان میرے خوابوں کی تعبیر ہے، اسے بڑی قربانیوں سے حاصل کیا گیا ہے

اب اسے کھو نہ دینا۔ تم لوگوں نے اگر پاکستان میں مغربی پارلیمانی نظامِ حکومت جاری رکھا تو مجھے خدشہ ہے کہ تم اسے کھو بیٹھو گے۔ میں نے اسی لیے تمہیں یہاں بلایا ہے کہ یہ بتا دوں ملک کو تم اور صرف تم تباہی سے بچا سکتے ہو!"

(فرینڈز ناٹ ماسٹرز صفحہ ۱۹۳)

اُس وقت ایوب خاں کو بری فوج کا کمانڈر انچیف بنے صرف چند مہینے ہوئے تھے اور اُن کی ساری توجہ بری فوج کی تنظیم و ترقی کی طرف مبذول ہو گی۔ ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ اپنے ملک میں نظامِ حکومت کی تشکیل میں کوئی داخل ہو سکتا تھا۔ تاہم سر آغا خاں کی نظروں میں صرف اور صرف ایوب خاں ہی نظامِ حکومت کو تبدیل کرنے کے اہل تھے اور انھوں نے یہ بات دل میں نہیں رکھی بلکہ ایوب خاں کے گوش گزار بھی کر دی جس میں "کچھ" کرنے کا اشارہ بھی مضمر تھا۔ سر آغا خاں کی نصیحت یا پیش گوئی نے ایوب خاں کے دل و دماغ پر کیا اثرات چھوڑے سوانح خاموش ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایوب خاں کے دل کے کسی نہاں خانہ میں اقتدار کی خواہش کا بیج بو یا گیا ہوگا۔ آگے چل کر ایوب خاں لکھتے ہیں تین برس بعد اکتوبر ۱۹۵۴ء کے شروع میں امریکہ سے واپسی پر لندن کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے اور پاکستان کے حالات پر گہری تشویش کے باعث انھیں نیند نہیں آ رہی تھی اٹھے اور پاکستان میں سیاسی افراتفری کے اسباب اور ممکنہ حل پر ایک مدلّل اور مربوط مقالہ تحریر کر کے دم لیا۔ مقالہ میں پاکستان کے موجودہ مسائل اُن کا حل اور مستقبل کا مکمل خاکہ پیش کیا۔ اس وقت غلام محمدؐ سے اقتدار کی پیش کش والی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بری فوج کے کمانڈر انچیف کے حوالے سے ان کے فرائض ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت اور خارجی جارحیت کے خلاف دفاع تک محدود تھے تاہم ملک کے اندرونی حالات کا ملکی استحکام اور دفاع کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اس لحاظ سے ایوب خاں کی تشویش قابلِ فہم تھی۔ علاوہ ازیں ایک محبِ وطن پاکستانی ہوتے ہوئے انھیں ملک کے بارے میں سوچنے کا حق تھا۔ اگرچہ تین سال قبل سر آغا خاں اُن کے ذہن پر ایک انجانا بوجھ ڈال چکے تھے۔ پھر بھی ایوب خاں کی مقالہ والی ایکسر سائز کو سر آغا خاں

کی تحریک سے منسلک سمجھنا ناانصافی ہوگی۔

لندن سے واپس آئے تو غلام محمد سے تاریخی ملاقات ہوئی۔ غلام محمد نے صاف الفاظ میں اُنھیں اقتدار کی پیش کش کر دی، یہی نہیں بلکہ ضروری کاغذات تیار کروا رکھے تھے ایوب خاں کو فقط ان پر دستخط کرنا تھے، اس کے بعد اقتدار کلی اُن کی جھولی میں تھا۔ وُہ لندن سے جو پلان لکھ کر لائے تھے اسے عملی جامہ پہنانے کا نادر موقع ہاتھ آرہا تھا اس کے باوجود ایوب خاں نے اقتدار کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ کیوں؟ وُہ نوّے دن میں آئین مرتب کرنے کی شرط کی وجہ سے کنی کترا گئے؟ کیا وُہ غلام محمد سے دُوسرے لوگوں کی طرح خائف تھے؟ میرے نزدیک یہ دونوں باتیں خارج از مکان ہیں۔ ایوب خاں کے پاس مقالہ کی صورت میں بنا بنایا خاکہ موجود تھا جس کو بنیاد بنا کر دو چار قانونی ماہرین کی مدد سے نوّے دن کے اندر آئین مرتب کر کے دے سکتے تھے، غلام محمد سے خوف وہراس کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ایوب خاں کے قریب رہ کر اور اُنھیں تھوڑا بہت سمجھتے ہوئے میرا قیاس کہتا ہے کہ اُنھوں نے اقتدار پر قبضہ حاصل کرنے کے اس طریقہ کو ناپسند کیا ہوگا اسی لیے غلام محمد کو مشورہ دیا کہ وُہ محمد علی بوگرہ کی زیرِ قیادت نئی وزارت بنائے حالانکہ ایوب خاں بوگرا کے بارے میں کوئی اونچی رائے بھی نہ رکھتے تھے۔ ہاں ایوب خاں نے غلام محمد کی یہ تجویز مان لی کہ وُہ کابینہ میں محمد علی بوگرا کے ماتحت وزیرِ دفاع کے طور پر شمولیت اختیار کر لیں گے کیونکہ یہ وزارت اُن کے دُوسرے فرائض سے منسلک تھی۔ اقتدارِ اعلیٰ کو چھوڑ کر وزارت قبول کر لینا ایوب خاں کی نیک نیتی اور دیانتداری کی دلیل نہیں تو پھر کیا ہے؟

سر آغا خاں اور غلام محمد کی آپس میں پرانی دوستی تھی۔ دونوں میں خط وکتابت رہتی تھی۔ سر آغا خاں پاکستان میں غلام محمد کے اور غلام محمد فرانس میں سر آغا خاں کے مہمان رہا کرتے تھے۔ سر آغا خاں اپنے دل کی بات حتیٰ کہ ذاتی راز بھی غلام محمد سے نہیں چھپاتے تھے۔ مثال کے طور پر سر آغا خاں نے غلام محمد کو یہ بھی بتا رکھا تھا کہ اپنی وفات کے بعد اپنے بڑے لڑکے پرنس علی خاں یا اُن سے چھوٹے پرنس صدرالدین کو اپنا

جانشین بنانے کی بجائے اپنے پوتے پرنس کریم علی خاں کو جانشین بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔
سر آغا خاں کا انتقال غلام محمد کی وفات کے بعد، ۱۹۵۷ء میں ہوا۔ سر آغا خاں نے غلام محمد کو ایوب خاں کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ کہا ہوگا۔ عین ممکن ہے غلام محمد کی پیش کش کے پیچھے سر آغا خاں کا مشورہ کارفرما ہو۔ ایوب خاں نے بوگرا کی وزارت میں شمولیت اختیار کرلی۔ اور غلام محمد کی موجودگی تک وزارت میں رہے۔

بوگرا کے بعد چوہدری محمد علی وزیر اعظم بنے تو ایوب خاں واپس جی ایچ کیو میں چلے گئے۔ وزارتِ دفاع کا قلمدان چوہدری صاحب نے اپنے پاس رکھا۔ ایک سال کے بعد سکندر مرزا کی چیرہ دستیوں کے باعث چوہدری صاحب کی وزارت ڈوبنے لگی تو ایوب خاں جی ایچ کیو کے کچھ معاملات کے سلسلے میں چوہدری صاحب سے ملے تو انہوں نے ایوب خاں سے کہا:

> "میری پارٹی نے مجھے چھوڑ دیا ہے اور حالات سنگین صورت اختیار کر گئے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ٹیک اوور کر لو اور میری جان چھوٹے" (ترجمہ صفحہ ۵۴)

چوہدری صاحب وزیر اعظم اور وزیرِ دفاع تھے اور بڑے محتاط انداز میں ایوب خاں کو "دعوتِ عمل" دے رہے تھے۔ ایوب خاں نے چوہدری صاحب کی دلجوئی کی اور مشورہ دیا کہ صدرِ پاکستان سے مل کر کسی بہتر حل کی تلاش کریں۔ چوہدری صاحب اور جنرل صاحب کے درمیان اس گفتگو کی صداقت شک و شبہ سے بالا ہے کیونکہ ایوب خاں کی خود نوشت سوانح حیات ۱۹۶۷ء میں مارکیٹ میں آچکی تھی۔ جب چوہدری صاحب اللہ کے فضل سے زندہ سلامت تھے اور گفتگو کی تردید کر سکتے تھے۔ چوہدری صاحب ایوب خاں کے خلاف بیان دیتے رہتے تھے مگر اس گفتگو کی انھوں نے کبھی تردید نہ کی۔

سر آغا خاں اور غلام محمد کے بعد یہ تیسری آواز تھی جس سے ایوب خاں کے کان آشنا ہوئے مگر تعجب ہے کہ وہ برابر پہلو تہی کرتے رہے حالانکہ اُن کے ذہن میں ملک کی فلاح و بقا کا ایک مکمل حل بھی موجود تھا جسے اُنھوں نے بوگرا کی وزارت میں شمولیت

کے وقت کابینہ کو پیش بھی کر دیا تھا اور کابینہ نے ون یونٹ کے قیام کا آئیڈیا وہیں سے لیا تھا۔ اس سے ایوب خاں میں اقتدار پر قبضہ سے عدم دلچسپی صاف عیاں ہے۔

ستمبر ۱۹۵۸ء میں حالات ناگفتہ بہ ہو گئے تھے۔ خان آف قلات نے پاکستان سے علیحدہ ہونے کی دھمکی دیدی تھی جس کے پس پردہ ایوب خاں کی اطلاعات کے مطابق اسکندر مرزا کا اپنا ہاتھ تھا۔ ملک خانہ جنگی کے دہانے پر آکھڑا ہوا تھا۔ فوج بھی تنقید کا نشانہ بننے لگی تھی۔ خان عبدالقیوم خاں اور کئی دوسرے سیاستدانوں نے فوج کے افسروں سے خفیہ ملاقاتیں کرنا شروع کر دی تھیں اور فوج میں سے کچھ افسروں کے ذاتی طور پر ملوث ہونے کے امکانات پیدا ہو رہے تھے۔ خود ایوب خاں سے بھی کچھ لوگ کہنے آئے کہ ملک کھلونا بن چکا ہے اور تم خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہو۔ ان اطلاعات کی صداقت میں ایوب خاں نے اپنی سوانح میں ثبوت مہیا نہیں کیے مگر تردید کیلئے بھی ہمارے پاس کچھ نہیں۔ ان سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تو نفس مضمون میں فرق نہیں پڑے گا۔ ایوب خاں کی نیت پر شبہ کرنے کے لیے کوئی حتمی مواد مہیا نہیں ہوتا۔ باقی نیتوں کا اصل حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔

مارشل لاء کے نفاذ کا فیصلہ

ایوب خاں کی سوانح کے مطابق اسکندر مرزا نے اکتوبر ۱۹۵۸ء کی اولین تاریخوں میں انہیں کراچی بلوایا۔ ایوب خاں اکتوبر کی چار تاریخ کو تیز گام کے ذریعے راولپنڈی سے روانہ ہوئے۔ کراچی کینٹ اسٹیشن پر گاڑی سے اتر کر سیدھے ایوان صدر پہنچے اور لان میں بیٹھ کر سکندر مرزا اور ایوب خاں میں بات چیت ہوئی۔ سکندر مرزا نے ملک میں مارشل لا نافذ کرنے کے اپنے حتمی فیصلے سے ایوب خاں کو آگاہ کیا۔ ایوب خاں نے سکندر مرزا کو اس سنگین قدم اٹھانے سے پہلے مزید سوچنے اور غور کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر سکندر مرزا فیصلہ کیے بیٹھا تھا کہ سوائے مارشل لا کے نفاذ کے کوئی دوسرا راستہ نہیں رہا۔

ایوب خاں نے سر آغا خاں کی بات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ غلام محمد اور چوہدری محمد علی کی پیشکشوں کو ٹھکرا دیا تھا مگر اب اُن کے سامنے منتخب صدر اور افواج پاکستان کے سپریم کمانڈر بیٹھے تھے۔ اگر وہ احکام کو بجا لانے سے انکار یا احتراز کر دیتا تو سکندر مرزا انھیں سبکدوش کر کے کسی دوسرے جرنیل کو یہی ذمہ داری سونپ سکتا تھا اور ملک نے مارشل لا سے بہر صورت دوچار ہونا تھا۔ ایوب خاں نے حکم کی تعمیل کو ملک اور افواج پاکستان کی خاطر قبول کر لیا کہ دوسرا کوئی چارہ نہ تھا۔

سکندر مرزا کے اپنے اندازوں کے مطابق اُس نے فوج اور ایوب خاں کو استعمال کر کے اپنے مفاد کی پروجیکشن کرنا تھی مگر اُس کے دل میں خوف بھی تھا جو ہر گنہگار کے دل میں چھپا ہوتا ہے اور یہی خوف اُس کے سکون و اطمینان کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔ کتاب کے شروع میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ سات اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات تقریباً دس بجے ایوب خاں نے اپنے ساتھی جرنیلوں کے ہمراہ آ کر سکندر مرزا کو اطلاع

دی کہ آپریشنز مکمل اور پُرسکون انجام پذیر ہو گئے تو سکندر مرزا کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیر نوازش علی خاں کے کمرے میں کھانے سے پہلے مے نوشی کا سلسلہ شروع ہُوا اور ایک دُوسرے کے جام صحت ٹکرائے۔ سکندر مرزا جب ایک دو چسکیاں لے چکا تو اُسی خوف نے دل میں چٹکی لی۔ یکایک سنجیدہ ہو کر ایوب خاں سے پُوچھا۔

Ayoub will I be alive tomorrow ?

ایوب خاں نے مُسکرا کر سکندر مرزا کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ سکندر مرزا جوابی مسکراہٹ کے ساتھ دوبارہ جامِ شراب میں کھو گئے۔ بعد میں ایوب خاں نے سکندر مرزا سے اصرار کیا کہ وزیرِاعظم ملک فیروز خاں نون کو باقاعدہ خط لکھ کر اطلاع دینا ضروری ہے کہ اُنھوں نے مارشل لا نافذ کر کے جنرل محمد ایوب خاں کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا ہے اور ایسا ہی ایک انفارمی لیٹر ایوب خاں کے نام ہو تاکہ واضح ہو جائے کہ صدرِ پاکستان نے اپنی صوابدید سے یہ انتہائی قدم اُٹھایا ہے۔ سکندر مرزا نے پہلے تو پس و پیش کیا مگر ایوب خاں کے برابر اصرار پر وزیرِاعظم کے نام خط لکھ دیا تاہم ایوب خاں کے لیے انفارمی لیٹر دینے میں پھر بھی دو تین دن لگا دیئے۔

مارشل لاء کے نفاذ کے ساتھ ہی سیاسی طور پر مشتبہ افراد اور سماج دشمن عناصر کی پکڑ دھکڑ شروع ہو جایا کرتی ہے۔ ایوب خاں نے ایسی کسی انتقامی یا انتظامی کارروائی سے گریز کیا۔ اُن کے نزدیک اس کارروائی کی ضرورت نہ تھی قانونی اور اخلاقی تقاضے پورے ہو چکے تو ایوب خاں ایک مستعد اور ذمہ دار کمانڈر کی طرح اپنے مشن کی تکمیل میں منہمک ہو گئے۔ اُنھوں نے ترجیحات کو متعین کیا اور اپنے ہدف سے صدر اور رفقائے کار کو آگاہ کیا۔ اُن کے ذہن میں اصلاحات کی لمبی چوڑی فہرست تھی جس میں زرعی اصلاحات سرِفہرست تھیں۔ سکندر مرزا اس قسم کی دور رس اصلاحات کے نہ قائل تھے نہ خواہشمند۔ دونوں کے بیانات سے تضاد جھلکنے لگا۔ ایوب خاں کے نزدیک جمہوریت کی تربیت اور ترویج دیہات میں پنچایت کے نظام سے ہو سکتی تھی جب کہ سکندر مرزا کنٹرولڈ ڈیماکریسی کی بات کرنے لگے۔ مارشل لاء کے نفاذ سے سکندر مرزا کا مقصد و منشا کچھ

اور تھا۔ اس کی منزل اور تھی۔ اُسے مارشل لاء کو بھی ناکام بنا کر اپنے مقصد کی تکمیل کیلئے جواز مہیا کرنا تھا اس لیے اُس نے ایوب خاں کو خاموش اور محتاط رہنے کی تلقین کی۔ مگر ایوب خاں اپنے سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے سکندر مرزا سے صاف صاف کہہ دیا کہ جناب آپ نے ضروری اختیارات کے ساتھ جملہ ذمہ داریاں مجھے سونپ دی ہیں۔ اب اِن کی انجام دہی میں رکاوٹ پیدا نہ کریں۔

سکندر مرزا اپنے اعلامیے یعنی پروکلیمیشن میں ۱۹۵۶ء کے آئین کو منسوخ کر چکے تھے۔ وفاقی اور صوبائی وزارتوں کو ڈسمس کر دیا تھا۔ قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئی تھیں، سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دے دیا تھا۔ بری فوج کے کمانڈر ان چیف جنرل محمد ایوب خاں کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور افواج پاکستان کا سپریم کمانڈر مقرر کر چکے تھے۔ اب اُن کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، جب جی ایچ کیو کے ایڈووکیٹ جنرل نے اس رائے کا اظہار کیا کہ چونکہ صدر پاکستان جس آئین کے تحت منتخب ہوئے تھے اور جس کی حفاظت کرنے کا اُنھوں نے حلف اُٹھایا تھا وہ آئین ہی منسوخ ہو چکا تو صدر پاکستان کے عہدے کے باقی رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ صدر کے اپنے اعلامیے کے مطابق چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور سپریم کمانڈر حکومت اور ملک کے سربراہ تصور کیے جائیں گے۔ ایوب خاں نے عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے جج ایڈووکیٹ جنرل کی اس رائے کے باوجود یہ فیصلہ صادر کیا کہ صدر کا عہدہ برقرار رہے گا اور سکندر مرزا کو یقین دلایا کہ وُہ خود اور افواج پاکستان صدر کی وفادار رہیں گی۔ اس قانونی حقیقت کا بیگم ناہید مرزا کو علم ہوا تو وُہ سیخ پا ہو گئیں۔ انھوں نے شوہر کو مشورہ دیا تھا کہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور سپریم کمانڈر صدر خود ہوا اور ایوب خاں کو ڈپٹی چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنایا جائے۔ یہ غلطی یا چوک جس کی تلافی اب کسی طرح ممکن نہ تھی سکندر مرزا اور بیگم ناہید مرزا کے درمیان نزع کا باعث بن گئی۔ میاں بیوی کی رہائش عمارت کی اُوپر والی منزل پر تھی۔ نچلی منزل یعنی گراؤنڈ فلور پر پرسنل سٹاف کے دفاتر تھے۔ بیگم صاحبہ کی چیخ پکار ہم لوگوں نے اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔

سکندر مرزا اور بیگم ناہید مرزا کو لڑتا جھگڑتا چھوڑ کر ایوب خاں مشرقی پاکستان کے دورے پر چلے گئے۔ ڈھاکہ کے موچی دروازہ یعنی پلٹن میدان میں ایک بہت بڑے پبلک جلسے سے خطاب کیا مشرقی پاکستان میں ایوب خاں کے عظیم الشان استقبال پر سکندر مرزا بہت پریشان ہوئے اور ایوب خاں کو راستے سے ہٹانے کے منصوبے بنانے لگے۔ مشرقی پاکستان سے واپسی پر ایوب خاں کو گرفتار کرنے کے احکام صادر کر دیے جس کا ذکر پیچھے کیا جا چکا ہے۔ ایوب خاں کو معلوم ہوا تو انہوں نے خود جا کر سکندر مرزا کو تنبیہہ کی کہ آگ سے کھیلنے کی کوشش نہ کریں اور اپنی وفاداری کا ایک بار پھر یقین دلایا مگر سکندر مرزا کے اپنے منصوبے خاک میں مل رہے تھے اور ناہید خانم نے شوہر کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ ایوب خاں سکندر مرزا کو مزید برداشت کرنے کو تیار تھے مگر اس کے کرتوت ملک کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔ فتنہ فساد اور خانہ جنگی کے خطرے سے بچنے کیلئے سکندر مرزا سے نجات ضروری تھی کیونکہ سلگتی آگ کسی وقت بھی بھڑک سکتی تھی۔ ایوب خاں کو اپنے ساتھی جرنیلوں کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے سکندر مرزا کو خیرباد کہنا پڑا۔ ان سب باتوں کے باوجود اُنھوں نے سکندر مرزا کے ساتھ وُہ سلوک کیا جس کا وہ قطعی حقدار نہ تھا، اُنھیں بحفاظت لندن پہنچایا اور صدرِ مملکت کی پنشن سے بھی محروم نہ کیا بلکہ سول سروس کی پنشن بھی دیدی۔

واقعات کے اس تسلسل کی تصدیق ایوب خاں کی خود نوشت سوانح حیات اور اخبارات کی ورق گردانی سے ہو جاتی ہے۔ جہاں تک ایوب خاں اور سکندر مرزا کے درمیان مارشل لا کے نفاذ پر گفتگو کا تعلق ہے تو اس بارے میں بھی شک وشبہ کی گنجائش بہت کم ہے۔ ایوب خاں کی خود نوشت سوانح کی ۱۹۶۷ء میں اشاعت کے بعد لندن میں رہائش پذیر سکندر مرزا اگر تردید کرنا چاہتے تو کوئی چیز مانع نہ تھی اور بالفرض اُن کے لبوں پر کسی وجہ سے مہرِ سکوت ثبت تھی تو ناہید خانم کی زبان روکنے والا کون تھا؟ اُن دونوں میاں بیوی کی خاموشی سے ایوب خاں کے بیانات سے تصدیق ہوتی ہے کہ مارشل لا کا نفاذ سکندر مرزا کا اپنا فیصلہ تھا اور وہ بلا شرکت غیرے ملک و قوم

کے خلاف اس جرم کے ارتکاب کا واحد ذمہ دار تھا۔ ایوب خاں مختلف اطراف سے ترغیبات کے باوجود اقتدار سے گریز کرتے چلے آئے تھے بالآخر جب اُنھوں نے آئینی طور پر منتخب صدر کے حکم کی تعمیل میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی جملہ ذمہ داریاں قبول کرلیں تو اُس وقت سکندر مرزا کو احساس ہوا کہ ایوب خاں اُس کے اشاروں پر نہیں ناچے گا۔

سکندر مرزا کے چلے جانے کے بعد ایوب خاں کے لیے مناسب تو یہ تھا کہ افواجِ پاکستان کی نگرانی میں انتخاب کرواکر خود اقتدار سے علیحدہ ہو جاتے اور واپس جی ایچ کیو تشریف لے جاتے یا پھر ریفرنڈم کروالیتے مگر انھوں نے جن اصلاحات کا بیڑا اُٹھایا تھا انہیں انجام تک پہنچانے کی ٹھان لی۔ وہ مختارِ کل بن گئے اور ہر مختارِ کل کی طرح اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ وہ عقلِ کل بھی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ سکندر مرزا کو بھول گئے اور ایوب خاں کو جا و بے جا تنقید کا نشانہ بنانا شروع کردیا۔

ایوّب خان ایوانِ صدر میں

۲۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی صبح کو جب میں دفتر پہنچا تو ایوانِ صدر، صدر پاکستان میجر جنرل سکندر مرزا اور خاتونِ اوّل ناہید سکندر مرزا سے خالی ہو چکا تھا۔ مجھے علی الصبح پولیس انسپکٹر بہاول بخش کی زبانی گزری ہوئی رات کی کارروائی کا علم ہو گیا تھا مگر پرسنل سٹاف نے صبح کی خبروں میں سُن لیا تھا کہ سکندر مرزا دست بردار ہو کر رخصت ہو گئے ہیں اور جنرل محمد ایوب خاں نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور سپریم کمانڈر کے علاوہ پریذیڈنٹ آف پاکستان کا عہدہ بھی سنبھال لیا ہے۔ اب وُہ بری فوج کے کمانڈر ان چیف، تینوں افواج کے سپریم کمانڈر، سی ایم ایل اے اور صدرِ پاکستان سبھی کچھ تھے۔

ہر نئے پریذیڈنٹ کے تقرر پر پرسنل سٹاف میں کچھ نہ کچھ ردوبدل ہونا ضروری ہوتا ہے۔ غلام محمد کے بعد سکندر مرزا تشریف لائے تھے تو پرسنل سیکرٹری مس روتھ بورل کو فارغ کر دیا گیا اور وُہ یورپ اپنے وطن چلی گئیں۔ فرخ امین جو قائدِ اعظم کے پرسنل اسسٹنٹ اور خواجہ ناظم الدین کے زمانے میں اسسٹنٹ سیکرٹری بنائے گئے تھے۔ ٹرانسفر کر دیے گئے۔ اب ایوب خاں آرہے تھے اور ہم لوگ شش و پنج میں تھے کہ دیکھیں موجودہ ٹیم میں سے کون رہتا ہے کون جاتا ہے اور

کس کس اندر پوگ وچھوڑا کون ملے گا مُڑ کے
کیڑے کیڑے یار محمدؐ پھلکے بیسن جُڑ کے

یہی گومگو کی کیفیت تھی کہ تقریباً دس بجے میرے کمرے میں ایک باوردی میجر صاحب چھڑی گھماتے ہوئے تشریف لائے۔ اپنا تعارف کرایا "میرا نام میجر ظفر ہے۔ میں انٹر سروسز انٹیلی جنس سے آیا ہوں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو اپنی میز کی دراز الماری اور

کونفیڈنشل باکس کھول دیں میں کاغذات ملاحظہ کرنا چاہتا ہوں۔" عرض کیا تشریف رکھیے، کوئی اتھارٹی لیٹر؟ فرمایا تو اتھارٹی لیٹر، آرڈر ہے۔ عرض کیا میں افسر مجاز یعنی سیکرٹری ٹو پریزیڈنٹ قدرت اللہ شہاب کی اجازت کے بغیر کاغذات دکھانے سے قاصر ہوں۔ فرمایا جائیے اجازت لے آیئے۔ میں نے انٹرکوم پر شہاب صاحب کو اطلاع دی اُنھوں نے فرمایا میجر ظفر اُن سے مل کر گئے ہیں۔ آپ چابیاں اُن کے حوالے کر دیں۔ چنانچہ چابیاں میجر ظفر کے سامنے میز پر رکھ دیں۔ فرمایا ذرا تکلیف کر کے کھول دیجیے۔ حکم کی تعمیل کر دی۔ عرض کیا میں کمرہ خالی کر دُوں؟ فرمایا نہیں آپ کرسی پر تشریف رکھیں۔ دونوں مل کر کاغذات دیکھتے جائیں گے۔ اتنے میں خدمت گار صبح کی کافی لے کر آگیا اور ہم دونوں کافی پینے لگ گئے۔ باتوں سے معلوم ہُوا کہ میجر ظفر میرے بارے میں مجھ سے بھی زیادہ باخبر ہیں۔ کافی کے دوران کافی بے تکلّف ہو گئے، دو دن کاغذات کی جانچ پڑتال میں لگ گئے۔ یہی میجر ظفر بعد میں پریزیڈنٹ ایوب خاں کے سیکورٹی آفیسر مقرر ہو کر تشریف لائے۔ شروع شروع میں مجھے شبہ گزرا کہ میجر ظفر کی میرے ساتھ روز بروز کی بے تکلفی انٹیلی جنس والوں کی ترکیب استعمال ہے مگر وُہ میرے ساتھ واقعۃً پُرخلوص تھے اور رفتہ رفتہ ہم آپس میں گہرے دوست بن گئے۔

سکندر مرزا کے پرسنل سیکرٹری نصرتؔ (ایم ڈی احمد) کو جنھیں سکندر مرزا اپنے ساتھ وزارتِ داخلہ سے لائے تھے اور نصرتؔ کہہ کر پکارا کرتے تھے فوری طور پر یعنی ۲۸ اکتوبر ہی کو ٹرانسفر کر دیا گیا تھا۔ ان دنوں وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری سکندر مرزا کے گہرے دوست مرزا اسکندر علی بیگ یا مرزا عثمان علی بیگ میں سے کوئی بیگ تھا۔ نصرت نے اُنھی کے ذریعہ اپنی پوسٹنگ وزارتِ خارجہ میں کروالی۔ سالہا سال تک وُہ سفارت کار کی حیثیت سے پہلے انگلستان اور پھر مصر میں متعین رہے۔ وزارتِ خارجہ میں کچھ سال بطور ڈپٹی چیف آف پروٹوکول کام کیا۔ دو یا تین بار مدّت ملازمت میں توسیع ہوئی۔ ۱۹۸۳ء یا ۱۹۸۴ء میں مجلسِ شوریٰ میں ایک سوال کے جواب کے طور پر اُن افسران کی فہرست اخبارات کی زینت بنی تھی جنھوں نے اسلام آباد میں سبزیوں کی کاشت

کے لیے اونے پونے داموں اراضی حاصل کر رکھی تھی یا الاٹ کروا کر مبینہ طور پر کئی گنا قیمت پر فروخت کر چکے تھے۔ اُس فہرست میں نصرت کا نام بھی شامل تھا۔

نومبر ۱۹۵۸ء کا پورا مہینہ بیکار بیٹھے بیٹھے گزر گیا اور پریذیڈنٹ ایوب خاں ایوانِ صدر میں منتقل نہ ہوئے۔ وہ سٹیٹ گیسٹ ہاؤس اور بعد ازاں پرائم منسٹر ہاؤس میں مقیم رہے۔ یکم دسمبر کی صبح کو ایک مرنجاں مرنج قسم کے بزرگ میرے کمرے میں داخل ہوئے اور اُن کے پیچھے اُن کا ٹائپ رائٹر پہنچ گیا۔ یہ سید محمود حسن تھے پرسنل اسسٹنٹ ٹو کمانڈر اِن چیف۔ محمود صاحب جنرل ایوب خاں کے ہمراہ شروع اکتوبر سے راولپنڈی سے تشریف لائے ہوئے تھے اور جنرل صاحب کے ساتھ پرائم منسٹر ہاؤس میں کام کر رہے تھے۔ اُن کی آمد سے مجھے یقین ہو گیا کہ میرا تبادلہ ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جنرل کی وردی میں ملبوس پریذیڈنٹ ایوب خاں ایوانِ صدر تشریف لے آئے۔ اُن کے پرائیویٹ سیکرٹری کرنل شریف اور اے ڈی سی کیپٹن گوہر ایوب خاں اُن کے ہمراہ تھے۔ پریذیڈنٹ صاحب کو اُن کے کمرے میں بٹھا کر کرنل شریف نے نصرت والے خالی کمرے میں بطور ڈپٹی ملٹری سیکرٹری اپنا دفتر لگا لیا اور کیپٹن گوہر ایوب خاں اے ڈی سی والے کمرے میں تشریف لے گئے۔ کیپٹن گوہر ایوب خاں کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا سوائے قد اور جثے کے ہو بہو اپنے والد کی کاپی تھے اور کیپٹن کی وردی اُنھیں خوب زیب دیتی تھی۔

دوپہر کے قریب کرنل شریف میرے کمرے میں تشریف لائے اور فرمایا "مسٹر خالد آپ پریذیڈنٹ کے پرسنل اسسٹنٹ نمبر ون PAPI اور محمود پرسنل اسسٹنٹ نمبر ٹو PAPII ہوں گے۔ پریذیڈنٹ کے ساتھ ملاقات اور انٹرویو کی جو درخواست تحریری یا ٹیلیفون پر موصول ہو فہرست کی شکل میں میرے پاس لائیں پھر پریذیڈنٹ صاحب کو پیش کر کے ان کی منظوری لی جائے۔ وقت کا تعین میں خود کروں گا اس کے بعد آپ متعلقہ حضرات کو مطلع کر دیں اور پروگرام پرنٹ کروا لیا کریں۔ محمود آپ کی مدد کرے گا۔" کرنل شریف سے پہلے تین ملٹری سیکرٹریوں سے میرا واسطہ رہا تھا۔ کرنل حامد نواز خاں (جو ۱۹۷۲ء میں ایران میں پاکستان کے سفیر اور ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کے

ٹکٹ پر سیالکوٹ کے حلقے سے ایم این اے منتخب ہوئے تھے) کرنل سید نیّر رضا اور کرنل نوازش علی خاں۔ تینوں بھلے آدمی تھے مگر کرنل شریف سے پہلی ملاقات سے اندازہ ہوا کہ اسم بامسمہ ہیں اور ایسے لگا جیسے برسوں سے جان پہچان ہے۔ عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وُہ۔ شیریں سخن، کم گو مگر زود فہم۔ چہرے پر بچّوں جیسی معصومیت اور شرمیلا پن۔ اُس وقت تک غالباً غیر شادی شدہ تھے۔ افسوس کہ اُنکے ساتھ تعلق بہت مختصر مُدّت رہا اور وُہ جلد بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی پا کر چلے گئے یہی کرنل شریف بعد میں جنرل محمد شریف بنے جو اُنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کے پہلے چیئرمین۔ اُنھی دنوں ایک دن اتفاقاً راولپنڈی صدر کی ایک دکان میں جنرل شریف سے ملاقات ہو گئی دُور سے پہچان گئے اور بڑے تپاک سے ملے۔

غلام محمد کے زمانے میں سارا سٹاف اعصابی تناؤ اور عدیم الفرصتی کا شکار رہتا تھا۔ سکندر مرزا تشریف لائے تو سکون ضرور تھا مگر روکھا پھیکا بلکہ بدذائقہ۔ جمائیاں لے لے کر دن گزارنا پڑتا تھا۔ میرے ساتھ والے کمرے میں بلیئرڈ رُوم اور ایوانِ صدر کی لائبریری تھی جہاں لائبریرین نہیں ہوتا تھا۔ میرے دل بہلاوے کے لیے وہی کافی ثابت ہوئی۔ کشف المحجوب کا انگریزی ترجمہ پہلی بار پڑھا۔ یہ کتاب اے کے بروہی نے غلام محمد کو دی تھی۔

غلام محمد فالج کے حملے کی وجہ سے بمشکل لکھ سکتے تھے لہٰذا اُنھیں زبان ہی کو استعمال کرنا پڑتا تھا جو کثرتِ استعمال سے اور زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ اگر کبھی کبھار لکھنا پڑ جاتا تو بعد میں خود بھی نہ پڑھ سکتے تھے۔ فرخ امین کو اُن کا لکھا ہوا پڑھنے میں مہارت ہو چکی تھی یا پھر تھوڑا بہت میں پڑھ لیتا تھا۔ سکندر مرزا کی ہینڈ رائٹنگ ایسی تھی جسے آسانی سے پڑھا جا سکے مگر اُنھیں یوں لکھنے لکھانے کی زیادہ عادت نہیں تھی اور نہ ضرورت۔ اُنھوں نے بغیر لکھے لکھائے کام چلانے کی تربیت پا رکھی تھی۔ جب ایوب خاں تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ اُن کی لکھائی بھی اُن کی طرح خوب صورت ہے۔ اُن کی سوچ اور اُن کی لکھائی دونوں صاف ستھری تھیں۔ صبح آفس میں تشریف لاتے تو بیٹھتے

ہی بلا دا آجاتا یا اپنے کمرے میں جاتے ہوئے ہاتھ سے لکھے ہوئے پانچ سات صفحات تھما جاتے۔ کبھی کوئی نوٹ اور کبھی مختلف امور پر نوٹس۔ محمود اور میں دونوں مصروف رہتے۔ انھیں ہم دونوں پر مکمل اعتماد تھا بلکہ آہستہ آہستہ انھوں نے مجھے زیادہ مصروف رکھنا شروع کر دیا۔ شاید اس لیے کہ میں محمود سے عمر میں چھوٹا تھا اور تیز کام کرتا تھا۔ میں دس برس بعد یعنی ۱۹۶۸ء میں آر سی ڈی میں تقرری کے بعد تہران چلا گیا مگر محمود ایوب خاں کی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی حکومت کی طرف سے اُن کی خدمت کرتے رہے اور اُنھوں نے ہی ایوب خاں کی وفات کی خبر ذرائع ابلاغ کو بہم پہنچائی تھی۔ میں اُن دنوں تہران میں مقیم تھا۔ واپس آکر سنا کہ ایوانِ صدر کے پرانے سٹاف میں سے کسی کو ایوب خاں کے جنازے میں شرکت کی اجازت نہیں ملی تھی۔ "قائدِ عوام" خود بھی کسی زمانے میں ایوب خاں کو ڈیڈی کہا کرتے تھے۔ جنازے میں شریک نہ ہوئے حالانکہ ایسے موقع پر "دو چار قدم تو دشمن بھی تکلیف گوارا کرتے ہیں۔"

ہر طبقے سے صحیح خیال کے لوگوں کو اکٹھا کرکے اپنا پروگرام بنائیں۔
آخرکار وہی سیاسی جماعت ملک کے لئے بہتر ہوگی، جس کی بنیاد عوام سے شروع ہو، اور جس کی قیادت عوام کے تعاون سے پیدا ہو۔ لیڈرشپ کو اوپر سے مسلط کرنا کسی کام نہیں آسکتا۔

مجھے بھی اکثر یہ کہا جاتا ہے، کہ میں بھی اپنی ایک جماعت بناؤں۔ لیکن میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔ اس وقت یہ نظر آتا ہے، کہ سیاسی جماعت بنانے کے لئے جذباتی نعرے اور تنقیدی پروگرام لازمی ہیں۔ ~~لیکن میرے لئے یہ کارآمد نہیں ہے~~ مجھے اس قسم کی دوکانداری سے نفرت ہے۔ میرے پاس صرف ایک نعرہ ہے، اور وہ ہے پاکستان کی ترقی، سلامتی، اور استحکام۔ میرے پاس صرف ایک پروگرام ہے۔ اور وہ ہے: کام، کام، کام۔ اس میں نہ جذباتیت ہے نہ تنقید ہے۔ اس میں صرف محنت اور تعمیر ہے۔ ~~پھر میں اپنی سیاسی جماعت کیسے بنا سکتا ہوں~~ میری دعا ہے، کہ خدا کرے ملک میں ایسے پروگرام کی بھی کوئی پارٹیاں بن سکیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کروں گا۔

5۔ سیاسی نظربندی:

دوسری چیز جسے فیشن کے طور پر پبلک جلسوں میں اچھالا جاتا ہے، وہ سیاسی نظربندوں کی رہائی کا مطالبہ ہے۔

ایوبؔ خان کی نظر میں سیاست

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں اپنی پہلی نشری تقریر میں ایوب خاں نے اعلان کیا تھا کہ جب تک مبینہ خرابیاں دور نہ کر لوں گا مارشل لا جاری رہے گا۔ اس کے باوجود ساڑھے تین برس بعد یعنی جون ۱۹۶۲ء میں مارشل لا کے خاتمے کا اعلان کیا، بنیادی حقوق بحال کیے اور الیکشن کروا کر عوام کو شریکِ اقتدار کرنے کی سعی کی اگرچہ بی ڈی سسٹم کے ذریعے ہی سہی۔ مجبوری کے عالم میں سینے کا پتھر سمجھ کر نہیں بلکہ خلوصِ نیت سے۔ شروع میں سیاسی جماعتوں کی بحالی یا خود کو کسی سیاسی جماعت کے ساتھ وابستگی کے مخالف تھے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ جس طرح قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں اسی طرح سیاست کاری اور ریاکاری میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اِن خیالات کا حامل شخص اگر کسی مرحلہ پر میدانِ سیاست میں اترے گا تو اُس کا وہی حشر ہوگا جو فیلڈ مارشل صاحب کا ہوا۔

جولائی ۱۹۶۲ء میں اُنھوں نے قدرت اللہ شہاب کو ایک اہم تقریر تیار کرنے کے لیے بریفنگ دی۔ جب شہاب صاحب نے اُنھیں تقریر کا مسودہ دکھایا تو حسبِ معمول متن میں جگہ جگہ اپنے ہاتھ سے تبدیلیاں کیں۔ سیاسی پارٹیوں کے بارے میں اپنے قلم سے ایسا فقرہ لکھ گئے کہ اُن کے مافی الضمیر کی پوری عکاسی ہو گئی اور وُہ کھلی کتاب کی مانند سامنے آ گئے۔ میرے پاس یہ مسودہ موجود ہے۔ متعلقہ حصّہ کی فوٹو کاپی ملاحظہ ہو۔

اقتدار کا چسکا مگر سیاست سے اجتناب اور جمہوری سیاست میں اگر چہ اغث بازی

سے گریز ناممکن العمل ہے۔ چنانچہ بنیادی جمہوریت کے اجراء اور ۱۹۶۲ء کے نئے آئین کے عملی نفاذ کے کچھ ہی دیر بعد ایوب خاں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اپنی جماعت بنائے بنا چارہ نہیں ہے اور سب سے مضبوط طریقہ پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کے نام کو استعمال کرنا ہے۔ شمع روشن ہو تو اصلی و نقلی پروانوں کی کمی نہیں ہوتی، اقتدار کے رسیا جوق در جوق جمع ہو گئے اور یوں کنونشن مسلم لیگ وجود میں آئی۔ وہی ایوب خاں جنھیں رعایا کاری سے نفرت کا دعویٰ تھا سیاست میں ایسے اُلجھے کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی۔ ۱۹۶۴ء میں محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلے میں الیکشن جیتے بھی اور ہارے بھی۔ جسے اپنی جیت سمجھا وہی انکی ہار تھی۔

ایوب خاں کے لیے کنونشن مسلم لیگ کو ترتیب دینے میں جس شخص نے پس پردہ کام کیا وُہ اُن کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیر ایس جی ایم پیرزادہ تھے (وہی جنرل پیرزادہ جنھوں نے یحییٰ خاں کے چیف آف سٹاف کی حیثیت سے اصلی جوہر دکھائے) انہی نے پارٹی کے قواعد و ضوابط اور جماعت کا منشور تیار کیا۔ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے شہرت یافتہ اور ایوب خاں کے وزیر قانون شیخ خورشید احمد نے منشور کی نوک پلک درست کی۔ پرانے مسلم لیگی اور ایوب خاں کے وزیر اطلاعات و نشریات عبدالوحید خاں نے سیاست دانوں کے ساتھ رابطہ استوار کیے اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے کنونشن مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل کے فرائض انجام دیے۔

ابھی ہار جیت سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ ۱۹۶۵ء کے اوائل میں ازلی دُشمن نے رن کچھ میں جارحیت کا آغاز کیا اور سال کے دُوسرے حصے میں پاک بھارت جنگ پھیل گئی۔ رن کچھ میں جھڑپوں تک ایوب خاں کے ہاتھ سے تحمل اور بُردباری کا دامن نہیں چھوٹا تھا مگر جنگ ستمبر کے بعد ایسے اکھڑے کہ اپنے پرانے اصلی اور پُرسکون خول میں دوبارہ داخل نہ ہو سکے۔ ایک بحران نے دُوسرے بحران کو جنم دیا اور اُن کے گرد بحرانوں کی زنجیر بنتی چلی گئی۔ آستین کے سانپ بھی بالآخر بلاغت کو پہنچ گئے تھے۔ تاشقند ہی میں وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے بھانپ لیا کہ صاحب کے اعصاب

جواب دینے کو ہیں اور قسمت آزمانے کا وقت آ گیا ہے۔ آنسو بہاتے ہوئے راولپنڈی سے لاہور پہنچے اور پھر قریہ بہ قریہ فریاد کی، میری حمایت کر دیں نا شقتہ کے راز بتاؤں گا۔ یوں ایوب خاں کے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ سیاست کاری اور ریاکاری اصل میں دونوں ایک ہیں۔ اگست ۱۹۶۸ء میں راقم نے ایوانِ صدر کو سولہ برس کی رفاقت کے بعد خیرباد کہا تو ایوب خاں ایک ایسے مایوس، دل گرفتہ اور شکست خوردہ فیلڈمارشل تھے جن کے پاؤں تلے سے فیلڈ کھسک چکی ہو۔ اگرچہ اُس وقت انھیں اپنے اندوہناک انجام سے پُوری آگاہی نہ ہوئی تھی اور آئندہ ہونے والے صدارتی انتخاب میں اپنی کامیابی کے بارے پُرامید تھے۔

اُن کی اُمید کے برعکس حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ ریاکاری والی سیاست میں کتے بلی والے نعرے اور غلیظ گالیوں کے رواج کا اجرا ہوا۔ لاہور میں خانہ فرہنگ ایران کی سربراہ خانم بہنام چھٹی پر تہران گئیں تو آر سی ڈی کے دفتر تشریف لائیں۔ انہوں نے اُن دنوں کے ایسے ایسے واقعات سنائے کہ ہم پاکستانیوں کی نگاہیں شرم سے زمین بوس ہوتی گئیں۔ کہنے لگیں کہ آپ کے کشورِ حسین میں ایک انتہائی مکروہ ردِ بہ نے جنم لیا ہے۔ اپنے متعلق بتایا کہ وہ لاہور مال روڈ پر جا رہی تھیں کہ باغِ جناح کے بالمقابل جیالے کارکنوں کے ایک گروہ نے ان کی گاڑی روک کر تقاضہ کیا کہ نعرہ لگاؤں ایوب کتا۔ جواب دیا کہ بیٹا میں تمہاری وہ ماں ہوں جس نے آج تک کبھی کسی کو گالی نہیں دی۔ اب اس بڑھاپے میں اپنی ماں کی زبان گندی نہ کرو۔ باغِ جناح اور گلستانِ فاطمہ قریب ہیں۔ جناح اور فاطمہ نے گالی سن لی تو انھیں دُکھ ہو گا۔ لڑکوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور راستہ روکے رکھا۔ خانم بہنام نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ وہ پاکستانی شہری نہیں بلکہ ایرانی ہیں اور گاڑی پر ادارے کا نام لکھا ہوا دکھایا۔ خانم بہنام کو پاکستان سے دیرینہ وابستگی تھی۔ اُردو اور پنجابی روانی سے بول سکتی تھیں اور خود کو پاکستانی سمجھنے لگی تھیں۔ مگر اُن ناسمجھ لڑکوں نے مجبور کیا کہ اپنے پاکستانی ہونے سے انکاری ہو جائیں۔ بہرحال ایوب خاں نے جانا تھا وہ چلا گیا۔ تین برس بھی نہ گزرے تھے کہ ملک دولخت ہو کر

آدھا رہ گیا۔ جس فوج کی تعمیر و تربیت میں ایوب خاں نے اپنی بہترین عسکری صلاحیتیں صرف کی تھیں اُس فوج کی ایک نمبر ۲ نے حقیر دشمن کے آگے ہتھیار ڈال کر اپنی غیور قوم کی غیرت کو شرمندگی اور ندامت کے بحرِ ناپیدا کنار میں ڈبو دیا۔

بھاگ پہ کس کا زور
ستی چھوڑ چلی بھنبھور

ایوّب خان کا وزیرِ خزانہ

اپنے نظریاتی عقائد اور تحریکِ آزادی کے پس منظر کی وجہ سے ہم شروع ہی سے اشتراکی روس سے الرجک رہے۔ امریکہ نے اپنے بین الاقوامی مفاد میں ہمارے رویے کی پذیرائی کی۔ بعد میں پچاس کے عشرے میں بغداد پیکٹ (عراق میں سوشلسٹ انقلاب کے بعد سینٹو) اور سیٹو کی رکنیت اختیار کر کے دفاعی اعتبار سے ہم مکمل طور پر امریکہ ہی کے دستِ نگر بن گئے۔ یہ اُس پالیسی کا نتیجہ تھا جسے وزیر اعظم لیاقت علی خاں اور وزیرِ خزانہ غلام محمد نے ترتیب دیا تھا اور اُن کے بعد ہر آنے والی حکومت نے اسی ایک سمت پیش قدمی جاری رکھی یہاں تک کہ واپسی کے لیے کوئی راستہ نہ رہا۔ ایوب خاں کے خیال میں ایسا کرنا لیاقت علی خاں کی مجبوری تھی اور اُس وقت کے حالات کا یہی تقاضہ تھا۔ اپنی ذاتی خواہش کے برعکس ایوب خاں نے اُسی پالیسی پر گامزن رہنے میں خود کو مجبورِ محض پایا۔ اپنی پہلی کابینہ تشکیل دی تو وزارتِ خزانہ کے قلمدان کے لیے ورلڈ بنک میں پاکستانی ایگزیکٹو ڈائریکٹر جناب ایم شعیب کا انتخاب کیا حالانکہ ایم شعیب کا امریکی سی آئی اے سے تعلق کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔

پاکستان کا وزیرِ خزانہ بن کر بھی ایم شعیب اپنی تنخواہ ورلڈ بنک سے باقاعدہ زرِ مبادلہ میں وصول کرتا رہا۔ دونوں طرف سے بیک وقت دو تنخواہیں وصول کرنا ملکی مفاد اور اخلاقی اصولوں کے خلاف تھا مگر شعیب نے اِس کھلی بے قاعدگی کی ایوب خاں سے تحریری اجازت لے رکھی تھی۔ ورلڈ بنک کی تنخواہ کے مقابلے میں پاکستانی وزیر کی تنخواہ اتنی قلیل تھی کہ شعیب ایثار سے کام لیتے اُسے چھوڑ بھی سکتے تھے مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ ایک طرف مارشل لاء آرڈر کے تحت لوگ باہر کے بنکوں میں اپنی جمع شدہ رقم

پاکستان منتقل کرنے پر مجبور تھے اور دُوسری طرف پاکستان کے وزیرِ خزانہ غیر ملکی بنک میں ہر مہینے ڈالر جمع کروا رہے تھے۔

ایم شعیب میں صوبائی تعصب کی یہ کیفیت تھی کہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو بلاتمیز بلڈی پنجابی کہا کرتے تھے۔ یہ سب ایوب خاں کے علم میں تھا جس سے وُہ مصلحتاً چشم پوشی کرتے رہے۔ ورلڈ بنک اور امریکہ سے اقتصادی اور فوجی امداد حاصل کرنے کی خاطر ایوب خاں شعیب کو استعمال کرنا چاہتے تھے مگر اُلٹا شعیب کے ہاتھوں استعمال ہونا شروع ہو گئے۔

شعیب نے سب سے پہلے ایوب خاں کی پدری کمزوری کو ایکسپلائٹ کیا۔ ایوب خاں کے دونوں بڑے بیٹے گوہر ایوب خاں اور اختر ایوب خاں بری فوج میں کیپٹن تھے۔ انھیں فوج سے نکل کر کاروبار شروع کرنے کی ترغیب دی اور ہر قسم کے تعاون اور مدد کا لالچ دیا۔ حُسنِ اتفاق سے موقع بھی ہاتھ آ گیا۔

جنرل حبیب اللہ خاں جو بری فوج کے چیف آف جنرل سٹاف اور سب سے سینیئر افسر تھے امپیریل ڈیفنس کالج لندن سے کورس کر کے واپس آئے تو ایوانِ صدر میں ایوب خاں کے مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے۔ اُن کے پہنچنے سے پہلے افواہ گرم تھی کہ وہی ایوب خاں کی جگہ کمانڈر انچیف بننے والے ہیں۔ ایوان صدر میں اُن کے قیام سے اِس افواہ کو مزید تقویت ملی جس کی وجہ سے اُن کی عزّت اور اثر و رسوخ میں کثیر اضافہ ہوا۔ ایوب خاں نے اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے جنرل حبیب اللہ خاں کو فوج سے ریٹائر کر دیا اور اُن کی بجائے جنرل محمد موسیٰ کو کمانڈر انچیف بنایا جن کی وفاداریاں شک و شبہ سے بالا تھیں۔ جنرل حبیب اللہ خاں کی بیٹی کیپٹن گوہر ایوب خاں سے منسوب تھیں اور خدشہ تھا کہ جنرل حبیب اللہ خاں کی ایوب خاں سے ناراضگی اِس رشتے پر اثر انداز ہو مگر فریقین نے دانش مندی کا ثبوت دیا اور شادی بخیر و خوبی انجام پذیر ہوئی۔ گوہر ایوب خاں نے بری فوج سے ریلیز لے لی اور ایم شعیب نے انھیں امریکہ کی مشہور فرم جنرل موٹرز کی ایجنسی لے دی۔ یُوں سُسر اور داماد نے

مل کر گندھارا موٹرز کے نام سے کاروبار شروع کر دیا۔ گندھارا موٹرز جلد ہی گندھارا انڈسٹریز میں تبدیل ہوگئی اور مالکان کا شمار پاکستان کے امیر ترین خاندانوں میں ہونے لگا۔

شعیب نے ایوب خاں کے دُوسرے لڑکے اختر ایوب خاں کو بھی ترغیبات دیں مگر وہ کاروباری سوجھ بوجھ کے اعتبار سے گوہر ایوب جیسے نہیں تھے نہ ہی انھیں جنرل حبیب اللہ خاں جیسا سُسر میسر آیا۔ اُن کی شادی بیگم ایوب خاں کے بھائی عبدالرحمان خان کی صاحبزادی سے ہوئی جو جرمنی میں پاکستان کے سفیر تھے۔ اختر ایوب خاں نے کبھی جم کر کاروبار نہ کیا اور قناعت پسندی پر اکتفا کیے رکھا۔

ایوب خاں کا اپنے دونوں بیٹوں کو یکے بعد دیگرے فوج سے نکال کر کاروبار میں جھونک دینا کوئی معمولی قدم نہ تھا۔ اس کے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوئے اور یہ سودا ایوب خاں کو بڑا مہنگا پڑا۔ جن لڑکوں کا والد کمانڈر انچیف اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہو۔ دادا (رسالدار میجر میر داد) اپنے وقت میں دیسی فوجیوں کے لیے بلند ترین عہدے سے ریٹائر ہوا ہو وُہ صرف کیپٹن کے عہدے پر ہی پہنچ کر بیل آوٹ کر گئے اور یوں سپہ گری کے پیشہ آبا کو حقارت سے ترک کر دیا۔

ایوب خاں کے دُوسرے دو بیٹے شوکت ایوب خاں اور طاہر ایوب خاں اُس وقت زیرِ تعلیم تھے۔ بعد میں اُنھوں نے بھی نجی کاروبار ہی کو ترجیح دی اور اپنے ساتھ اپنے باپ کی بدنامی کا باعث بنے۔ ایوب خاں کے زوال میں اُن کے بیٹوں کے بارے میں جھوٹی سچی داستانوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ کے اختتام پر امریکی رویہ شدید تنقید کی زد میں آیا تو ایم شعیب موقع کو غنیمت سمجھ کر واپس امریکہ چلا گیا۔ بڑھاپے میں اپنے دیرینہ دوست فیاض علی ایڈووکیٹ جنرل کی بلند قامت اور خوبرو بیوہ سے شادی کی اور آخری سانس امریکہ ہی میں لیا۔

ایوب خاں کی قومی حمیت اُس وقت جاگی جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ امریکہ

کے خلاف ایوب خاں کی غیرت اس قدر مجروح ہو چکی تھی کہ اپنی خود نوشت سوانح حیات کا عنوان "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" رکھا حالانکہ سوانح حیات قسم کی کتاب کا عنوان کسی غیر ملک کے حوالے سے نہیں رکھا جاتا۔ شاید ایوب خاں اپنی شکست خوردہ انا کو تسکین دینا چاہتے تھے مگر بعد از وقت جھوٹی تسکین کس کام کی۔

جاں کھیتی دا اگھ نہ رہیا نہ سُکا نہ ہریا
کس کم دُھپ پکا دن والی کس کم بادل وریا

فرینڈز ناٹ ماسٹرز کے بارے میں ایک اور دلچسپ بات ہے۔ شروع میں اس کتاب کا عنوان اینڈیور اینڈ پراسپر Endure and prosper یعنی پہلے برداشت کرو اور پھر پھلو پھولو تجویز ہوا تھا۔ ایوب خاں نے ایک دانشور دوست سے ذکر کیا تو بات پھیل گئی۔ پنجاب یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے نجی محفل میں فقرہ چُست کیا کہ مطلب واضح ہے you endure and we prosper قہقہے بلند ہوئے۔ انٹیلی جنس رپورٹ کے ذریعے یہ خبر ایوب خاں تک پہنچی تو سمجھ گئے کہ اشارہ اُن کے لڑکوں کے کاروبار کی طرف ہے اور مجوزہ عنوان کو ذہن سے نکال دیا۔ فرینڈز ناٹ ماسٹرز چھپ گئی تو فیصلہ ہوا کہ کتاب کا اُردو ترجمہ بھی شائع کیا جائے اور عنوان "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" تجویز ہوا۔ اقبال کے مشہور شعر سے مستعار اتنا لمبا عنوان قاضی سعید نے تجویز کیا تھا جو ایوب خاں کے پی آر او تھے اور بعد میں ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

پسرانِ ایوبؓ

ایوب خاں ایوانِ صدر میں منتقل ہوئے تو بری فوج کی طرف سے اے ڈی سی اُن کے اپنے بیٹے کیپٹن گوہر ایوب خاں تھے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد کیپٹن گوہر ایوب خاں نے پاک فوج سے ریلیز لے لی اور نجی کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ اُن کی جگہ ایوب خاں کے دُوسرے صاحبزادے کیپٹن اختر ایوب خاں، صدر پاکستان کے اے ڈی سی بن کر تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے بھی پاک فوج سے ریلیز لے لی اور کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ ایوب خاں کے یہی دو لڑکے فوج میں تھے جنھوں نے یکے بعد دیگرے فوجی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا۔ ایوب خاں کے دُوسرے دو لڑکے شوکت ایوب خاں اور طاہر ایوب خاں اُن دنوں زیرِ تعلیم تھے۔ اُنھوں نے بھی تعلیم مکمل کر کے فوج کی طرف رُخ نہ کیا۔ والد کی وفات کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ شوکت ایوب خاں دل کا دورہ پڑنے سے عین عالم شباب میں انتقال کر گئے۔ تقریباً تین سال بعد اختر ایوب خاں بھی فوت ہو گئے۔ شوکت ایوب خاں کی وفات پر بیگم ایوب خاں کے آنسو تھمنے نہ پاتے تھے مگر اختر ایوب خاں فوت ہوئے تو بیگم صاحبہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صبر اور ہمت عطا ہوئی۔ شاید اُن کی آنکھیں ہی خشک ہو چکی تھیں۔ آہ بھرتیں اور فرماتیں۔

کیہہ خبر کیہہ ہو یا۔ میرا شیر پتر ستا ای سوں گیا۔ اچھا تیرا شکر اے۔ گوہر تے طاہر نوں سلامت رکھیں۔

محمد ایوب خاں ہری پور (ہزارہ) کے قریب موضع ریحانہ میں مئی ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں دفن ہیں۔ اُن کے آباؤ اجداد نے جو قبیلہ ترین سے تعلق رکھتے تھے پشین (بلوچستان) سے ہجرت کر کے ہزارہ میں سکونت اختیار کی تھی۔ قبیلہ

کے سردار محمد خاں ترین نے سکھوں کے خلاف سخت مزاحمت کی مگر رنجیت سنگھ کے ہاتھوں شکست کھا کر رواٹ کے قلعہ میں قید ہوئے اور وفات پائی۔ اُس کے بعد پنجاب پر انگریزوں کے قبضے کے دوران ترین قبیلے نے مزاحمت کی اور ترین سردار کو توپ سے اُڑا دیا گیا۔ ایوب خاں کے والد میر داد خاں ترین نے برٹش انڈین آرمی میں ملازمت اختیار کر لی اور رسالدار میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اُس زمانے میں کوئی ہندوستانی اس عہدے سے آگے ترقی نہیں کر سکتا تھا۔ ایوب خاں کی خود نوشت سوانح حیات کے مطابق اُن کے والد رسالدار میجر میر داد خاں متشرع اور تہجد گزار تھے۔ وہ ایوب خاں کو حافظ قرآن بنانا چاہتے تھے مگر اُنھیں کامیابی نہ ہو سکی۔ ایوب خاں نے مقامی سکول میں داخلہ لے لیا۔ چھٹی جماعت میں تھے کہ فیل ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں ہری پور سے پندرہ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ ابھی علی گڑھ سے گریجویشن کرنے والے تھے کہ ۱۹۲۶ء میں برٹش انڈین آرمی کے لیے کیڈٹ کی سلیکشن میں کامیاب ہو کر سنیڈھرسٹ (انگلستان) چلے گئے۔ جنگِ عظیم دوم میں برما کے محاذ پر جاپانیوں کے خلاف نبرد آزما رہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت بریگیڈیئر کے عہدے پر تھے اور مسلمان مہاجرین کو مشرقی پنجاب سے پاک سرزمین تک پہنچانے کی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۱ء میں بری فوج کے پہلے پاکستانی سپہ سالار بنائے گئے۔

یہ تھا فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی زندگی کا مختصر خاکہ۔ جس شخص کا پشتوں سے پیشہ آبا سپہ گری رہا ہو۔ جس نے مملکت خداداد پاکستان کے پہلے پاکستانی سپہ سالار ہونے کا بلند ترین اعزاز حاصل کیا ہو، جس نے اپنے خون پسینے سے بری فوج جیسے مقدس ادارے کی آبیاری کی ہو اور جو صرف اور صرف اپنے فوجی عہدے کی بدولت صدرِ پاکستان کے بلند ترین مرتبہ پر پہنچا ہو وہ اپنے لڑکوں کو عین عالمِ شباب میں جب وہ تقریباً پچیس یا چھبیس برس کے ہوں اور صرف چار پانچ سال کی سروس کی ہو فوج سے ریلیز کر کے نجی کاروبار میں لگا دے ناقابلِ فہم ہے۔ والد کے صدر پاکستان بن چکنے

کے بعد اولاد کے لیے فوج سے وابستگی کیا مقدس پیشہ نہیں رہا تھا؟ صدر پاکستان کے لڑکوں کا فوج میں رہنا غیر محفوظ یا غیر منافع بخش ہو گیا تھا؟ ایک کیڈٹ کی تعلیم و تربیت پر حکومت کا زر کثیر خرچ ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عام حالات میں اتنے کم عرصے سروس کے بعد فوج سے ریلیز لینا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ اگر صدر پاکستان کے علاوہ کسی عام شہری کے لڑکے ہوتے تو کیا وُہ بھی یوں آسانی سے ریلیز حاصل کر سکتے تھے؟ یہ وُہ سوالات ہیں جن کا جواب پریزیڈنٹ ایوب خاں نے عہدِ صدارت میں یا باقی ماندہ زندگی میں کبھی نہ دیا۔ خود تو جنرل کے عہدے سے فیلڈ مارشل بن گئے مگر اپنی اولاد کو فوج سے نکل جانے کی اجازت دی بلکہ نکال لیا۔ اُن کے پریزیڈنٹ بننے کے بعد یہ پہلی لغزش تھی جو اُن سے سرزد ہوئی اور جس کی اُنھیں بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ اُن کے لڑکوں کے بارے میں جھوٹی سچی کئی کہانیاں مشہور ہوئیں اور باپ ہدفِ تنقید بنتا رہا۔ میرے ایک دوست اور اُن کی بیگم جن کا اپنا تعلق وزارتِ دفاع سے تھا، پریزیڈنٹ ایوب خاں کے بڑے مداح ہوا کرتے تھے مگر لڑکوں کے کردار کی وجہ سے اُنھیں اپنی رائے بدلنا پڑی۔ ایک دفعہ میں نے ایوب خاں کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ اولاد بالغ ہو تو اپنے قول و فعل کی خود ذمہ دار ہوتی ہے اور یہ کہ اُن کی کسی بُرائی کو باپ کے کھاتے میں ڈالنا انصاف نہیں تو وُہ خاتون مجھ پر برس پڑیں کہ چھوڑیے جی جو باپ اپنی اولاد کو کنٹرول نہیں کر سکتا پورے ملک کو سنبھالنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ مجھے خاموش ہونا پڑا کیونکہ مجھے اس سے اتفاق تھا۔

کیپٹن گوہر ایوب نے اپنے سُسر لیفٹیننٹ جنرل حبیب اللہ خاں کے ساتھ مل کر گندھارا انڈسٹریز کی بنیاد رکھی مگر کیپٹن اختر ایوب خاں چھوٹے موٹے کاروبار پر قناعت کرتے رہے۔ دراصل اختر ایوب خاں کا ذہن کاروبار کی طرف مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ بہت صاف گو اور سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ ایک عرصے تک چھوٹی اور پرانی فوکس ویگن گاڑی پر گزارا کیا جبکہ گوہر ایوب، شوکت ایوب اور طاہر ایوب خاں کے پاس نئی اور بڑی گاڑیاں تھیں۔ میرے ساتھ بڑی دوستی تھی۔ تقریباً ہر روز کچھ وقت

میرے ساتھ گزارتے۔ کبھی کبھی اُن کے ہمراہ علی افضل جدون بھی ہوتے جو اُن دنوں پنجاب یونیورسٹی میں سٹوڈنٹ لیڈر اور آج کل راولپنڈی مسلم لیگ کے عہدے دار ہیں۔ اگر دن کو فرصت نہ ملتی تو شام کو گھر تشریف لے آتے اور ہم دونوں اُن کی فوکسی میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی ڈرائیو پر نکل جاتے۔ رخصت ہونے وقت عموماً یہی کہتے اچھا خالد صاحب مجلئے فیر آستے آستے۔ آہستہ آہستہ جانے والے شخص نے بالآخر اتنی شتابی سے کام لیا کہ پچاس برس کے قریب عمر ہو گی جان جانِ آفرین کے سُپرد کر دی۔ ہماری دوستی میں پریذیڈنٹ کے اسسٹنٹ پی آر او نثار حسین درانی بھی شریک تھے اور ہماری بہت پُر لطف محفل رہا کرتی۔ جب پریذیڈنٹ کے پرنسل سیکرٹری این اے فاروقی نے روزنامہ نوائے وقت اور ہفت روزہ چٹان کے ایوانِ صدر میں داخلے پر پابندی لگائی تو ہم نے کسی نہ کسی طرح پریذیڈنٹ کو ان پرچوں کے ضروری تراشے بھجوا دیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ہمیں اختر ایوب صاحب کا مکمل تعاون حاصل رہا۔ درانی بیچارہ اسی جرم کی پاداش میں مارا گیا۔ اس واقعہ کا ذکر بعد میں اپنے مقام پر آئے گا۔ اختر ایوب خاں مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں ہری پور سے ایم پی اے منتخب ہو گئے۔ اپنے علاقے میں بڑے ہر دلعزیز تھے۔ اپنی وفات تک عوام سے رابطہ قائم رکھا۔ خدا اُنھیں مغفرت کرے بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ایوب خاں کو البتہ اپنے بڑے لڑکے گوہر ایوب خاں سے زیادہ توقعات وابستہ تھیں، اگرچہ گندھارا انڈسٹریز سے منسلک ہونے کی وجہ سے گوہر ایوب خاں کا شمار سرمایہ داروں میں ہونے لگا تھا۔ اس کے برعکس اختر ایوب خاں غریب عوام میں رہتے ہوئے اُن کی خدمت سے لُطف اٹھانے میں مگن رہے۔

ایوب خان کا رفاہی فنڈ

۱۹۵۸ء میں انتخابات کی سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ریپبلکن پارٹی نے سکندر مرزا کی مدد سے صنعت کاروں، تاجروں اور زمینداروں سے خطیر رقم انتخابی اخراجات کے لیے بٹور لی تھی مگر مارشل لا نافذ ہو گیا اور بنکوں میں جمع شدہ سیاسی جماعتوں کے فنڈ منجمد کر دیئے گئے۔ تاہم کافی رقم کے چیک ابھی کیش طلب تھے اور جوں کے توں سابق وزیر اعظم ملک فیروز خان نون اور سابق وزیر اعلیٰ نواب مظفر علی خان قزلباش کے قبضے میں تھے۔ ریپبلکن پارٹی کے خالق سکندر مرزا بھی رخصت ہو چکے تھے۔ قدرت اللہ شہاب نے ایوب خان کو مشورہ دیا کہ ملک صاحب اور نواب صاحب کیش طلب چیک صدر پاکستان کے نام انڈورس کر کے ایوان صدر بھیج دیں۔ اور یہ رقم یتیموں، بیواؤں اور نادار ادیبوں شاعروں اور صحافیوں کی بہبود پر خرچ کی جائے۔ ایوب خان نے فوراً تجویز مان لی اور ایک کروڑ روپے سے زیادہ کی رقم کے چیک وصول کر لیے گئے تاہم سب کے سب کیش نہ ہو سکے کیوں کہ اس دوران چیک بھیجنے والوں نے اپنے بنکوں کو چیک کیش نہ کرنے کی ہدایات دے دی تھیں۔ پھر بھی ۵۱ لاکھ روپے کی رقم جمع ہو گئی۔ جس سے پریذیڈنٹس ویلفیئر فنڈ کے نام سے اکاؤنٹ کھول دیا گیا۔

اس فنڈ سے آدھی رقم یتیموں، بیواؤں کے لیے مختص کر کے بقیہ رقم ادیبوں وغیرہ پر صرف ہونے لگی۔ وظیفہ کی رقم کی منظوری ایوب خان خود دیتے۔ باقی کام شہاب صاحب کی نگرانی میں میرے سپرد ہوا۔ شہاب صاحب نے اپنے طور پر ضلعی انتظامیہ کے تعاون سے ضعیف و نادار ادیبوں اور صحافیوں کی فہرست مرتب کی۔ وظیفہ کی رقم لواحقین کی تعداد کے مطابق کم سے کم ایک سو روپے ماہوار اور زیادہ سے زیادہ تین سو روپے

مقرر کی گئی اور سب سے فرداً فرداً خط کے ذریعے دریافت کر لیا گیا کہ کیا وہ صدر پاکستان کی طرف سے امداد کے طور پر اتنی رقم ماہوار قبول فرمالیں گے۔ سب نے اثبات میں جواب دیا۔ صرف ایک مردِ خدا نے امداد قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ یہ پشاور کے محمود سرحدی تھے۔ ان کا جواب بھی خوب تھا۔ فرمایا۔

اگر یہ وظیفہ حکومت کی طرف سے میری ادبی خدمت کا صلہ ہے تو میں نے ادب کی خدمت ملک کے لیے کی ہے حکومت کے لیے نہیں اور اگر یہ رقم میری غربت کی بنا پر عطا ہونے والی ہے تو میرے ملک میں مجھ سے بھی زیادہ غریب لوگ موجود ہیں جو مجھ سے کہیں زیادہ امداد کے مستحق بھی ہیں اور خواہش مند بھی۔

محمود سرحدی کے اس جواب کی خوشبو انہی کے ان اشعار میں موجود ہے۔

ہم نے اقبالؒ کا کہا مانا
اور فاقوں کے ہاتھوں مرتے رہے
جھکنے والوں نے رفعتیں پائیں
ہم خودی کو بلند کرتے رہے

قدرت اللہ شہاب کے ایوانِ صدر سے چلے جانے کے بعد یہ دونوں فنڈ میرے اور صدر ایوب خان کے درمیان رہے۔ جب تک میں ۱۹۶۸ء میں ایران نہیں چلا گیا۔ میرے بعد یہ فنڈ ایوانِ صدر سے منتقل ہو کر وزارتِ تعلیم اور وزارتِ اطلاعات میں چلے گئے اور ہر سال وزارتِ خزانہ اس مد میں رقوم مہیا کرنے لگی۔ صحافیوں کی امداد وزارتِ اطلاعات اور ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کی اعانت وزارتِ تعلیم کے سپرد ہوئی۔

میں ۱۹۷۵ء میں ایران سے واپس آیا تو میری تقرری وزارتِ تعلیم میں ہوئی۔ اور یہ دونوں فنڈ ایک بار پھر یک جا ہو کر وزارتِ تعلیم کی تحویل میں آ کر میرے سپرد ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء میں وزارتِ ثقافت و سیاحت تشکیل پائی۔ قائدِ اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی صد سالہ تقریبات سے منسلک ہونے کی بنا پر میں وزارتِ ثقافت میں چلا آیا اور

میرے ساتھ یہ دونوں فنڈ تھے۔ ۱۹۸۴ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک میں ہی انہیں آپریٹ Operate کرتا رہا۔

وزارتِ ثقافت و سیاحت کے سیکرٹری مسعود نبی نور نے اس کارِ خیر میں خصوصی دلچسپی لی اور قیامِ پاکستان کے لیے کام کرنے والے نادار اور عمر رسیدہ افراد کو فہرست میں شامل کر لیا گیا۔
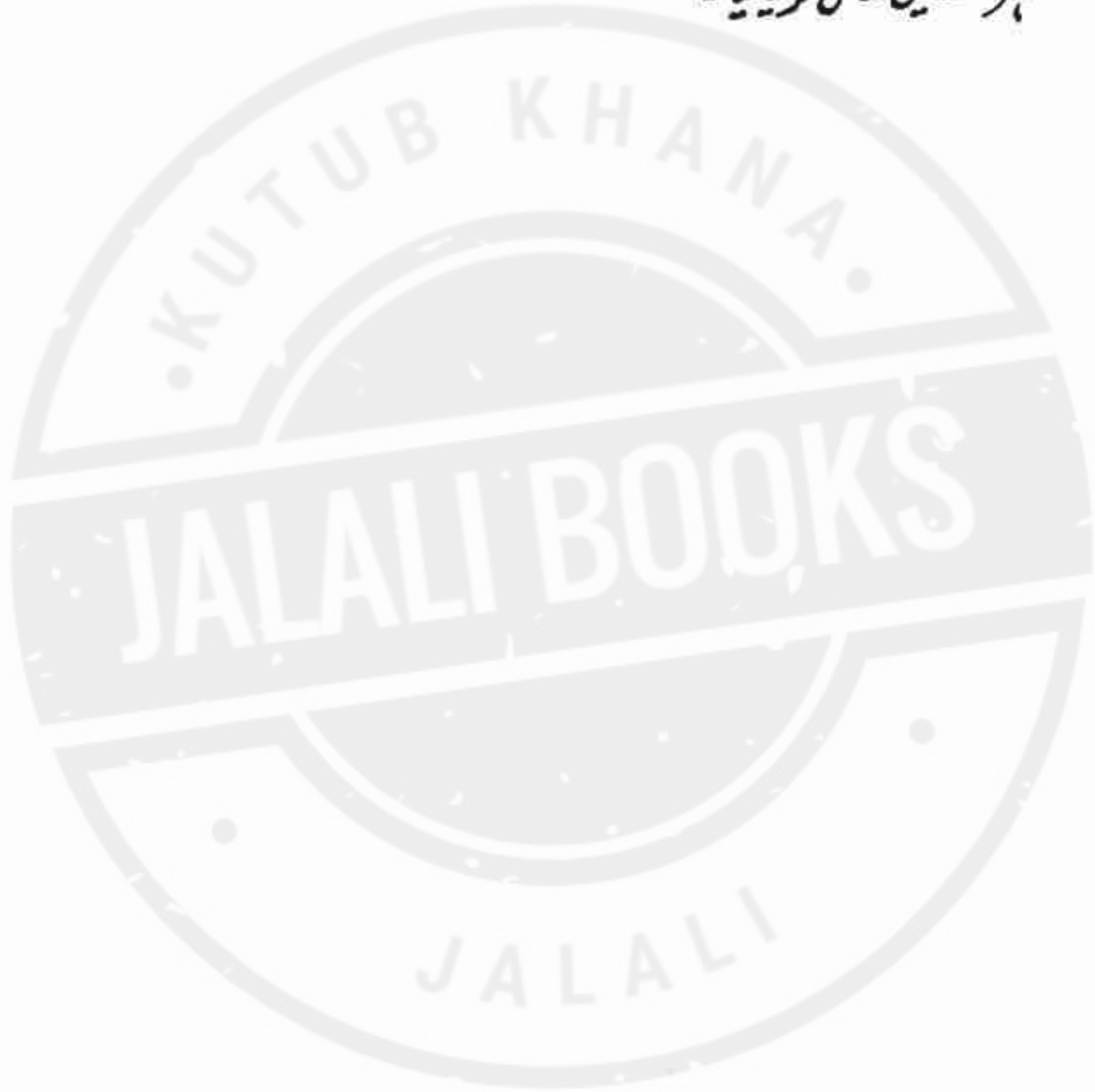
مزار قائداعظمؒ کی بنیاد رکھنے کے بعد ایوب اور دیگر لوگ دعا مانگتے ہوئے

گوہر ایوب خان، م۔ب خالد اور احمد تسنیم

and [illegible] to fight without them unless unavoidable.

I hope these points in brief would be of some assistance to you.

With best wishes

local armies like the Indian Army for ground fighting and Concentrated their own efforts in creation of strong Navy & later Air for strategic mobility and

~~it~~ readily available to it and within its power. In other words, let U.S.A. become the ~~arms~~ arsenal of the free world and let the ~~world~~ friendly countries with within the will to resist Communism provide the man-power. It is only then that the correct balance will be struck and long & economic haul would be possible.

But behind all this must be the most powerful nuclear deterrent of the United States to localize limited wars and prevent ~~its~~ enlargement or fight a full scale war should it become unavoidable.

The question will arise whether the forces for fighting limited wars should be

equipped with tactical nuclear weapons or not. I believe they should be for the simple reason that the enemy is bound to be, equipped & ~~forces~~ forces, they should be trained

Support staunch friendly countries with the military hard-ware to make modern ground forces with tactical air and concentrate themselves on having modern Navy + Air that will provide the strategic mobility and the ability to give powerful support to the friendly armies. By that I don't mean that U.S. should not have an Army, but its role should be to go out in support of friendly armies and rarely to fight its own. So, the key to successful fighting of limited wars lies in pooling the resources of the friendly countries in the free world: each providing the elements

without unnecessary loss of resources. As the two categories of countries are intertwined, those with weaker faith will get heart + courage through the strength of steadfastness. Also support should be given to a people of a country as opposed to individuals. This method will be far more efficacious and of lasting value.

When thinking of military measures in combating limited wars the study of British methods in maintaining a far flung empire would be fruitful. They created

vast that I have not the time to answer in full, but I will make an attempt in brief.

Limited or unlimited wars are started by people for reasons of their own, which can be many. In the present context of things limited wars are started by the Communists in pursuance of their avowed object of world domination in areas of weakness. The methods are military, subversion or intimidation conducted through proxy of local Communists or even directly as in later stages of Korean struggle.

The problem then is how to prevent a limited war & when it comes how to fight it. So, the answers have to be political, economic and military.

Communist domination anywhere can be serious as attempts at domination in Congo, but it is particularly serious in the countries around the periphery, the will to resist amongst whom varies. Some are determined to resist Communism, whatever the cost, others not so determined. The thing to do then is to distinguish between the two categories and support the steadfast ones with military tools, which they can't afford themselves, and also help them put themselves on sounder economic basis. The others should be humoured support. I believe that it will pay the United States to follow British example:

ایوبؓ خان کا محدود جنگ کا نظریہ

۱۹۷۱ء میں ایک امریکی کرنل ہیتھ باٹملے نے اپنی زیرِ تصنیف کتاب کے لیے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سے امریکی پالیسی کے حوالے سے "محدود جنگ کے راہنما اصول" Maxims for limited war کے موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی تھی۔ ایوب خاں نے مختصر جواب دیا۔ انھوں نے جو راہنما اصول تجویز کیے تھے اُن پر امریکہ نے ویٹ نام میں عمل نہ کیا اور اسے ایوب خاں کی پیش گوئی کے مطابق ہزیمت و خفت سے دوچار ہونا پڑا جس کی مثال آج بھی دی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ایوب خاں کی تجویز کردہ حکمتِ عملی پر افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف اور ایران عراق جنگ کی وجہ سے خلیج میں جہاز رانی کے سلسلے میں امریکہ اب عمل پیرا ہے اور تا حال کامیاب ہے۔ یہ راہنما اصول آزاد اور آزادی پسند ماہرینِ حرب و ضرب کے لیے دل چسپی کا باعث ہو سکتے ہیں اور دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

ایوب خاں کے اس خط کا قلمی نسخہ پیش کیا جاتا ہے:

PRESIDENT'S HOUSE

Dear Colonel Heath Bottomley

please excuse delay in replying your letter of 12th December, which got mislaid in my papers.

The question you have raised "Maxims for Limited war" is so

۱۹۶۳ء میں صدر ایوب اپنے آبائی گاؤں ریحانہ میں اپنی والدہ کے ساتھ

خاتونِ اوّل زبیدہ خاتون

ایوانِ صدر میں ایک طرف سرکاری سطح پر مستحق افراد کی امداد کا سلسلہ جاری تھا اور دوسری طرف بیگم ایوب خان صاحبہ نے گھر پر نجی لنگر خانہ کھول رکھا تھا۔ غریب اور بے سہارا عورت ملک کے کسی حصّے سے آ جائے۔ جب تک چاہے بیگم صاحبہ کی مہمان بن کر رہے۔ افرادِ خانہ کو بیگم صاحبہ کی طرف سے ہدایت تھی کہ گھر میں اس قسم کی مہمان عورت یا نوکرانی کو اُس کے نام سے یا مائی کہہ کر نہ پکارا جائے بلکہ ماسی (خالہ) کہا جائے۔ یوں ایوانِ صدر میں بیک وقت کئی ماسیاں مقیم رہتیں۔ بیگم صاحبہ ان کی باتیں بڑی توجہ سے سنتیں اور ماسیاں کپڑے اور نقد رقم لے کر دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوتیں۔ اگر کسی ماسی کے لیے زیادہ رقم کی ضرورت محسوس کرتیں تو پریذیڈنٹ ایوب خاں کے نوٹس میں لاتیں اور مجھے پریذیڈنٹ صاحب سے حکم ملتا کہ فلاں ماسی کے لیے اتنی رقم فنڈ میں سے لے کر آؤ۔ میں پانچ ہزار روپیہ تک ہر وقت اپنے سیف میں رکھتا تھا۔ زیادہ کی ضرورت ہوتی تو فوری طور پر بنک سے دستیاب ہو جاتا۔ ۱۹۶۸ء میں جب ایوب خان علیل ہو کر صاحبِ فراش ہوئے اور کافی عرصہ تک اُن سے ملاقات پر پابندی عائد تھی تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد سول سٹاف میں سے سب سے پہلے میری ملاقات اسی سلسلے میں ہوئی تھی اور تین ماسیوں کو ایک ہزار روپیہ فی ماسی دیا گیا تھا۔ بے سہارا اور غریب لڑکیوں کی شادی کروانا اور سارا خرچہ خود برداشت کرنا بیگم ایوب خان کا محبوب مشغلہ تھا۔

بیگم ایوب خان کو اللہ تعالیٰ نے بڑی خوبیوں سے نوازا ہے۔ ایوب خان نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اپنی شریکِ حیات کی صلاحیتوں کا بھرپور اعتراف کیا ہے۔ بیگم صاحبہ کا نام زبیدہ خاتون ہے۔ ایوب خان انہیں خاتون کہہ کر پکارتے

خاتون اول بہت سادہ طبیعت ہونے کی وجہ سے پبلسٹی کو قطعاً ناپسند کرتی تھیں۔ سرکاری فوٹوگرافر میاں ظہورالدین کو ہدایت تھی کہ کسی بھی فنکشن میں بیگم صاحبہ کی تصویر بغیر ان کی پیشگی اجازت اور رضامندی حاصل کیے ہرگز نہ اتارے۔ ایوب خان کی بڑی بیٹی بیگم نسیم اورنگ زیب عام طور پر بیرون ملک دوروں میں اپنی والدہ کی نمائندگی کیا کرتیں۔ بیگم صاحبہ جنہیں اُن کے بچے اور سٹاف میں سے اُن کے قریب رہنے والے ماں جی کہہ کر مخاطب کرتے عام طور پر سفید لباس زیب تن کرتیں اور سر ہمیشہ دوپٹہ سے ڈھکا رہتا۔
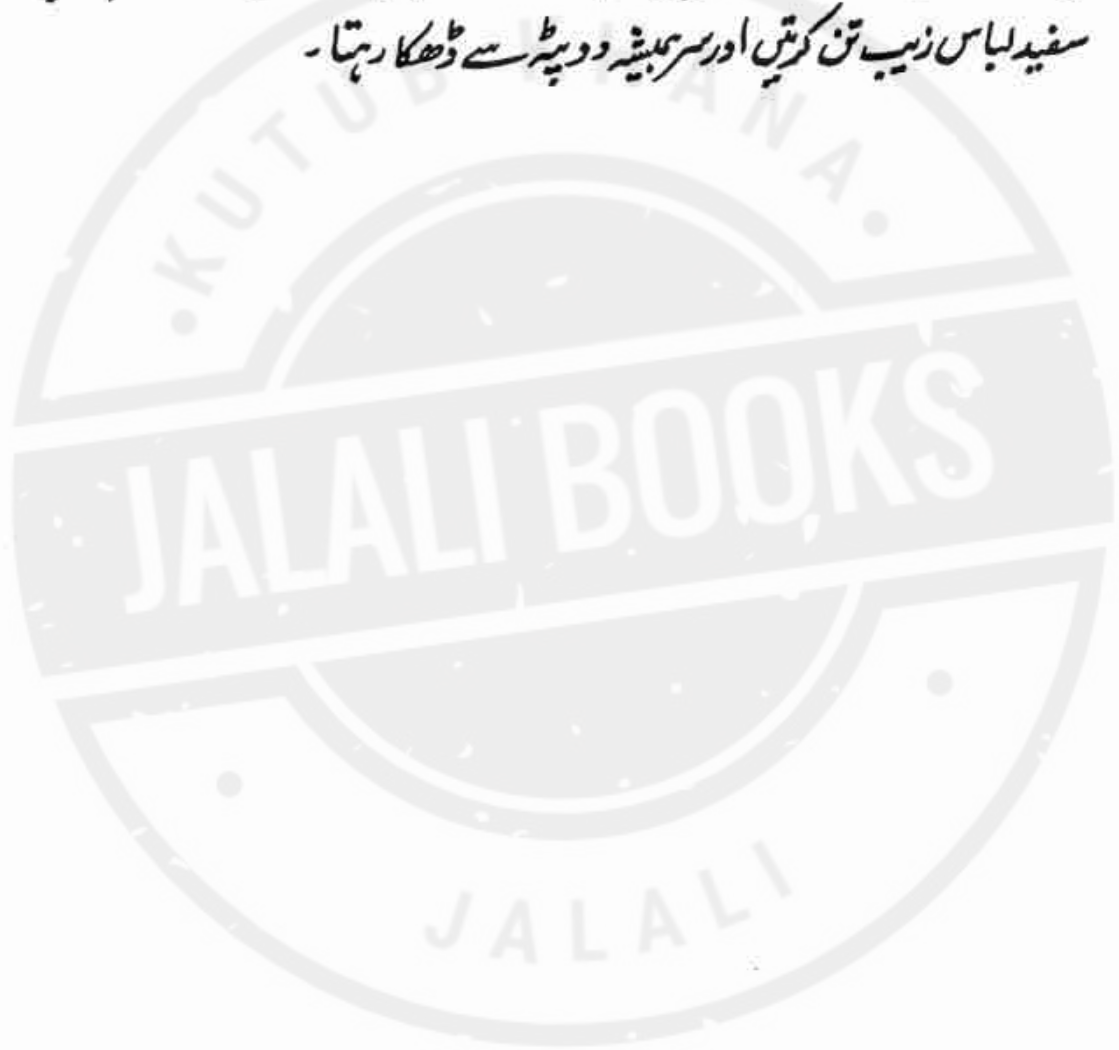
ایوانِ صدر میں ادیب

قدرت اللہ شہاب ایوانِ صدر میں غلام محمد کے آخری ایام میں تشریف لائے تھے۔ تین برسوں پر محیط دورِ سکندری کے بعد ایوب خاں مارشل لا کے ساتھ تشریف لائے تو ایوانِ صدر میں ایک دوسرے ادیب کا اضافہ ہوا۔ یہ ادیب، شاعر اور کالم نویس جمیل الدین عالی تھے۔ جن کا تقرر قدرت اللہ شہاب کی سفارش پر افسر بکارِ خاص کے طور پر ہوا۔ عالی صاحب کے لیے ایوانِ صدر میں بیٹھنے کے لیے کوئی الگ کمرہ مختص نہ کیا گیا اور نہ ہی باوجود سراغ رسانی کے یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کارِ خاص کیا ہے جس کے لیے عالی صاحب افسر ہیں۔ عالی صاحب جنہیں شہاب صاحب کے پی اے اور چپڑاسی جنابِ عالی کہا کرتے تھے سارا وقت قدرت اللہ شہاب کے سامنے بیٹھے بیٹھے گزار دیتے اور شہاب صاحب کو بھی اپنی طبعی وضع داری سے مجبوراً عالی صاحب کے ساتھ گزارنا پڑتا۔ ہمیں شہاب پر بڑا ترس آتا اور ان کی بخشش کی دعائیں مانگتے مگر شہاب صاحب کے ساتھ از ناست کہ بر ماست والی بات تھی۔ دو ادیبوں کا ایک کمرے میں سارا سارا دن بیٹھے رہنا۔ اس کا کچھ نتیجہ تو نکلنا تھا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ پیدا ہو گیا۔ البتہ تہمت سے بچنے کی خاطر انہوں نے کچھ اور ادیبوں کے اسمائے گرامی کو ممبرانِ اساسی یعنی Founding Fathers کی فہرست میں شامل کر لیا۔

جناب عالی شہاب صاحب سے گفتگو کے دوران ایوب خان کا ذکر باشا (بادشاہ) کہہ کر کرتے تھے۔ مہینہ میں ایک آدھ مرتبہ جناب عالی کی رپورٹ صدر صاحب کی خدمت میں شہاب صاحب کی معرفت پیش ہوتی جس میں اپنی کارکردگی بتائی جاتی کہ انہوں نے اس دوران معاشرے کے فلاں فلاں طبقوں سے تعلق رکھنے والے فلاں فلاں

سے مل کر فلاں فلاں امور پر بات چیت کی اور فلاں فلاں کام کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں دارالحکومت کراچی سے راولپنڈی منتقل ہوا تو عالی صاحب نے کراچی میں قیام کو ترجیح دی۔ بعد میں وہیں سے اپنی رپورٹ راولپنڈی بھیجتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد عالی صاحب کا تعلق ایوانِ صدر سے منقطع ہو گیا اور وہ اپنے پرانے محکمے انکم ٹیکس میں چلے گئے۔ جہاں سے نیشنل بنک میں تشریف لے گئے اور آج کل سینئر وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ اُن کی جگہ ایوانِ صدر راولپنڈی میں ایک دوسرے ادیب تشریف لائے۔ یہ دوسرے مگر تسلسل کے حساب سے تیسرے ادیب ممتاز مفتی تھے۔ اُن کی تصنیف علی پور کا ایلی جو اُن کی نامکمل خود نوشت سوانح حیات ہے۔ جوش ملیح آبادی کی سوانح حیات یادوں کی بارات کی ہم پلہ ہے۔ وزن کے لحاظ سے بھی اور مندرجات کے اعتبار سے بھی۔ جس نے علی پور کا ایلی پڑھ لی وہ یادوں کی برات پر وقت ضائع نہ کرے۔ جس کی نظروں سے یادوں کی برات گزر چکی ہو وہ بے شک علی پور کے ایلی کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ اصل میں دونوں ایک ہیں۔

مفتی صاحب کیلئے بھی ایوانِ صدر میں الگ کمرہ مختص نہ ہو سکا اور نہ ہی اُن کے کارِ خاص کا کوئی سر پیر مل سکا۔ عالی صاحب کے برعکس مفتی صاحب میں عجز و انکساری تھی۔ انہیں شہاب کے کمرے میں با ادب با ملاحظہ ہوشیار بن کر بیٹھنے سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ ان کی درخواست پر ایک بڑا کمرہ جو پہلے ہی دو حصوں میں منقسم تھا اور جس میں پریذیڈنٹ کے اسسٹنٹ پی آر او درانی اور میں بیٹھا کرتے تھے ایک تیسری میز مفتی صاحب کے لیے بچھا دی گئی اور اتمام حجت کے طور پر میز پر قلم دوات کاغذ پنسل سج گئے۔ اب ایک ہی کمرے میں چوبی پردوں کی اوٹ میں تین افراد براجمان تھے۔ ایک ادیب، ایک مدیر اور ایک یہ حقیر۔ چائے کے وقت خوب محفل جمتی۔ ہر چھوٹے بڑے معاملے پر مفتی صاحب اپنے نپے تلے جملوں میں اور حتمی انداز میں اپنی ''آخری'' رائے پیش کرتے۔ درانی مفتی کے فتوے کی کبھی تصدیق اور کبھی تکذیب کرتے۔ میں ملا نصرالدین کی طرح دونوں کے ساتھ اتفاق کر لیتا۔

شہاب صاحب کی ٹرانسفر کا فیصلہ ہو گیا تو مفتی صاحب کے لیے ایوانِ صدر میں دلچسپی ختم ہو گئی اور وہ شہاب صاحب سے پہلے رخصت ہو گئے۔ بعد میں ان کی مشہور کتاب بلیک نے انہیں قدرت اللہ شہاب کے اعزازی پی آر او کا خطاب دلوایا۔ مفتی صاحب اب ڈاکٹر (ہومیو) ممتاز مفتی ہیں۔ اردو ادب کی خدمات جلیلہ کے عوض حاکمانِ وقت سے تمغۂ امتیاز کے مستحق ٹھہرائے گئے ہیں۔
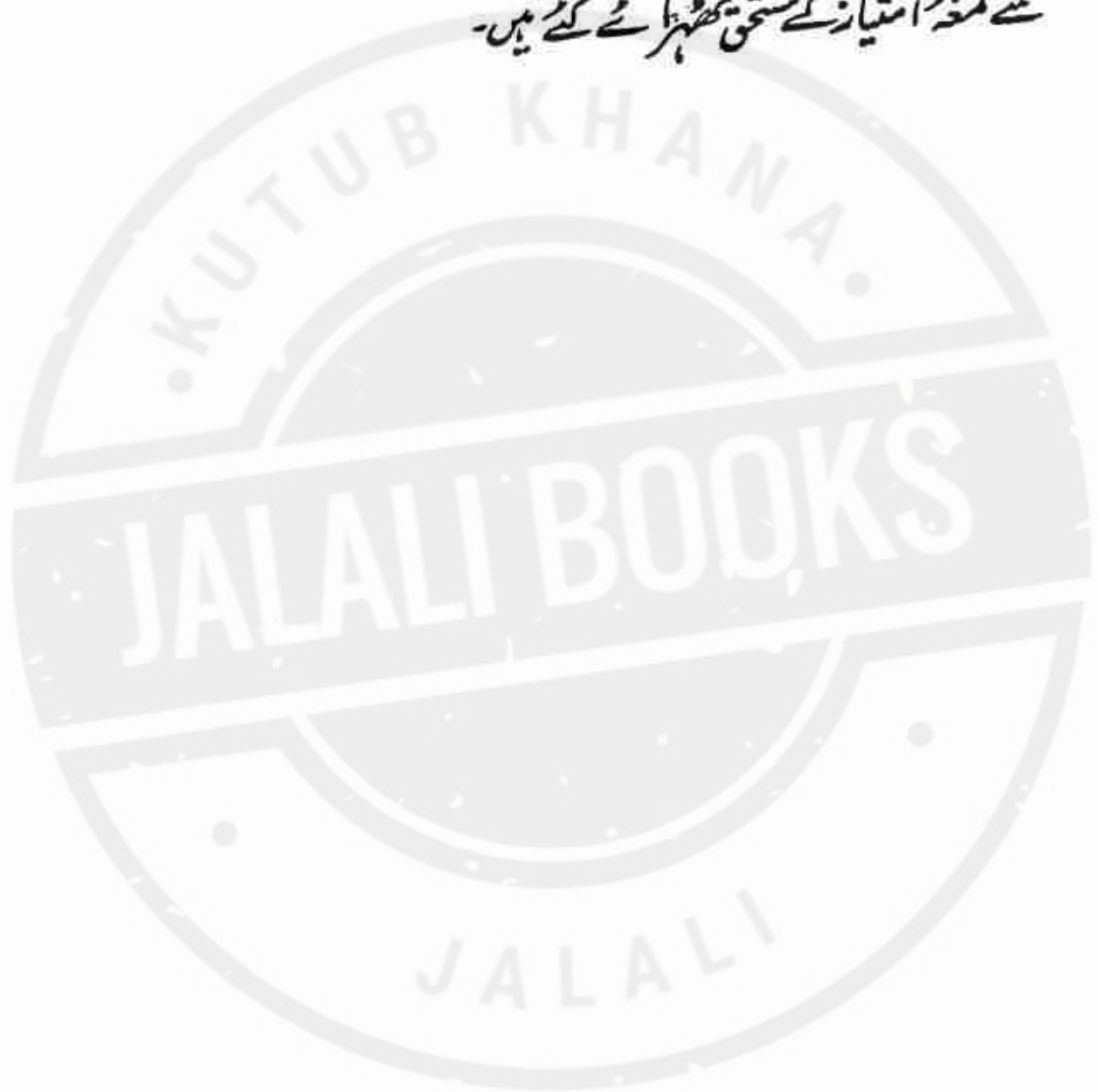
ایوب خاں دستور پر دستخط کر رہے ہیں منظور قادر داد طلب نظروں سے
ان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

جامعہ تعلیمات اسلامیہ کراچی کا سنگ بنیاد رکھنے کے موقع پر سفیر عراق عبدالقادر جیلانی
نواب امیر محمد خاں، صدر ایوب، آزاد بن حیدر اور مولانا عبدالماجد بدایونی

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی

بنیادی جمہوریت کے نظام اور دیگر اصلاحات کی مناسب تعبیر و تشہیر اور قومی یکجہتی کو سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع ابلاغ کی مدد سے فروغ دینے کے لیے فیلڈ مارشل ایوب خاں نے وزارت اطلاعات و نشریات سے منسلک ایک نیا ادارہ بیورو آف نیشنل ریکنسٹرکشن (ادارہ برائے قومی تعمیر نو) قائم کیا جس کے سربراہ بریگیڈیئر الیف آر خاں مقرر ہوئے۔ یہ ادارہ انہی خطوط پر استوار کیا گیا جن پر مصر میں شاہ فاروق کا تختہ الٹنے کے بعد انوار السادات کی سربراہی میں ایک الگ وزارت منسٹری آف نیشنل گائیڈنس قائم کی گئی تھی۔ ۱۹۶۲ء میں نئے آئین کے تحت صدارتی نظامِ حکومت کا اجراء ہوا تو رائے عامہ میں اسے مقبول بنانے کی ذمہ داری اس ادارے کو سونپی گئی۔ بنیادی جمہوریت کے نظام کو متعارف کرانے کے لیے سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ کا نقارہ بجایا گیا تھا۔ نئے آئین کے اجراء کے سلسلے میں بھی فکرِ اقبال سے استفادہ کیا گیا اور

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

سے مہم کا آغاز ہوا۔ پارلیمانی نظامِ حکومت کی مذمت اور صدارتی نظام کی حمایت میں ان اشعار کو سلوگن بنایا گیا۔

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

مختصراً یہ کہ پورا کلام اقبال اردو اور فارسی کو کھنگال کر علامہ علیہ الرحمۃ کو حسب منشا مختلف نسخوں میں خوشبو کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش ہوئی۔ حضرت قائد اعظم کی دستاویزات اس وقت خوش قسمتی سے مولوی شمس الحسن کی تحویل میں بوریوں میں بند تھیں۔ اس لیے ان بزرگوں کی دست برد سے محفوظ رہیں ورنہ وہاں سے بھی کوئی کام کا جملہ ہتھے چڑھ سکتا تھا۔ پرانے سیاست دانوں کی کردار کشی کے پس پردہ پرانی سیاست گری خوار ہے۔ ادارے کے بنیادی اغراض و مقاصد کی تکمیل میں خشت اوّل قرار پائی۔

منصوبہ بندی کے مطابق اہل فکر و دانش میں سے ادیبوں صحافیوں اور کالم نویسوں سے کام لینا شامل نصاب ہوا۔ معاونین کی فہرستیں تیار ہوئیں۔ صحافیوں اور کالم نویسوں سے رابطہ قائم کر کے اُن سے خصوصی موضوعات پر مضامین لکھوانا اور انہیں حق خدمت ادا کرنا بریگیڈیر الیف آر خان نے اپنے ذمہ لیا اور شاعروں ادیبوں سے کام لینا ایوان صدر میں قدرت اللہ شہاب کے سپرد ہوا۔

اس مقصد کے لیے بریگیڈیر الیف آر خان کے تصرف میں خصوصی گرانٹ دی گئی مگر شاعروں اور ادیبوں کے لیے جن میں تقریباً سب کا تعلق پاکستان رائٹرز گلڈ سے تھا کوئی الگ گرانٹ نہ لی گئی بلکہ طے پایا کہ ان اہل قلم کو نذرانے کی ادائیگی صدر پاکستان کے اس رفاہی فنڈ (پریذیڈنٹس ویلفیئر فنڈ) سے ہوگی جو غریبوں یتیموں اور بیواؤں کے لیے اُس رقم سے قائم کیا گیا تھا جو ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے نفاذ سے پہلے ملک فیروز خاں نون اور نواب مظفر علی خاں قزلباش کے پاس ریپبلکن پارٹی الیکشن فنڈ کے نام سے جمع تھی۔

یہ رفاہی فنڈ سرکاری آڈٹ سے مستثنیٰ تھا۔ بریگیڈیر الیف آر خان کے تصرف میں خصوصی گرانٹ، گرانٹ بھی آڈٹ سے مستثنیٰ قرار دی گئی۔

صدر کے رفاہی فنڈ کا چارج میرے پاس تھا۔ لہٰذا ادیبوں اور شاعروں کو حق خدمت ادا کرنے کا کام بھی میرے سپرد ہوا۔ یہ فریضہ میرے لیے ابتداً بڑا دلچسپ مگر بعد میں بڑا بیزار کن ثابت ہوا۔ جن حضرات کا کلام بلاغت نظام اور نگارشات

بڑھ کر وجد کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ ان سے روابط بڑھے تو تقدیر کا اصل رُخ سامنے آیا۔ اگرچہ یہ کوئی نیا تجربہ نہ تھا۔ اس سے پہلے ۱۹۶۰ء میں ایک معروف صحافی شاعر ادیب اور مذہبی و سیاسی شخصیت نے اپنے ہفتہ وار جریدہ کے لیے صرف ساٹھ ہزار روپے سکۂ رائج الوقت کے مفت نیوز پرنٹ کے عوض مذہبی و سیاسی جماعت سے علیحدگی اختیار کر کے خود کو حوالۂ سرکار کر دیا تھا۔ یہ کارنامہ نواب صاحب کالاباغ کے ہاتھوں سرانجام ہوا تھا۔

قلم کے خریدار اور قلم فروخت دونوں فریق خوب سمجھتے تھے کہ وہ کسی نئی روایت کو جنم نہیں دے رہے بلکہ ایسا ہوتا آیا ہے اور ایسا ہوتا رہے گا۔ ہر زمانے میں علم اور قلم بیچنے والے "کام لو دام دو" کی آواز لگاتے گلی گلی پھرتے ہیں۔ علم کی عظمت اور قلم کی حرمت کے پاسبان بھی ہر زمانے میں ہوتے ہیں مگر خال خال۔ ازل سے تا امروز شرار بولہبی سے چراغ مصطفوی ستیزہ کار رہا ہے۔

۱۹۶۲ء کی مہم میں شریک حضرات میں سے زیادہ تر اپنے دفتر اعمال کے ساتھ اللہ کے حضور پہنچ چکے ہیں۔ پھر بھی ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ ادب کے تقاضے پورے کر چکنے کے بعد جب ان کے اپنے تقاضہ کی باری آتی تو چیک کی بجائے کیش پر اصرار کرتے۔ ہم سمجھتے تھے کہ چیک سے گریز کس وجہ سے ہے۔ کچھ پردہ پوشی کے خیال سے اور کچھ تالیف القلوب کی خاطر ہم کیش ادا کر کے رسید لے لیتے۔ چند ایک بزرگ بہت دور اندیش تھے۔ ان کی خودی اتنی بلند تھی کہ مجھ جیسے چھوٹے موٹے افسر کو منہ لگانا عار سمجھتے تھے۔ وہ شہاب صاحب تک محدود رہتے اور مجھے شہاب صاحب کے کمرے میں جا کر حیلوں بہانوں سے نذرانے کی رسید لینا پڑتی۔

ایوانِ صدر میں جملہ اہلِ قلم حضرات کے اسمائے گرامی کو صیغۂ راز میں رکھنے کا پورا اہتمام تھا۔ چنانچہ جناب صدر، سیکرٹری قدرت اللہ شہاب اور میرے سوا صرف میرے کلرک اور سٹینو کو معلوم تھا۔

ادارہ قومی تعمیرِ نو میں صحافی اور کالم نویسوں کی فہرست سے ایوانِ صدر میں

شہاب صاحب ضرور واقف ہوں گے۔ مجھے اُن بزرگوں کے نام معلوم کرنے کا شوق تھا نہ تجسس۔ میرے اپنے فرائض ہی میرے لیے کافی اعصاب شکن تھے۔

بہرحال جب صاحبان اختیار کی دانست میں یہ جہاد بالقلم پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو ایوانِ صدر میں اس سلسلے کا سارا ریکارڈ جس میں خط و خطابت حساب کتاب رسیدیں حتیٰ کہ متعلقہ چیک بُک شامل تھیں تلف کر دیا گیا تاہم میں نے اپنے ذاتی تحفظ کی خاطر آدھے صفحے کا وُہ نوٹ جس کے ذریعے شہاب صاحب نے ریکارڈ تلف کرنے کے لیے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے احکام لیے تھے محفوظ کر لیا جو ایوانِ صدر کی کسی فائل میں اب بھی موجود ہو گا۔ میرے لیے یہ اشد ضروری تھا کیونکہ یہ سارا حساب کتاب فیلڈ مارشل صاحب، شہاب صاحب اور میرے درمیان تھا نیز یہ کہ شہاب صاحب ایوان صدر سے تبدیل ہو کر وزارتِ اطلاعات و نشریات کے سیکرٹری مقرر ہو گئے تھے اور میں نئے سیکرٹری ٹو پریزیڈنٹ کو جواب دہ ہونے والا تھا۔ وزارتِ اطلاعات میں اس ریکارڈ کے ساتھ کیا ہُوا مجھے اس کا علم نہیں۔ ممکن ہے اسے بھی تلف کر دیا گیا ہو۔ ریکارڈ کا تلف کرنا قلم اور علم کے ایک ملک التجار کی سفارش اور اصرار پر ہُوا تھا۔ کتنے بھلے لوگ تھے یہ سب کے سب۔ مطمئن تھے کہ سانپ بھی مارا اور لاٹھی بھی سلامت اور سب سے بڑی یہ خوشی کہ

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

ایوبؒ خان کا منشور

صدر ایوب خاں نے بنیادی جمہوریت کا اجراء ۱۹۵۹ء کے اواخر میں کر دیا تھا اور اس نظام کے تحت اسی ہزار نمائندوں کی بدولت ایوب خاں فروری ۱۹۶۰ء میں چار سال کے لیے صدر منتخب ہوئے۔ منتخب صدر کی حیثیت سے انھوں نے ملک کے لیے نیا آئین مرتب کرنے کی خاطر کمیشن قائم کیا۔ اس کمیشن کے تجویز کردہ آئین کا اعلان معہ چند ایک ترامیم کے یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو ہوا۔ اسی سال اپریل میں قومی اسمبلی اور مئی میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے اور قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس کا صدر ایوب نے ۸ جون ۱۹۶۲ء کو افتتاح کیا اور مارشل لاء اٹھا لیا گیا۔ اس تاریخی موقع کے لیے انھوں نے اپنی تقریر کی تیاری آئین کا اعلان کرنے کے ساتھ ہی شروع کر دی تھی جسے وہ اپنا منشور تصوّر کرتے تھے کیونکہ صدارتی نظام حکومت کے تحت وہ ملک کے سربراہ ہونے کے ساتھ حکومت کے سربراہ بھی تھے۔ منشور کا مسودہ انھوں نے چند دنوں میں تیار کر لیا۔ پہلے تین صفحات انھوں نے اپنے قلم سے لکھے تھے اور بقیہ صفحات کی اِملا dictation کروائی تھی۔ اُن کے تین صفحات میں سے دو صفحات اپنی اصلی شکل میں My Manifesto کے عنوان سے کتاب میں شامل ہیں۔

پورا مسودہ تیار ہو گیا تو پہلے اُن کے وزیر با تدبیر ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی نظر سے گزرا جنھوں نے پہلے صفحہ پر چند الفاظ بدلے اور آخر میں کچھ فقروں کا اضافہ کیا۔ اِس کے بعد صدر صاحب کے حکم کی تعمیل میں مسودہ ایک دُوسرے اور سینیئر وزیر با تدبیر جناب منظور قادر کو نظرِ ثانی کے لیے بھیجا گیا۔ انھوں نے

کافی کاٹ چھانٹ اور نوک پلک درست کی۔ ترمیم شدہ مسودہ Type ہوا اور صدر پاکستان نے ۸ جون کو قومی اسمبلی کی افتتاحی تقریب سے خطاب میں استعمال کیا۔

چودہ صفحات پر مشتمل یہ مسودہ جناب بھٹو اور جناب منظور قادر کی قلمی اصلاحات کے ساتھ میرے کاغذات میں موجود ہے اور قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔

کچھ ماہرین اور قیافہ شناس انسان کے چہرے کے خد و خال سے اُس کی شخصیت سے اندازہ لگا لیتے ہیں۔ کچھ دُوسری قسم کے ماہرین ایسے بھی ہوتے ہیں جو قلمی تحریر سے لکھنے والے کے دل و دماغ اور خصلت و عادات کا اندازہ لگانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ دونوں طرح کے ماہرین کے اندازے یا قیافے کسی حد تک درست ہو سکتے ہیں۔ البتہ جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ چہرہ اکثر دھوکا دے جاتا ہے اُس طرح تحریر سے دھوکا کھانے کا شکوہ بہت کم سننے میں آیا یعنی طرزِ تحریر سے قیافہ لگانا نہ اتنا مشکل ہوتا ہے اور نہ ہی بہت زیادہ غلط۔

جیسا کہ اُوپر ذکر کیا گیا ہے مذکورہ منشور کے قلمی نسخے کے پہلے دو صفحات "جوں کے توں" شاملِ کتاب ہیں جس کی مدد سے متعلقہ ماہرینِ طرزِ تحریر سے ایوب خاں کی شخصیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اصلاح شدہ مسودہ ایوب خاں کے علاوہ جنابِ ذوالفقار علی بھٹو اور جناب منظور قادر کی سوچ کا بھی پتہ دیتا ہے اور تینوں حضرات کے اپنے رویّے کافی حد تک بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

ایوب خاں موٹے قلم سے بڑے حروف میں لکھتے تھے۔ خط پختہ تھا اور پڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ نہ کسی لفظ کو کھاتے اور نہ مختصر کر کے لکھتے حتیٰ کہ فوج میں عام رواج کے برخلاف Situation report کو Sitrep نہیں بلکہ پورہ دو حروف کے ساتھ لکھتے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ وہ جلد باز تھے اور نہ ہی کسی کام کو ادھورا چھوڑنا چاہتے تھے۔ اُن کی سوچ صاف ستھری اور

دو ٹوک تھی۔ جو دل میں ہوتا وہ زبان پر بھی اور نوکِ قلم پر بھی۔ ظاہر و باطن میں تفاوت نہیں تھا اقبال کے اِس شعر کے مطابق۔

بر آور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے نالۂ آہِ فغانے

منظور قادر صاحب قانون دان تھے۔ الفاظ کے انتخاب میں احتیاط برتنا اُن کا شیوہ تھا مبادا فریق مخالف بات کو توڑ مروڑ اور سیاق و سباق سے ہٹا کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو کو صرف عوام کے جذبات سے سروکار تھا اور یہی اُن کا واحد ہتھیار تھا چنانچہ خوش نما اور خوش الفاظ میں سلوگن کا اضافہ کر سکے۔

ایک بات اور قابلِ غور ہے اور وہ یہ فیلڈ مارشل ایوب خاں اپنے مشیروں کے مشوروں کی قدر کرتے اور قبول کرتے۔ یہ اُن کی خوبی اور یہ انگی خرابی تھی۔ جسے اُن کے حلقہ بگوشوں نے اپنے مفاد میں استعمال کیا۔

میرا منشور

اب جب کہ آئین نافذ ہو چکا ہے اور عام انتخابات کے انتظامات مکمل کر دیے گئے ہیں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ قوم کے سامنے اپنا سیاسی منشور پیش کر دوں جس میں قومی تقاضوں کے مطابق ہمارے پروگرام کی عکاسی ہو اور جو ہم سب کے لیے بشمول امیدوار حضرات، ووٹ دہندگان اور میرے لیے بھی رہنما اصول فراہم کرے۔ چونکہ انتخابات امیدوار کے ذاتی میرٹ اور غیر جماعتی بنیادوں پر منعقد ہوں گے اسی لیے یہ منشور ووٹ دہندوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

۲۔ کوئی بھی منشور صرف اُسی صورت میں قابلِ عمل ہو سکتا ہے جب وہ زندگی کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہو اور مضبوط و کمزور سب عوامل کو مدِ نظر رکھ کر ترتیب دیا گیا ہو تاکہ مضبوط عوامل سے فائدہ اُٹھایا جائے اور کمزور عوامل پر قابو پایا جا سکے۔ کوئی قوم اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک سچے دل و دماغ سے صداقتوں کا صحیح ادراک اور اُن کی موجودگی کا اعتراف نہ کرلے۔ یہ حقیقت پسندی ہے اور اِسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ہمارے شاملِ حال رہے گی اور ہم اپنے مسائل خوش اسلوبی سے حل کر سکیں گے۔

۳۔ ایک نظریاتی مملکت ہوتے ہوئے ہمارا اوّلین فریضہ اسلامک آئیڈیالوجی کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری اور وابستگی ہے۔ یہی قیامِ پاکستان کی غرض و غایت تھی۔ اسلام ہی ہمارا مضبوط ترین حصار اور یکجہتی کا ضامن ہے۔ ہمیں وہ سب کچھ کرنا ہے جس سے ہمارے اِس اساسی نظریہ کو تقویت ملے اور اسلامی مساوات، اخوت اور

معاشی اور معاشرتی انصاف کی بدولت ہمارا اتحاد قائم و دائم رہے۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو سکے تو اس سے بڑی خدمت کیا ہو گی۔ تشکک اور عقل پرستی کے اِس دور میں ہم نے یہ ثابت کرکے دکھانا ہے کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ایک مکمل ضابطۂ حیات اور دُنیا و عاقبت میں فلاح کی ضمانت دیتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہم اِس ابدی حقیقت کو ثابت کرنے کے جس چیلنج کو ہم نے قبول کیا ہے ہم اِس سے عہدہ برآ ہونے کے اہل ہیں بشرطیکہ ہم دیانت و عدالت کا دامن تھامے رکھیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے اپنے درمیان غیر مسلم اقلیتوں کی بہبود کو بھی مدِنظر رکھنا ہے۔ آئین میں اقلیتوں کو مکمل تحفظ دیا گیا ہے اور ہم اس پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔

۴۔ ہمارا دُوسرا ہدف ملک کا جغرافیائی تحفظ اور استحکام ہے جسے ہم ایک لمحہ کے لیے بھی نظر انداز نہیں کر سکتے ورنہ ہماری ساری تگ و دو خدانخواستہ رائیگاں جائے گی۔

۵۔ جغرافیائی اعتبار سے ہم نازک صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ ہمارے چاروں طرف خطرات کے بادل منڈلاتے رہتے ہیں جن سے ہم بے خبر نہیں رہ سکتے۔ ملک کی دو حصوں میں تقسیم سے ہماری ذمہ داری دوچند ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ علاقائی اور لسانی عوامل بھی درپیش ہیں۔ چونکہ ہم تجدید و ترقی کے مراحل سے گزر رہے ہیں اس لیے ملکی وسائل کی باہمی تقسیم حریفانہ صورت اختیار کر سکتی ہے۔ ان سب عوامل کی موجودگی اور اہمیت کا ہمیں احساس ہے۔ اسی لیے ہم نے صوبائی حکومتوں کو نہ صرف امکانی حد تک خود مختاری دینے کی سعی کی ہے بلکہ مقامی انتظامیہ کو بھی ممکنہ حد تک مقامی مسائل کو حل کرنے کے اختیارات سونپ دیے ہیں۔ اگر ہم اِس امر کو ذہن نشین رکھیں کہ ہم سب پاکستانی ہیں اور ہماری منزل ایک ہے تو اختیارات کی یہ تقسیم کسی مشکلات کا موجب نہیں بن سکتی کیونکہ نفاق کی صورت میں ہم اپنی آزادی کا تحفظ نہیں کر سکیں گے اور فوجی نکتہ نگاہ سے داخلی

نقصان خارجی ہزیمت کا موجب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ اشد ضروری ہے کہ ہم صوبائی اور علاقائی مفاد کو اس حد تک نہ لے جائیں جہاں سے ملکی دفاع اور استحکام کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

۶۔ میں قومی سالمیت اور یک جہتی پر اس لیے زور دیتا ہوں کیونکہ بدقسمتی سے ہمارے درمیان ایسے ملک دشمن عناصر موجود ہیں جو افراتفری اور بے چینی پھیلا کر اپنا اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتے ہیں اور یوں ہمارے دشمنوں کا آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ اُن کا پہلا ہدف مشرقی پاکستان ہے جہاں وہ فرضی اور من گھڑت شکایتوں اور رنجشوں کے ذریعہ غریب عوام کو گمراہ کر کے اُنھیں اپنے حقیقی مسائل سے بے خبر رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اُن کے گھناؤنے کردار کو بے نقاب کرنا اور اُن کے مذموم عزائم کو ناکام بنانا ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان دراصل یک جہتی کی بنا پر ہی آزاد و خود مختار رہ سکتے ہیں۔ نفاق اور بے اعتمادی کی فضا شکست و ہزیمت کا باعث بن سکتی ہے اور پستی کی طرف سالوں کا سفر مہینوں میں طے ہو کر غلامی و بدحالی پر منتج ہوتا ہے۔ اس لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم ہوشیار رہیں اور قومی سالمیت اور یک جہتی کو دُوسری باتوں پر ترجیح دیں۔

۷۔ اتحاد اور تنظیم کا بار بار ذکر کرنا میرے لیے ناگزیر ہے اور اس کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوتی۔ اتحاد اور تنظیم یا نظم کی ہمیں آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ اُس وقت تھی جب حضرت قائداعظم نے ہمیں یہ سلوگن دیا تھا۔ اس سلوگن کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہمارے لیے بے حد ضروری ہے۔

۸۔ اپنی نظریاتی اساس کے دفاع اور استحکام کے ساتھ ساتھ ہمیں مادی ترقی کی طرف بھی بھرپور توجہ دینی ہے۔ عام آدمی کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی خاطر ضروری ہے کہ تمام تر قومی وسائل کو بروئے کار لائیں اور تعمیر و ترقی کے ہمہ جہتی منصوبے پر عمل پیرا ہوں۔

۹۔ ہماری داخلی خوشحالی سے ہی بیرونِ ملک ہمارے وقار میں اضافہ ہوگا۔

مغرب و مشرق کی ترقی یافتہ قوموں نے اگرچہ خلائی تسخیر تک میں خاطر خواہ کامیابیاں حاصل کر لی ہیں مگر ابھی تک وُہ اپنے جبلی رجحانات پر قابو پانے میں ناکام رہی ہیں۔ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا اصول آج بھی کارفرما ہے۔ فرد ہو یا قوم اگر کمزور و ناتواں ہے تو زیادہ سے زیادہ رحم کا حقدار ہوگا عزّت و وقار کا نہیں۔ طاقت کے نشے میں مخمور اقوام کمزور و ناتواں قوم سے فقط گدائی اور سپردگی کا تقاضہ کرتی ہیں۔

۱۰۔ اگر غیروں کی نظروں میں ہمیں عزّت و وقار حاصل کرنا ہے تو پہلے اپنے گھر کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ دُور رس اور انقلابی اصلاحات کے ذریعہ ہمیں وُہ بنیاد فراہم کرنی ہے جس پر سماجی انصاف کی عمارت کھڑی ہو سکے۔ گزشتہ صدیوں کے جمود اور تن آسانی کو خیرباد کہیں، فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس کریں، مایوسی اور قنوطیت کی جگہ امید و رجا کا دامن تھامیں، امیر اور غریب کے درمیان فاصلے کم ہوں، خودغرضی کی جگہ باہمی خیرخواہی اور اعتماد کے جذبات پیدا ہوں اور ہر چھوٹے بڑے کے لیے ایک جیسے مواقع فراہم ہوں۔ میں خیال و خواب کی باتیں نہیں کرتا بلکہ یہ وُہ خصوصیات ہیں جو اس دورِ کشمکش میں ایک صحت مند معاشرے کے لیے لازم اور ناگزیر ہیں۔

۱۱۔ خوش قسمتی سے ہمارے عوام کو قدرت نے وُہ ساری خوبیاں عطا کر رکھی ہیں جو کسی بھی زندہ و بیدار قوم میں ہو سکتی ہیں۔ ضرورت صرف ایک ایسے آئینی طریق کار کی ہے جس کے ذریعہ ان خوبیوں کو تعمیر و ترقی کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس کا انحصار ہماری طرزِ سیاست پر بھی ہے۔ ہمارے ماضی نے ہمیں جو سبق سکھائے ہیں ہمیں بھولنا نہیں چاہئیں۔ پرانے اور فرسودہ طور طریقوں کو چھوڑ کر ہمیں نئی، آسان اور محفوظ راہیں تلاش کرنی ہیں۔

۱۲۔ جمہوریت ہماری سیاست کا محور ہے۔ اسلام سے ہمیں اخوت، مساوات اور مشاورت کا درس ملتا ہے۔ لہٰذا جمہوریت ہمارے ایمان ہی کا جزو ہے۔ سماجی، تعلیمی اور زرعی اصلاحات نے ہمارے لیے عملی جمہوریت کا راستہ متعین کر دیا ہے۔ صنعتی ترقی سے اسے مزید نکھار ملے گا۔ بنیادی جمہوریت کا ادارہ اسی غرض سے

قائم کیا گیا ہے تاکہ عوام الناس ہر سطح پر جوش و جذبے کے ساتھ کاروبارِ حکومت میں برابر کے شریک ہوں، جماعتی گروہ بندی سے معاشرہ پاک ہو۔ جیسے جیسے ہمارا قومی کردار مستحکم ہوتا جائے گا مجھے اُمید ہے انشاءاللہ بنیادی جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہوتی جائیں گی۔ آئین، جس کی بنیاد فلسفیانہ موشگافیوں کی بجائے عملی اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ ایک بھرپور اور متوازن سیاسی زندگی کی اساس فراہم کرتا ہے۔

۱۲۔ ہم آئین میں نیک نیتی اور پورے خلوص کے ساتھ عمل کرنے کے خواہشمند ہیں تاکہ نافذ شدہ اصلاحات مستحکم ہوں۔ جن شعبوں میں مزید اصلاحات کی گنجائش اور ضرورت محسوس ہو وہاں آپس میں صلاح مشورے کے ساتھ غور و خوض کر کے اپنے اور آیندہ نسلوں کے لیے ایک خوشگوار اور خوشحال زندگی کا سامان پیدا کریں۔

حصولِ مقاصد کے لیے وسائل

۱۳۔ ہمارا آئین ہمارے مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کا سب سے مؤثر وسیلہ ہے۔ اس میں ہمارے سارے مسائل کا حل امکانی حد تک موجود ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ نے بغور آئین کا مطالعہ کر لیا ہوگا اور مجھ سے متفق ہوں گے۔ آیئے اب اِس پر عمل کرنا شروع کر دیں۔

۱۴۔ ہمارا دُوسرا اثاثہ عوام ہیں۔ بنیادی جمہوریت، صنعتی، معاشی، زرعی، سماجی اور دُوسری اصلاحات سے ہمارے لیے ترقی کی راہیں کھل گئی ہیں۔ ہمیں اپنی کوششوں کو جاری رکھنا ہے۔

۱۵۔ عوام ہی سے ہمیں ہمارا ذمہ دار طبقہ میسر آتا ہے۔ میری مراد دانشور حضرات اور اسمبلیوں کے متوقع اراکین سے ہے۔ اس طبقہ پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے انھیں اپنے اپنے شعبہ ہائے زندگی میں حب الوطنی، نظم و ضبط،

دیانتداری، کفایت شعاری اور جدوجہد کی مثالیں قائم کرنا ہیں۔ دانشور طبقہ ہمیشہ سے آزادیٔ اظہار کا علمبردار رہا ہے۔ یہ اُن کا حق ہے البتہ یہ آزادی حدود سے تجاوز نہیں کرنی چاہیئے۔ کسی بھی ترقی پذیر معاشرہ میں رائے عامہ اُس طبقہ کے ذریعہ بنتی یا بگڑتی ہے جو سوچ سکے بول سکے اور لکھ سکے۔ تنقید اگر تعمیری ہو تو اصلاحِ احوال کا باعث بنتی ہے۔ ملک میں تعمیر و ترقی کے مواقع میں جتنا اضافہ ہوتا جائے گا دانشور طبقہ کی ذمہ داریوں میں اُسی قدر اضافہ ہوتا جائیگا۔ اِس کے بغیر معاشرتی ترقی ممکن نہیں ہوتی۔

اسمبلیوں کی ذمہ داری اور بھی کٹھن ہوگی۔ اُن پر کسی سیاسی جماعت کا دباؤ نہیں۔ اُنھیں اپنے ذاتی کردار کی بنا پر آگے آنا ہے اور خدمتِ خلق سے مخلوقِ خدا کے دلوں میں جگہ بنانی ہے۔ انتخابات جس سسٹم کے تحت منعقد ہونے والے ہیں اُس میں ووٹ نوٹ سے نہیں بلکہ صدق و سچائی کے سکّہ سے خریدا جائے گا۔ دولت کی بجائے دیانت اور سیاسی وابستگی کی بجائے عوامی وابستگی کام آئے گی۔ برائے مہربانی پبلک کے اعتماد کو بکاؤ مال نہ سمجھیں۔ ایک ذمہ دار شخص کی نگرانی میں ایک ہی بیلٹ بکس میں پرچی ڈالی جائے گی اس لیے اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہوگی کہ نوٹ نے ہی ووٹ خرید لیا ہے۔ ہاں اُمیدوار کو ہر قسم کی سہولت مہیا کی جائے گی کہ ووٹنگ سے پہلے اپنا پورا تعارف کرا سکے۔ اِن حالات میں اگر انسانی سوجھ بوجھ پر اعتماد کیا گیا تو خاطر خواہ اور مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔ اگر آپ صحیح آدمی ہیں تو ضرور کامیاب ہونگے۔

آپ میں سے جو کامیاب ہوگا اُسے وفاقی یا صوبائی اسمبلی میں اپنی نشست پوری سنجیدگی سے سنبھالنا ہوگی۔ نئے آئین کے محافظ اور نئے دَور کے معمار کی حیثیت سے آپ ایک ایسے نظامِ حکومت کے علمبردار ہوں گے جسے ایک ترقی پذیر ملک پاکستان کے گوناگوں مسائل کا سامنا ہوگا جنھیں حل کرنے کی کٹھن ذمہ داری آپ کے شانوں پر ہوگی۔ یعنی

- آپ نے اسلامک آئیڈیالوجی کو مضبوط اور مستحکم کرنا ہے۔
- آپ نے اسلامی نظام حیات اور نظام حکومت کی آبیاری کرنی ہے۔
- آپ نے بکھرے عناصر میں بھی اتحاد کی فضا کو برقرار رکھنا ہے۔
- آپ نے ناقابلِ تسخیر دفاعی قوت، صاف ستھری انتظامیہ اور سستے اور آسان انصاف کے حصول میں مدد کرنا ہے۔
- آپ نے معاشی کشمکش اور ذاتی مفاد کے حامل افراد کی طرف سے مخالفت کے باوجود دوررس اصلاحات نافذ کرنی ہیں۔
- آپ نے ہر قسم کے خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہے۔
- آپ نے کشمیر کے مسئلہ کو حل کرنے کی ہر ممکن سعی کرنی ہے آپ نے تعمیر و ترقی کے عظیم منصوبے تیار کر کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہونا ہے۔
- آپ نے یہ سب کام بلکہ اس سے بھی اہم کارنامے انجام دینے ہیں۔

اس لیے آپ نے مسلسل اور انتھک محنت اور جدوجہد کرتے رہنا ہے۔

۱۶۔ایک بات بنیادی جمہوریت کے اراکین سے بھی اپنی پسند کے افراد کو منتخب کریں یعنی صرف اُن افراد کو جو مندرجہ بالا کارنامے سرانجام دینے کے اہل ہوں بلکہ ان سے بھی بڑے کارنامے انجام دے سکتے ہوں۔ دُنیا بھر کی نظریں آپ پر لگی ہیں۔ کسی بھی امیدوار کو پرکھنے کا ایک ہی پیمانہ ہوگا: امیدوار کی ذاتی صلاحیت، آپ کے ووٹ کی قیمت پاکستان سے محبت، پاکستان کی خدمت اور پاکستان کی عظمت ہے۔ آپ نے ثابت کرنا ہے کہ ضمیر کو نہ تو خریدا جاسکتا ہے اور نہ ہی خوف زدہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے یہ بھی ثابت کرنا ہے کہ آپ کو اسی ہزار کی برادری جس میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہے گا باقی ماندہ پاکستانیوں سے علیحدہ نہیں ہے بلکہ انھی کا حصہ ہے۔ اپنے حلقہ انتخاب کو ہی خدمت کا ۔۔رنہ سمجھیں بلکہ پورا ملک آپ کی خدمت کا مستحق ہے اور یہ بڑی اہم ذمہ داری ہے۔

یہاں میں یہ واضح کردوں کہ میری اپنی نہ کوئی سیاسی جماعت ہے اور نہ ہی

میں کوئی سیاسی جماعت تشکیل دینا چاہتا ہوں تاہم میں ہر محب وطن کا ساتھی ہوں حتیٰ کہ جو مجھ سے کسی بات پر اختلاف بھی رکھتا ہو وُہ بھی مجھے اپنا حریف نہ سمجھے۔ دیانت داری پر مبنی اختلافِ رائے بالآخر اتفاق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ گروہ بندی اگر فطری جذبہ ہے تو اسے انسان دوستی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ ذاتی رویے یا نکتہ نگاہ میں چھوٹے موٹے اختلافات کے باوجود بھی ہم سب کا ایک ہی مشترکہ، غیر متغیر اور غیر متزلزل مقصد و مدعا ہے اور وُہ ہے پاکستان کی حفاظت ترقی اور خوشحالی اِسی جذبہ کا فروغ اور نشوونمامیری زندگی کا نصبُ العین ہے اور اس سلسلے میں آپ سب سے نیک تمناؤں اور تعاون کی درخواست کرتا ہوں۔

اگر اتنی سی بات ذہن نشین ہو جائے تو باقی تمام سرگرمیاں، مقامی وفاداریاں، علاقائی تقاضے، اقتصادی امنگیں، معاشی پروگرام اور مذہبی فرقہ بندی، سب کچھ قابلِ قبول ہوگا۔ اسمبلی کے اندر یا اسمبلی کے باہر ہر قسم کی گروہ بندی اُس پُرسکون دریا یا سرکش ندی نالے کی مانند ہے جو آخر کار اپنی سرزمین کو گل و گلزار میں تبدیل کر دیتی ہے ورنہ وہی پانی غلیظ جوہڑوں یا دلدل کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ میری آپ سے یہی درخواست ہے کہ سیاسی جماعتوں کی افادیت میں اِنھی باتوں کو اہمیت دیں۔

۱۸۔ میں یہ قطعی طور پر واضح کر دوں کہ میں وفاقی یا صوبائی اسمبلی کے کسی اُمیدوار کی حمایت یا طرفداری نہیں کرتا۔ اگر کوئی اُمیدوار میری حمایت کا دعویٰ کرتا ہے تو وُہ غلط بیانی کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اُسے حکومت کے کسی رکن یا ادارے کی حمایت حاصل ہے تو وُہ بھی غلط بیانی ہے۔ آپ ان دعوؤں پر توجہ نہ دیں۔ نمائندوں کا انتخاب ہر ووٹر کا اپنا استحقاق ہے اور اُسے پورا موقع فراہم کیا جائے کہ بغیر کسی مداخلت یا دباؤ کے آزادانہ ماحول میں اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق یہ حق استعمال کرے۔ بس میری ایک ہی خواہش ہے کہ اچھے اور محب وطن افراد کو ووٹ دیں۔

۱۹۔ آخر میں اپنے وزراء اور گورنر صاحبان کی پوزیشن کی وضاحت کردوں۔ اگر ان حضرات میں سے کوئی انتخابات میں حصّہ لینا چاہے گا تو اُسے یہ حق نہ ہوگا کہ اپنی سرکاری حیثیت کسی بھی صورت میں استعمال کرے۔ میں وزراء اور گورنر صاحبان کو ہدایات جاری کر رہا ہوں کہ اپنے کاغذاتِ نامزدگی داخل کرنے کے بعد اپنے حلقۂ انتخاب میں وہ صرف ایک عام شہری کی حیثیت سے جا سکیں گے اور کوئی سرکاری ادارہ یا اہلکار اُسے کسی بھی قسم کی وہ سہولت مہیا نہیں کرے گا جو مخالف امیدوار کو حاصل نہ ہو۔

مختصراً ہمیں اپنے قومی مقاصد کے بارے میں کوئی ابہام یا غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے مقاصد یہ ہیں:

- اسلامک آئیڈیالوجی سے غیر مشروط وفاداری۔
- پاکستان کا دفاع اور استحکام۔
- اتحاد اور نظم وضبط۔
- پاکستان کی مادی اور اقتصادی ترقی۔
- معاشی و معاشرتی عدل وانصاف۔
- سیاسی ثقافتی اور روحانی اقدار کا فروغ۔
- ترقی کے لیے برابر کے مواقع۔
- بیرونی دُنیا میں عزّت و وقار کا حصول۔
- مسئلہ کشمیر کا منصفانہ اور قابلِ قبول حل۔

مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے ہمارے پاس مندرجہ ذیل وسائل موجود ہیں۔

- ہمارا ایمان۔
- ہمارے عوام۔
- ہمارا آئین۔

- ہمارا دانشور طبقہ۔
- مضبوط اور مستحکم حکومت۔
- مضبوط دفاعی افواج۔
- صاف ستھری انتظامیہ اور عدلیہ
- خوفِ خدا، دیانت امانت اور خدمت کا جذبہ۔
- باہمی اتحاد اور انتھک محنت کرنے کا عزم۔

اِن مقاصد کو کامیاب بنانے کے لیے ہم سب کو مرد، عورت اور بچے، ووٹ لینے اور ووٹ دینے والا، لیڈر اور اُن کے حامی و پیروکار، اُستاد اور شاگرد، اہلِ قلم اور قاری، آجر اور اجیر، پیداواری ادارے اور صارفین، ایک ایک کو اپنی استطاعت تک پوری نیک نیتی اور تن دہی سے اپنا کردار ادا کرنا ہے۔

میں دل و جان سے اِس منشور کے ایک ایک لفظ کا پابند ہوں۔ اسی طرح۔ میرے عزیز ہم وطنو۔ آپ بھی عہد کریں۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی سُنّت کے مطابق یکسوئی اور عزم و ہمّت سے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

پاکستان پائندہ باد

Then there is also the unswerving resolve to settle Kashmir problem satisfactorily.

The ~~tools~~ implements for the achievement of these targets are: our Faith; the Constitution; responsive masses; responsible ~~classes~~ leadership; competent legislators; strong and stable Governments; powerful Defence Forces; clean and quick administration; cheap and ready justice; multi-dimensional programmes of development in education, industry, commerce, agriculture; control of population; individual and collective austerity, integrity, homogeniety; service of man; fear of God; and a relentless passion for work, ceaseless work, and nothing but work.

no account be allowed to suffer, I submit they

In the use of these ~~tools~~ implements for the achievements of our targets, all of us - every man, woman and child of Pakistan: the President, the voters and voted; the leaders and the led; the teachers and the taught; the writers and their readers; the speakers and their listeners, the preachers and their followers, buyers ~~and sellers~~; producers and consumers - all of us have got to share a full burden of responsibility to the last limit of our ability, integrity and endurance.

I pledge myself wholly and humbly to ~~[illegible]~~ every word of this manifesto. So might you, my dear countrymen and women. And may God grant us courage, conviction and dedication to live upto it within the framework of His Precepts and the example of His Holy Prophet (Peace be on him). ~~Ameen.~~ Finally, I give you a motto Service love and glory of Pakistan. Repeat it, remember it and practise it. If you do this, you will be able to think out and judge things correctly and you will reach your cherished goal quicker. Amen.

~~PAKISTAN PAINDABAD.~~

PAKISTAN PAINDABAD.

18. I would like to emphasise with an equal force that I have no candidate to project or support for the National or Provincial Assemblies. Whosoever makes such a claim is not telling the truth. Similarly, whosoever may claim that he or she has the backing of any other agent or agency of my Government is likewise ~~telling a lie~~ not right. Pay no heed to them. The choice of their representatives belongs entirely to the voters and they will be enabled to exercise their franchise in a free and unfettered manner. All I wish is that they will elect good and patriotic people.

19. Finally, let there be no misgiving about the position of my Ministers and Governors vis-a-vis the coming elections. Should any of them decide to stand for elections, the fact of their being a Minister or Governor shall not be allowed to confer any special advantage or privilege on them in respect of canvassing, electioneering and the like. As a matter of fact, I am going to enjoin that as soon as a sitting Minister or Governor files his nomination papers, he shall not visit his constituency except as an ordinary citizen. No official agency will be allowed to give him any more a facility than what is provided to any other candidate.

20. To sum up: Let us be in no doubt about our national targets. They are Islamic ideology; security; stability; unity; discipline; progress and prosperity at home; peace and prestige abroad; economic development; social reforms; social justice; equality of opportunities; and the reconstruction of a society which can sustain a workable pattern of democracy under the umbrella of enlightened moral, political, cultural and spiritual values.

17. I would like to take this opportunity to declare that I have no political party of my own ~~nor do I intend to form one~~. However, those that have belief in what I have said above can count me as one of them. Even those who may differ with me in certain principles or procedures need not necessarily consider me on the other side of a political cease-fire line. Honest differences of opinion are ~~in fact~~ often the base for honest agr-eements. ~~The herd instinct, which, we are told, is natural has got to be humanised.~~ Inspite of disparities in attitudes, outlooks, personal philosophies, or approach to various problems and their solution, I never forget - nor should you ever forget - that we, all of us, have one ~~inalienable, inescapable and~~ unfailing common ground - the protection, progress and prosperity of Pakistan. ~~It is this spirit of [illegible] over national issues that I am anxious to generate. In this mission, I solicit the~~ goodwill, understanding and co-operation of one and all, irrespective of whether we agree or disagree on ~~certain~~ methods or details. Once this is clear, all ~~other activities - political or otherwise~~ tendencies - based on local loyalties, parochial pressures, economic ambitions, social programmes, and religious concepts will ~~have a better chance of looking like reasonable and legitimate~~ fall into their proper perspective. ~~As a matter of fact~~, All such groupings and regroupings, both inside and outside the Legislatures, ought to run their course like tranquil rivers ~~or turbulent hill streams~~ to fill and feed the ultimate reservoir of national good. ~~Otherwise, they will just flow into a political wasteland of decay or stagnant marshes. It is in this context that I beg of you to examine the question.~~

settled.

~~You~~ They have to plan and promote gigantic programmes of multi-dimensional development to keep pace with the galloping rate of all-round human progress.

~~You~~ They have to do all this and a million more things.

For this ~~you~~ they will have to work, work, work———— and work.

16. Now, just one word to the electorate, ~~e.g.~~ i.e. the Basic Democrats: Choose as you like; but choose only those who can do all this and ~~much~~ more. The eyes of the nation and of the world are upon you. The trust that has been placed in you, is on trial ~~More than anybody else, you are on the bar of national~~ as well as international judgement.

There is only one yardstick in your hand to measure the worth of ~~every~~ a candidate: that is the yardstick of merit and merit alone.

You will take an oath — a very solemn oath — to choose honestly, without fear, without favour, & without regard to any personal gain. No promise given to any candidate can over-ride your oath.

There is only one price for your vote: that is ~~the~~ service, love and glory of Pakistan.

Let this not be said of you that conscience can succumb to temptation or truth coerced by fear.

Nor let it be said of you that you, a community of 80,000 - likely to multiply further in due course - are anxious to turn into a separate caste to the exclusion of the rest of the talent in the country. Your ~~span of choice~~ not be confined to yourselves. ~~must extend far beyond the limits of your own cadre so as to give a chance to as many more people to serve their country as possible.~~ In your ~~search for~~ choice of the right men and women to represent you in the National and Provincial Assemblies, ~~look into every nook and corner of the country and every sphere and strata of society, and~~ do not hesitate to vote for them if they do not belong to the "baradari" of Basic Democracies. This is most important.

polling booth under the supervision of a responsible person. The voter will ~~be free to vote according to his choice and~~ cast his ballot paper in that booth in conditions ensuring complete secrecy. There will be no guarantee (that any money paid to him has in effect ~~brought his vote~~ produced the desired result). The State has undertaken to provide ~~you all~~ the candidates with facilities to project ~~yourselves to your~~ themselves to the electors. ~~and~~ If human judgement is given a fair chance, it ~~cannot but~~ is likely to operate rightly and wisely. ~~If you are the right man, you will never be left out.~~

Those of ~~you~~ the candidates who are destined to emerge victorious should be prepared to take their seats in the National and the Provincial Assemblies with a solemn sense of history. As the custodians of a new Constitution and the architects of a new order, ~~you~~ they are going to be the pioneers of a system which may well hold the key to many problems plaguing the destinies of many newly emerging countries like Pakistan. The tasks which lie ahead of ~~you~~ them are truly onerous.

~~You~~ They have to cement and sustain the base of our Islamic ideology.

~~You~~ They have to breed and nurse a truly Islamic way of life and statecraft.

~~You~~ They have to weave unity out of diversity.

~~You~~ They have to help maintain strong and stable Governments; strong and perfectly equipped Armed Forces; clean and quick Administration; cheap and easy justice.

~~You~~ They have to induct far-reaching reforms in the teeth of social prejudices and powerful vested interests.

~~You~~ They have to keep a discerning finger on the pulse of our foreign relations and harmonise strategy with realism.

~~You~~ They have to live with dangers and overcome them.

They ... to see that Kashmir problem is suitably

~~intelligentsia and the would-be legislators~~. A heavy
of the would-be legislators and the intelligentsia
burden of responsibility devolves on the~~ir~~ shoulders.
As leaders of their respective lines, they have to set
worthwhile standards of patriotism, discipline, integrity,
austerity and hardwork.

The intelligentsia ~~in~~ in particular is always
jealous of its right of freedom of expression. This
freedom is entirely theirs. But let ~~us not allow it to~~ [handwritten insertion, illegible]
the whole sense of responsibility.
~~lapse into irresponsible licence~~. In any formative
society like ours, public opinion is ~~a~~ swayed by the
words and deeds of those who can think and write and
speak. Criticism is valuable, ~~only~~ if it is intended
~~Criticism is a valuable brake and corrective~~ -
to correct but not when it is calculated to destroy.
~~only if it corrects rather than distort, if it constructs~~
~~rather than destroy~~. As more and more opportunities of
work and service unfold themselves in the country, the
responsibility of the intelligentsia must also ~~has got to~~ increase.
~~in direct proportion with it. Without this, the very~~
~~backbone of our society will remain lopsided~~.

In the coming elections, those elected will
~~As regards the legislators, they~~ have to come up
the hard way. There is no party automaton to hawk them
about in a highly diffused political market. They have
to stand on their own merit, ~~as human beings rather than~~
~~as lamp posts advertised by political parties~~, and rise
by dint of their personal record of public service. ~~and~~
~~programmes. Under the system the coming elections are~~
~~going to be held~~, Integrity will buy more votes than
money, and patriotism will pay greater dividends than
anything else. Please, do not try to convert public
trust into a saleable commodity. In any case, it won't
work. There will be ~~as by deciding to have~~ only one ballot box in a

levels of governance in a sensible, understandable and workable fashion has been introduced. ~~Efforts are being made to do away with the regimentation and inhibitions imposed by the party system in the peculiar environments of our society.~~ As the national character solidifies, I have no doubt that the roots of ~~this system~~ these institutions will, Inshallah, become deeper and firmer. ~~Our~~ The new Constitution – a pragmatic rather than a dogmatic scheme – is designed to fulfil ~~this~~ this objective of inducing a sane and balanced political life in the country. We ought to give it,

~~12. Firstly, our objective is to give the Constitution~~ a fair trial, in order to consolidate the reforms already introduced, to plan, promote and implement still more ~~reforms wherever they are~~ due, ~~and~~ thus ~~lay~~ laying the foundations of a happier, healthier, easier, and richer life ~~and culture~~ for ourselves and for the generations to come.

<u>Means for the fulfilment of our objectives:</u>

13. The first and the foremost instrument available to us for the realisation of our objectives is the Constitution. It takes care of all our requirements of today, as far as humanly possible. I trust you have already studied this document. Now please get ready to work it.

14. Responsive masses are our second medium. The system of Basic Democracy, universalization of proper education, and all round developments in the industrial economic, agricultural, social and other spheres are already playing a visible role in generating a good sense of mass awakening. This must continue.

15. Responsible ~~elements~~ leadership come next. ~~They include the~~

to ~~of~~ their rights and ~~as well as~~ responsibilities, then cynicism is replaced by hope; the economic gulf between man and man is narrowed; selfishness, suspicion and greed are counter-balanced, ~~if not eliminated,~~ by a spirit of goodwill, trust, self-help and sacrifice; ~~and,~~ Above all, we have to create a climate ~~is able to emerge~~ in which there is free and uninhibited equality of opportunities for all in ~~each and~~ every walk of life. ~~This is by no means a Utopian dream. On the contrary, these are the normal attributes of a healthy, national character which seeks to hold its own in a very acute and competitive world,~~ A nation ~~which seeks to survive in the highly competitive world of today~~ must develop these attributes as a part of its national character if it wishes to survive in the highly competitive world of today.

11. ~~Our people are,~~ Fortunately, our people are endowed with all the qualities of head and heart which go to make a sound and sensible nation. All that they require is ~~an institutional~~ suitable ~~properly~~ adjusted institutions to release their creative energies effectively. ~~system which brings out the best in them in the right direction.~~ Much, therefore, depends on the shape of politics in the country. The past has taught us many ~~bitter lessons which we just cannot afford to repeat~~ our mistakes. We have to go off the beaten track and find a way which shows us صراط مستقیم in the light of our temperament and circumstances.

Democracy is, and has to be, the corner-stone of our political system. The spirit of equality, fraternity and mutual consultation which Islam enjoins upon us makes the essence of democracy an article of faith with us. ~~Spade work for raising~~ Foundation on which to build the structure of ~~a~~ democratic institutions that ~~we~~ might work, has already been laid in the shape of land reforms, and basic democracies. ~~practical democracy has already been started by way of social, educational and agrarian reforms. The pace of our industrialisation will broaden it further. The institutions of Basic Democracy have also been created to ensure full and free~~ To sustain the institution as educational & social reforms have made them [illegible] participation of people at all

1AN

~~8.~~ Unity and discipline are oft-repeated words, but they can never become time-worn nor do they lose the freshness of their appeal. Their need and significance today is as acute as when the Quaid-i-Azam gave us this slogan. It is for us now to try and live upto it.

4. ~~8.~~ Our third objective must be economic material advancement. On the base of our ideology, strengthened and butteressed by security, stability and unity, we have to build the edifice of material progress and prosperity. Alongside a sure and steady improvement in the condition of the common man, our target ~~is~~ must be to pool all private and public resources and harness them to implement a gigantic programme of multi-dimensional development in all spheres of our life.

~~9.~~ Progress ~~and~~ prosperity a strength at home is the surest and perhaps the only way to gain ~~peace and~~ prestige abroad, and to be left alone in peace. ~~This incredible age of speed, space and outer-space has, unfortunately, failed - for the present at least - to pull mankind out of some of its primitive passions and instincts. Might is still right and the survival of the fittest is still as an inexorable law of life and nature.~~ A weak nation, like a weak man, may invoke pity but ~~is entitled to~~ gains no respect. ~~And where nations are concerned~~ In the power-laden world of today, a nation which is pitied is not far off pity is just another name ~~for surrender and~~ from subjugation.

~~10.~~ In order to ~~word~~ achieve progress at home and ~~with~~ prestige abroad, we have to put our house in order first. ~~By~~ We have to undertake ~~undertaking~~ wide-scale and radical reforms. ~~We have to~~ evolve the base for a society in which there is social justice. We have to see that customs and attitudes inherited from the sloth and stagnation of past centuries are eradicated; that ~~we have to~~ the inertia of the masses is broken by a wide-spread awakening

linguistic pulls. The fact that we are engaged in developing our economy ~~and modernising~~ by itself leads to competitive bidding for resources, resulting in jealousies and friction, between different parts & regions. ~~All these things are with us and we cannot ignore them.~~ ~~It is in fact in their recognition that we have given the maximum autonomy to the Provinces and then decentralised provincial administration so that all regions have local satisfaction.~~ These factors ~~They~~ need not, however, prove dangerous if we constantly remember the fact that all of us in Pakistan have a common destiny. Together we shall be a force to reckon with and worthy of respect. Separated, there can be no other future for us except serfdom~~, and in military terms we shall be defeated and destroyed in detail~~. That being the case, it behoves us to desist from pushing Provincial and regional interests to the point that might jeopardise overall national unity, security and stability.

9. I am emphasizing this point because there are anti-Pakistan elements in the country who aim at disruption and subversion ~~submission~~ to suit their personal interests or to act as the tools of foreign interests hostile to Pakistan. Their first target appears to be East Pakistan and their modus operandi is to fan ~~local~~ real or fancied local grievances, confuse and mislead the people and confound real issues. Let us beware of them and their ~~nefarious~~ designs. ~~The truth of the matter is that~~ East Pakistan and West Pakistan can remain free and sovereign only if they remain together. Separated, it may be a matter of a few years if not a few months, before they disappear ~~into the sea of serfdom~~ disintegrate or are destroyed. ~~So, you can see how much is at stake to justify constant vigilance and endeavour on the part of all of us to keep in view the supreme need of unity and solidarity.~~

2 ~~1.~~ Being an ideological State, our first objective must be to adhere unflinchingly ~~and relentlessly~~ to our ideology, the ideology of Islam. It is for this that we demanded and attained Pakistan ~~and obtained it~~. It is the source of our strength and cohesion. ~~our strongest point and the greatest cohesive factor.~~ We must do all we can to promote it so as to gain ~~true~~ unity, ~~through~~ equality, brotherhood and social and economic justice. In doing so, we shall be performing another important duty too. In this world of growing scepticism, penetrating enquiry and exacting reason, we shall be proving that Islam is timeless; that it is dynamic and can move with the times; that it is a practical code of life here and an effective passport for the life hereafter. This is a great challenge to our generation. I believe we can meet it provided we approach the problem objectively and scientifically and with an open mind.

Whilst promoting our own ideology, we ~~are~~ must not be unmindful of our obligation to the protection, progress and welfare of the minorities in our midst. The Constitution fully ensures their rights and we must honour these rights, ~~should abide by them~~ in letter as well as in spirit.

3 ~~4.~~ Our ~~second~~ ~~next~~ second objective ~~is the physical~~ must be the security and stability of Pakistan. Unless there is a wide realization of ~~its elements~~ the factors involved and unless a ~~and~~ constant effort is made to ~~safeguard it~~ keep them in view, ~~never to loose sight of the..~~ all our ~~efforts~~ endeavours in other fields will be of no avail.

~~5.~~ Strategically, we ~~have a~~ difficult and delicate ~~position in the geo-political sense. We are surrounded by perils. The division of the country in two wings sets up strain and stresses.~~ Our country consists of two parts separated by more than a thousand miles. ~~Then~~ There are regional, ethnic and

MY MANIFESTO

ایوب خاں کے منشور کی پہلی ٹائپ شدہ کاپی کا عکس جس میں منظور قادر مرحوم نے ہاتھ سے ترمیم اور اضافے کیے تھے۔ مضمون کے آخر میں اضافہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے کیا۔

This is President's draft Manifesto. He would like your comments and suggestions in a day or so

Q. Iqbal
13/3

Mr. Manzur Qadir

I have made some alterations.
M. Q.
15/3/62

To Mr. Shahab

Now that the Constitution has been promulgated and stage set for a general election, ~~I feel it is essential that I~~ my duty to place before the nation ~~a political manifesto embodying our~~ the objectives and requirements of Pakistan as I see them, so that ~~all should know to serve as a guide line for~~ the people, the electorate, and the prospective candidates ~~and myself~~ should know what guide lines I intend to follow. ~~In our~~ Since our elections are going to be held on non-party basis and on individual merits of candidates, such a ~~manifesto~~ statement ~~would seem~~ may be particularly useful to the electorate.

[2. To be of any use, such a manifesto has to be realistic and based on facts of life as we find them. It must take into account our strong and weak points so that we can exploit the former and eradicate the latter. No people can begin to make progress unless they show reality and objectivity and ~~carry out this exercise~~ face their problems in that light. If they do, they are blessed and God will surely make them see light and help resolve their problems.]

تکرار

رشوت — ایک انوکھی تجویز

ایوب خان نے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لیتے ہی طے شدہ پروگرام کے مطابق کئی ایک کمیٹیاں اور کمیشن بٹھائے۔ ان کمیشنوں میں ایک ایڈمنسٹریٹو آرگنائزیشن کمیٹی کے ذمہ اعلیٰ سروسوں کے انتظامی ڈھانچے کو از سرِ نو ترتیب دینے کا کام سونپا گیا۔

اس کمیٹی کے چیئرمین کو ایک خط لکھا گیا جس میں درج شدہ تجویز کا تعلق سروسز کے ڈھانچے سے نہیں بلکہ سروسز کو آلائشوں سے پاک رکھنے سے تھا۔ دو صفحات پر مشتمل اس خط میں تجویز کیا گیا کہ تمام افسر چاہے کسی بھی شعبہ سے متعلق ہوں مثلاً انتظامیہ پولیس، کسٹم، انکم ٹیکس وغیرہ وغیرہ، خواہ وفاقی حکومت میں کام کر رہے ہوں یا کسی صوبے میں، سب سے بغیر تاریخ کے غیر مشروط استعفے لے لیے جائیں۔ تاکہ جب بھی کسی افسر کے خلاف معہ پختہ ثبوت کے رشوت کی شکایت موصول ہو یا کوئی افسر رشوت لینے میں بدنام ہو جائے۔ اس سے لیا ہوا استعفیٰ منظور کر کے اسے نوکری سے فی الفور فارغ کر دیا جائے۔ کسی قسم کی انکوائری یا عدالتی چکروں میں نہ پڑا جائے۔

خط لکھنے والے کا اپنا تعلق بھی سول سروس آف پاکستان یعنی سی ایس پی سے تھا۔ اس لیے اس نے بارش کے پہلے قطرے کی طرح اپنا استعفیٰ خط کے ساتھ منسلک کر دیا تھا۔ خط لکھنے والا "نہ عالم نہ مفکر نہ محدث نہ فقیہہ" تھا مگر اس کے اندر چھپا ہوا ایک درویش رہتا تھا اور اسی درویش کی یہ شرارت تھی۔ دیگر چھوٹے بڑے افسروں نے اسے سازش قرار دیا اور سارا زور صرف کیا کہ یہ شرارت یا سازش دب جائے۔ چنانچہ اس سازش کے ساتھ وہی سلوک ہوا جو سازشوں کے ساتھ عام طور پر ہوتا ہے۔ پھر اس خط کے بارے میں کچھ نہ سنا گیا کہ از کجا آمد و کجا رفت

بظاہر یہ ایک بہت ہی معمولی تجویز تھی جس سے حکومت کو غیر معمولی اختیارات مل جاتے۔ جب چاہا کسی افسر کو رشوت کا بہانہ بنا کر نکال باہر کیا جاتا بغیر اس کی بات سُننے یا دفاع کا موقع دیئے۔ نہ شنید نہ پرسید۔ مگر جب بیماری غیر معمولی نوعیت کی ہو تو علاج بھی غیر معمولی نوعیت کا ہی کارگر ہوتا ہے۔ اگر تجویز مان لی جاتی تو عین ممکن ہے محض "کھڑ بھتی" ہی سے لوگ توبہ کر لیتے اور اگر دو چار رشوت خور بدو چشم و دو گوش نکال دیئے جاتے تو دوسروں کے لیے عبرت حاصل کرنا آسان ہو جاتا۔

ایک بات پکی ہے کہ اگر افسرانِ بالا رشوت سے اجتناب کرنے لگ جائیں تو نیچے والا عملہ از خود اصلاح پذیر ہو جاتا ہے۔ رشوت لینے اور رشوت دینے کی سنت ختم کرنے کے لیے غیر معمولی اقدام کی ضرورت ہے۔ محض ایک روپے کے نوٹ کی پشت پہ لکھ دینا کہ "رزق حلال عین عبادت ہے" رزق حلال کی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے نہ ہی یہ کوئی ترغیب کا موجب بن سکتا ہے۔

مذکورہ خط لکھنے والا شخص قدرت اللہ شہاب تھا۔

ایوانِ صدر میں قادیانی

ایک صاحب عبدالوحید تھے۔ تعلیم میٹرک تک تھی۔ انھیں وائسرائے ہاؤس دہلی میں
چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں نے کلرک بھرتی کروایا تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت پاکستان
OPT کرنے والا عملہ کراچی پہنچا تو عبدالوحید سب کلرکوں میں سینیئر قرار پائے۔ چوہدری
صاحب نے جو وزیرِ خارجہ تھے اعانت فرمائی اور عبدالوحید گورنر جنرل کے سیکرٹریٹ
میں سپرنٹنڈنٹ بنا دیے گئے۔

۱۹۵۵ء میں میجر جنرل سکندر مرزا تشریف لائے تو اسسٹنٹ سیکرٹری فرخ
امین کو جنھیں قائدِ اعظم کے پی اے ہونے کا اعزاز حاصل رہا تھا اور بعد میں خواجہ
ناظم الدین اور غلام محمد کے منظورِ نظر رہے تھے ٹرانسفر کر دیا گیا۔ ان کی جگہ عبدالوحید کو
اسسٹنٹ سیکرٹری بنایا گیا۔ اب کی دفعہ اس کی سفارش چوہدری صاحب نے ہیگ (ہالینڈ)
سے کی تھی جہاں وہ بین الاقوامی عدالت کے جج کے عہدہ جلیلہ پر متمکن تھے۔

اگرچہ وحید کا شمار سکندر مرزا کے ذاتی سٹاف میں ہونے لگا تھا تاہم ضروری تربیت
نہ ہونے کے سبب عبدالوحید کی ذمہ داریاں دفتری عملے تک محدود رہیں۔

یہ شخص کٹر قادیانی تھا۔ چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کے علاوہ
ایم ایم احمد (ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن) اور بھٹو دور میں ملک گیر شہرت پانے والے اسٹیبلشمنٹ
سیکرٹری وقار احمد (جو رشتے میں عبدالوحید کے بھانجے تھے) عبدالوحید کے مربی اور نگران
کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ عبدالوحید کے ایوانِ صدر میں موجود ہونے کے سبب
قادیانی جماعت کے امیر اور خلیفہ مرزا ناصر احمد ربوہ سے تشریف لاتے تھے تو عبدالوحید
کو میزبانی کا شرف بخشا کرتے اور عبدالوحید ہمیں فخر سے بتایا کرتا۔ فرخ امین نے عبدالوحید

کو اُس کے مقام پر رکھا ہُوا تھا۔ فرخ امین چلا گیا تو عبدالوحید نے پر پرزے نکالے اور خوب نکالے کیونکہ قدرت اللہ شہاب طبیعت کی نرمی کی وجہ سے عبدالوحید کو لگام ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

قائدِاعظم کے مزار کی تعمیر کا مسئلہ معرضِ التوا میں چلا آ رہا تھا تعمیر کی غرض سے خطیر رقم ایوان صدر کی تحویل میں تھی۔ عبدالوحید نے اس رقم میں اضافہ کرنے کے بہانے شہاب صاحب کو قائل کر کے اس رقم سے مزار کے لیے مختص شدہ سرکاری قطعہ زمین پر دکانیں تعمیر کروائیں جسے شبینہ مارکیٹ کا نام دیا گیا۔

یہ مارکیٹ آدھی رات تک کھلی رہتی تاکہ سارا دن مصروف رہنے والے لوگ باگ رات کو شاپنگ کر سکیں۔ اس مارکیٹ کی تعمیر میں عبدالوحید نے صرف ایک آفس اسسٹنٹ مرزا عبدالرحمٰن کو اپنے ساتھ رکھا۔ تیسرے کسی شخص کو علم نہ ہونے دیا کہ ٹھیکہ دار کون ہے؟ انجنیئر کون ہے؟ دکانیں کون الاٹ کرتا ہے؟ کرایہ کون وصول کرتا ہے؟ حساب کتاب کون رکھتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ، بس ایک عبدالوحید اور دُوسرا مرزا عبدالرحمٰن۔

مرزا عبدالرحمٰن خود بڑا آزاد خیال مشہور تھا البتہ اُس کا والد آنجہانی مولوی عُمردین مشہور قادیانی مبلغ اور قادیانی جماعت کے بانی آنجہانی مرزا غلام احمد کا قریبی دوست تھا۔ گویا قادیانیوں کے مطابق مولوی عُمردین "صحابی" کے درجہ پر فائز رہا تھا۔

یہ مارکیٹ خوب چلائی گئی، شام کے بعد عبدالوحید اور مرزا عبدالرحمٰن وہیں اپنا دفتر بھی لگاتے۔ عبدالوحید کے بقول ایک طرف قائدِاعظم میموریل فنڈ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تو دُوسری طرف سرکاری زمین غیر قانونی تجاوزات سے محفوظ رہی۔

جب دارالحکومت کراچی سے راولپنڈی منتقل ہُوا تو عبدالوحید کو راولپنڈی آنا پڑا۔ مگر اُس نے مرزا عبدالرحمٰن کو کراچی شبینہ مارکیٹ میں اپنا نمائندہ بنا کر چھوڑ دیا۔ چند ماہ بعد محسوس ہوا کہ سیٹھ صاحب کے منیجر کی بجائے مرزا صاحب خود سیٹھ ہی بن بیٹھے ہیں تو عبدالوحید نے مارکیٹ بند کروا کر بلڈوزر چلوا دیے۔ عبدالوحید نے نام بھی کمایا اور دام بھی، اس کے ساتھ کاروبار کا تجربہ حاصل ہوا۔ مونچھوں کو خون بھی لگ گیا۔

اچھے کاموں کا شوق ہو تو اللہ تعالیٰ اچھے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ نیت بُری ہو تو خدا ڈھیل دیے جاتا ہے۔ اتنی ڈھیل اور رسی اتنی دراز کہ بعد میں مشکیں کسنے کا وقت آئے تو رسی کم نہ پڑ جائے۔

ایوب خاں تشریف لا چکے تھے اور مزارِ قائد کی تعمیر ایوب خاں کی پہلی ترجیحات میں سے تھی۔ ابتدائی مراحل کے بعد تعمیر شروع ہوئی۔

عبدالوحید پہنچ گئے۔ قدرت اللہ شہاب کی خدمت میں عرض کی کہ جناب پی ڈبلیو ڈی اور دوسرے ادارے بڑا گھپلا کرتے ہیں اس لیے مٹیریل کی سپلائی ہمیں اپنے ہاتھ میں رکھنی چاہیے۔ سنگ مرمر مردان اور ملا گوری سے مہیا ہونا تھا۔ ان جگہوں کے دورے شروع ہو گئے۔ سنگِ مرمر کے تاجروں کو خبر ہو گئی۔ وہ لال کرتی میں عبدالوحید کے گھر کا طواف کرنا شروع ہو گئے۔ مزارِ قائد کی تعمیر کی نگرانی کرنے کے لیے کنسلٹنگ انجنیئر کی ضرورت تھی چنانچہ تلاش کرنے سے مطلب کا آدمی مل گیا۔ پی ڈبلیو ڈی سے ریٹائرشدہ سپرنٹنڈنگ انجنیئر عبدالرحمان اُن کیلئے ایوانِ صدر میں اسسٹنٹ سیکرٹری بڑی چیز تھی۔ جب بھی عبدالوحید بلا تا سر کے بل تشریف لاتے اور ادب سے ساتھ گفتگو کرتے۔ عبدالوحید کو اب بھی ایک عبدالرحمٰن میسر آ گیا تھا۔ ایوانِ صدر سے باہر سنگِ مرمر کی خریداری میں کسی کو دخل اندازی کی نہ جرأت تھی اور نہ ہی حق حاصل تھا۔ عبدالوحید اس سلسلے میں مختارِ کُل تھا۔ البتہ آفس اسسٹنٹ مرزا عبدالرحمٰن توبہ تائب کر کے دوبارہ خدمت پر مامور ہو چکا تھا۔

افسرانِ بالا کے لیے اتنی بات ہی وجہ اطمینان تھی کہ مزار کی تعمیر پروگرام کے مطابق جاری ہے۔ گھپلا کس نوعیت کا ہو رہا تھا اور کون کر رہا تھا انھیں اس سے دلچسپی نہ تھی۔

عبدالوحید نے موقع پا کر مطالبہ کیا کہ چونکہ اس کے فرائضِ منصبی میں گرانقدر اضافہ ہُوا ہے لہٰذا اُسے اسسٹنٹ سیکرٹری سے ترقی دے کر ڈپٹی سیکرٹری بنایا جائے۔ سیکرٹری شہاب صاحب نے کہا ٹھیک ہے۔ پریذیڈنٹ صاحب کی منظوری کے بعد وزارتِ خزانہ

سے رجوع کیا گیا تاکہ ضابطے کی کارروائی پوری ہو۔ کسی نائب قاصد کو دس پندرہ روپیہ ماہانہ اضافہ کی بات ہوتی تو وزارتِ خزانہ کے افسران بال کی کھال اتارنا شروع کر دیتے۔ یہ تو صرف ایک افسر کا رتبہ بڑھانا اور اُس کی تنخواہ میں چار یا پانچ سو روپیہ ماہوار کا اضافہ کرنا تھا اور بس۔ افسر بھی ایوانِ صدر کا جس سے کسی وقت بھی کام پڑھ سکتا تھا لہٰذا اعتراض کر کے کیا لینا تھا۔

پولیس نوں آکھاں رشوت خور تے فائدہ کیہہ
پوبھی ہو جاوے ہور دی ہور تے فائدہ کیہہ

منظوری آگئی اور عبدالوحید ڈپٹی سیکرٹری بن گیا۔ دریں اثنا عبدالوحید نے اسلام آباد کے سیکریٹریٹ میں جو سب سے پہلے آباد ہوا تھا ایک مکان بنوالیا۔ راقم کو اُس مکان کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

قدرت اللہ شہاب جواب سیکرٹری وزارتِ اطلاعات تھے اور اُن کی بیگم ڈاکٹر عفت شہاب بھی ہمراہ تھیں۔ غسل خانے تو خیر مرمر کے ہونے ہی تھے کمروں کے فرش اور مکان کی چاردیواری (اندر کی طرف سے) سنگِ مرمر کی تھی۔ صرف کمروں کی چھتوں پر پلستر تھا۔ قائدِ اعظم کے مزار والا مقدس سنگِ مرمر۔ بیگم شہاب سے کہے بغیر نہ رہا گیا کہنے لگیں، وحید صاحب کا مکان گھر نہیں بلکہ کسی مغل بادشاہ کا مقبرہ لگتا ہے۔

عبدالوحید بتایا کرتا تھا کہ اپنی تنخواہ میں سے ایک طے شدہ رقم قادیانی جماعت کو ماہوار بھیجنا پڑتی ہے۔ قائدِ اعظم کے مزار کی بدولت ماہانہ چندے میں یقیناً اضافہ ہوا۔

قائدِ اعظم میموریل فنڈ سے شبینہ مارکیٹ اور سنگِ مرمر کی سپلائی کی "سرورتی" سے کاروبار کا وسیع تجربہ ہو گیا تھا۔ پریذیڈنٹ کے سیکرٹری اب این اے فاروقی تھے جو خود بھی مرزائی تھے۔ اُن سے منظوری لے کر قائدِ اعظم میموریل فنڈ سے چھ عدد کالے رنگ کی فورڈ پریفیکٹ کاریں خرید کر ٹیکسیاں رجسٹر کروائیں جن کی نمبر پلیٹ پر کیو ایم ایف لکھوایا گیا تاکہ ٹریفک پولیس کا عملہ قائدِ اعظم کے احترام میں اِن ٹیکسیوں کا بھی احترام کرے۔ اگر بالفرض ٹریفک پولیس والے اپنی ہوس میں اندھے بھی ہو چکے ہوں تو اُن کی

آنکھوں کا نور بحال کرنے کے لیے ڈرائیور فوراً وہ کاغذ دکھا دے جس پر لکھا تھا کہ یہ ٹیکسی ایوانِ صدر سے تعلق رکھتی ہے تاکہ پولیس والا پیچھے ہٹ کر سلام کرے اور اگلے سپاہی کو اشارہ کر دے کہ "جان دیوس" بھروسے کے ڈرائیور بھرتی کیے گئے تھے جن سے روزانہ کی وصولی دولت خانہ پر ہوتی۔

حساب کتاب کے لیے اب کی دفعہ مرزا عبدالرحمٰن کو نظر انداز کر کے اپنے پی اے عبدالقادر بھٹی اور نائب قاصد سرفراز خاں کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ حقِ خدمت کے طور پر اُنھیں ٹیکسیوں کی آمدنی میں سے ماہانہ الاؤنس دیا جاتا۔ یہ مشغلہ ۱۹۶۸ء تک جاری رہا۔ اس دوران سیکرٹری صاحبان کی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ قدرت اللہ شہاب کے بعد تھوڑی مدت کے لیے میاں ریاض الدین اور اعجاز نائیک تشریف لائے تھے۔ اُن کے بعد این اے فاروقی اور سید فدا حسن تشریف لائے تھے مگر عبدالوحید سب کی آنکھوں میں خاک جھونکنے میں کامیاب رہا۔ نہ ہی کسی کو نوالِ شہر کو مسجد کے زیر سایہ اس خرابات پر انگلی اٹھانے کی جرأت ہو سکی۔

ایوانِ صدر میں سیکرٹریٹ کے عملے نے عبدالوحید کے بارے میں کھسر پھسر شروع کر دی تو بات عبدالوحید تک پہنچی۔ آدمی ہشیار تھا وقت پر گڑبڑ بھانپ کر تدارک کر لیتا تھا۔ سید فدا حسن کے پاس گیا کہ جناب ایوان صدر میں غریب عملے کو اُن کی لمبی خدمات کے عوض صوبائی حکومت سے تھوڑی تھوڑی سرکاری اراضی دلوائی جائے۔ فدا حسن نے کہا ٹھیک ہے گورنر موسیٰ کے نام چٹھی لکھ کر لاؤ۔ چٹھی لکھ کر دے گئے۔ دس بارہ چپڑاسیوں کے لیے ساڑھے بارہ ایکڑ (آدھا مربع) اور فہرست کے اخیر میں خود اپنا نام اور اس کے آگے صرف سو ایکڑ یعنی چار مربع زرعی اراضی۔

چٹھی روانہ ہوئی۔ گورنر موسیٰ کے سٹاف نے دیکھا تو اُن کے منہ میں بھی پانی بھر آیا اور نام شامل ہوئے۔ ضلع میانوالی کی تحصیل بھکر میں اراضی الاٹ ہو گئی۔

جن چپڑاسیوں کے نام گئے تھے وہ عبدالوحید کی غریب پروری پر عش عش کر اٹھے۔ جن کے نام رہ گئے تھے اُن میں سے دو چار جو زیادہ "بڑبولے" تھے اُنکو سمجھایا گیا کہ

دیکھو اگلے سال پھر نام بھجوانے ہیں تم کام اچھا کرتے رہو۔ وہ اچھا کام کرنے کا مطلب سمجھ گئے اور خاموش ہو گئے۔

۱۹۶۸ء کے وسط میں سید فدا حسن تبدیل ہو گئے۔ ان کی جگہ عبدالقیوم تشریف لے آئے۔ یہ حضرت بالکل ہی دوسری قسم کے تھے۔ آتے ہی ٹیکیوں کا کاروبار بند کروایا اور حساب کتاب طلب کر لیا۔ ابھی ہفتہ عشرہ بھی نہ گزرا تھا کہ عبدالوحید کو بوریا بستر لپیٹنے کا حکم مل گیا۔

اگرچہ اُس وقت تک آر سی ڈی کے لیے میری سلیکشن ہو چکی تھی اور ایوانِ صدر سے رخصت ہونے کے لیے پریزیڈنٹ صاحب کی اجازت کا منتظر تھا تاہم عبدالقیوم صاحب نے مجھے عبدالوحید سے چارج لینے کو کہا۔ عبدالوحید نے اپنے ذاتی کاغذات اور سامان سمیٹنے کے لیے قیوم صاحب سے دو دن کی مہلت مانگی جو مل گئی۔ آخری دن تھا۔ شام کے بعد رات شروع ہو گئی۔ عبدالوحید اپنے پی اے عبدالقادر بھٹی اور نائب قاصد سرفراز کی مدد سے "بھولا بھالی" میں مصروف رہا اور وقفہ وقفہ سے پیشانی سے پسینہ پونچھتا رہا۔ میں بھی انتظار میں بیٹھا رہا۔ میں رات نو بجے کھانا کھانے اپنے گھر جو ایوان صدر کی حدود کے اندر تھا چلا گیا۔ واپس آیا تو عبدالوحید کاغذات کا ڈھیر لگائے اُنھیں جلانے میں مشغول تھا۔ راکھ بتا رہی تھی کہ بوری بھر کاغذ جلائے جا چکے ہیں۔

میں نے اپنے کمرے میں آکر ٹیلیفون پر عبدالقیوم صاحب کو اطلاع دینے کی کوشش کی مگر وہ گھر پر نہ تھے۔ رات گیارہ بجے چارج لیا۔ صبح قیوم صاحب کو پتہ چلا تو سیخ پا ہو گئے اور لگے مجھ پر برسنے۔ اُن کا غصہ بجا تھا مگر میں بے گناہ تھا۔ ریکارڈ جل چکا تھا اور عبدالوحید جا چکا تھا۔ کچھ عرصہ وہ چھٹی پر رہا۔ پھر اُس کی پوسٹنگ سی ڈی اے میں جہاں این اے فاروقی چیئرمین تھے بطورِ ایڈمن آفیسر ہو گئی۔ میں ایوانِ صدر کو چھوڑ کر آر سی ڈی میں تہران چلا گیا۔ تہران سے واپسی پر میری تقرری وزارتِ تعلیم میں ہو گئی۔ ایوان صدر کے زمانے

صدر ایوب، وزیر اعظم چین چو این لائی، اور ذوالفقار علی بھٹو

دونوں سے معلوم ہوا کہ عبدالوحید کے خلاف انکوائری ہوئی تھی جس کے نتیجے میں اُسے جبری ریٹائر کر کے آدھی پنشن بحق سرکار ضبط کر لی گئی تھی۔ اس تمام کارروائی کا کریڈٹ عبدالقیوم کو جاتا ہے۔ اگرچہ جرائم کے مقابلے میں سزا بہت کم تھی ممکن ہے بلکہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ایم ایم احمد، وقار احمد، این اے فاروقی اور دُوسرے قادیانی افسروں نے ٹک مکا کی پوری کوشش کی ہو گی۔ اپنے خلاف بیشتر کاغذی شہادتیں وُہ پہلے ہی ایوانِ صدر سے نکلتے وقت تلف کر چکا تھا تاہم مکافاتِ عمل سے کون ہے جو عبدالوحید بچ جاتا۔

کیسے کیسے لوگ
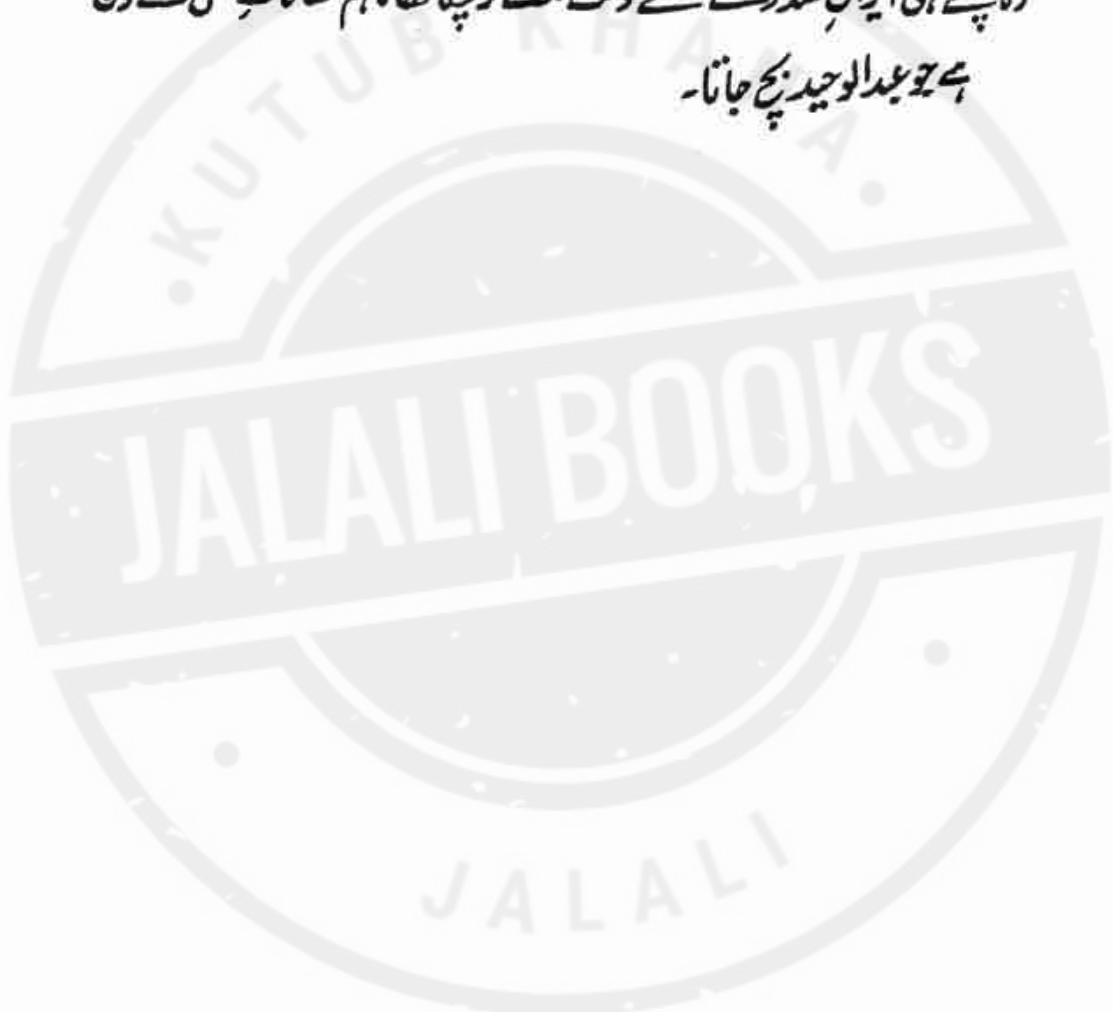
دُرّانی صاحب

پورا نام نثار حسین درانی جنھیں میں اکثر خان صاحب کہہ کر مخاطب کرتا. گجرات کے قصبہ جلال پور جٹاں میں پیدا ہوئے. والد کا جو تحصیلدار تھے بچپن میں انتقال ہو گیا تھا. ایک ماموں لاہور میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج تھے (وہی بارش بزرگ جنھوں نے سعادت حسن منٹو کو فحاشی کے الزام سے بری کر کے خود منٹو کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا) دوسرے ماموں گجرات میں وکیل تھے. نثار حسین نے گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے اور لا کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری لے کر گجرات میں ماموں کی زیرِ نگرانی وکالت شروع کر دی۔

گجرات قتل کی وارداتوں اور نثار حسین کے ماموں قتل کے مقدمات کی پیروی کے لیے شہرت رکھتے تھے. ماموں نے بھانجے کے سپرد پہلا مقدمہ دوہرے قتل کا کیا۔ نثار حسین نے ملزمان کی کہانی اُن کی اپنی زبانی سنی تو اُن کی بے گناہی پر بڑا ترس آیا۔ محنت اور لگن سے دفاع تیار کیا اور ملزمان کو بری کروا لیا. پہلی کامیابی پر بہت خوش ہوئے. کمرہ عدالت سے باہر نکلے تو ملزمان نثار حسین کے نثار ہونے لگے اور اعتراف کیا کہ انھوں نے قتل کیے تھے اور اب دشمنوں سے مقدمہ کا بدلہ لیں گے. نثار حسین کے کانوں میں یہ بات پڑی تو ہاتھوں سے قانون کی کتابیں گر گئیں۔ وکالت کے پیشے سے توبہ کر لی۔ دہلی چلے گئے. گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ اطلاعات میں انفرمیشن اسسٹنٹ کی اسامی قبول کر لی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام پر کراچی آگئے۔ ۱۹۵۹ء میں ایوانِ صدر میں تقرری کے وقت پندرہ برس کی سروس کے بعد اسسٹنٹ انفرمیشن آفیسر تھے۔

درانی صاحب بڑے باغ و بہار تھے۔ ایک دفعہ سردیوں کی صبح ہم دونوں اپنے کمرے کے باہر ٹیرس پر دھوپ میں سکڑے ہوئے ہاتھ پاؤں کو درست کرنے کی خاطر تھوڑی دیر کے لیے کھڑے ہوئے تو اُنکے پی اے نے آکر اطلاع دی کہ گیٹ سے پولیس انسپکٹر کا ٹیلیفون آیا ہے کہ شبیر شاہ صاحب ملنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ خاں صاحب نے کہا کہ اُن سے کہیں کہ شاہ صاحب کو آنے دیں۔ پی اے نے کہا جناب گھر سے بیگم صاحبہ کا ٹیلیفون بھی آیا تھا۔ پوچھا کیوں کیا وہ بھی ملنا چاہتی ہیں؟ اُن سے بھاگ کر تو میں یہاں آیا ہوں۔ اتنے میں ایک سُپر سانک جیٹ ہوائی جہاز نے اونچی اُڑان کے دوران ساونڈ بیریر عبور کرتے وقت عین ہمارے سروں کے اُوپر زوردار دھماکہ کیا۔ خاں صاحب نے سر جھکا لیا اور منہ سے بے ساختہ نکلا "وہ آگئی" ہم دونوں ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے اور پی اے بھاگ کر اندر چلا گیا۔

میرے اور خان صاحب کے پاس نہ کوئی اپنا ذاتی مکان تھا نہ کسی قسم کی پراپرٹی۔ تنخواہ بھی دونوں کی تقریباً برابر تھی اور "بھس پھسا" کر گزارا ہوتا تھا۔ اسلام آباد میں رہائشی پلاٹوں کے لیے درخواستیں دے رکھی تھیں۔ اتفاق سے سیکٹر جی سکس میں جو سب سے پہلے تعمیر ہونے والا سیکٹر تھا۔ ہم دونوں کو ایک ایک ہزار مربع گز یعنی دو دو کنال کے پلاٹ الاٹ ہو گئے۔ درخواست دینے میں کچھ خرچ نہ ہونا تھا لہٰذا خوشی خوشی سینہ تان کر درخواست گزاروں میں شامل ہو گئے تھے مگر اب پہلی قسط کی ادائیگی کا مسئلہ آن پڑا۔ حبیب بنک کی راولپنڈی صدر شاخ کے مینجر آفتاب احمد صدیقی نے جواب سینیئر وائس پریزیڈنٹ ہیں از راہ بندہ پروری ہمیں بلا سود قرض کی پیش کش کی۔ میں کچھ کچھ مائل پرواز تھا اور اپنی بیگم کی خوشنودی کی خاطر دام میں آجاتا مگر خان صاحب نے بچا لیا۔ فرمایا جب تک سرکاری ملازمت میں ہیں ہمارے لیے اچھی بُری رہائش کا بندوبست حکومت کی ذمہ داری ہے۔ عرض کیا بعد میں کہاں جائیں گے۔ فرمایا آخری وقت دو گز زمین کی ضرورت ہوتی ہے جو لواحقین کی ذمہ داری ہوا کرتی ہے۔ مجھے بھی ممتاز مفتی کا فتویٰ یاد آگیا فرمایا کرتے تھے مسئلے کو جب تک ٹال سکتے ہو ٹالتے

جادو عین ممکن ہے وہ مسئلہ اپنی طبعی موت مر جائے اور تمھاری توانائیاں محفوظ رہ جائیں۔ نتیجہ یہ کہ میں نے اور محمد خاں صاحب نے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر اپنے اپنے الاٹمنٹ لیٹر کو ذبح کر کے اور اُن کی بوٹی بوٹی کر کے دم لیا۔

میں نے یہ کارروائی اپنی بیگم سے چھپائے رکھی مگر خاں صاحب نے گھر جاتے ہی اپنی درویشی کی شیخی بگھاری تو بیگم صاحبہ روٹھ کر میکے چلی گئیں، میری بیگم کو کافی عرصے بعد پتہ چلا جب جرم کے ارتکاب میں خاصی دیر ہو چکی تھی تاہم میاں بیوی کے درمیان ایک سرحدی قسم کی جھڑپ ہو ہی گئی۔

خاں صاحب اخبارات کے اداریوں میں کام کی باتیں سرخ پنسل سے خط کشید کر کے ایک نوٹ کے ہمراہ پریزیڈنٹ صاحب کو ہر روز پیش کیا کرتے تھے۔ ایوب خاں نے مری میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ قومی پریس کے چیف ایڈیٹروں کو خصوصی دعوت نامے بھیجے گئے تھے۔ یہ پریس کانفرنس نوائے وقت کے مدیر حمید نظامی کے تند و تیز جملوں کی وجہ سے گرم سرد ہو گئی۔ مشرقی پاکستان کے تفضل حسین چوہدری نے حمید نظامی کا ساتھ دیا مگر باقی مدیرانِ کرام سہمے رہے۔

اس واقعہ کو دو روز گزرے تھے کہ نوائے وقت نے ایک کڑوا کسیلا اداریہ لکھ ڈالا۔ این اے فاروقی نے جو ایوب خاں کے پرنسپل سیکرٹری تھے خاں صاحب کو بلا کر حکم دیا کہ روزنامہ نوائے وقت کے پرچے پریزیڈنٹ صاحب کو نہ بھیجے جائیں کیونکہ اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں اور اس اخبار کی بکواس سے پریزیڈنٹ صاحب کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔ خاں صاحب نے مجھ سے ذکر کیا اور ہم دونوں سوچنے لگے کہ پریزیڈنٹ صاحب کو اس پرچے کے اداریوں سے کیسے آگاہ رکھا جائے۔ دو چار دن بعد فاروقی نے خاں صاحب کو پھر "سلام" دیا۔ اب کی مرتبہ حکم ہوا کہ ہفتہ وار "چٹان" بھی بند کر دو۔ اختر ایوب خاں سے ہماری دوستی تھی وہ آئے تو اُن سے ذکر کیا۔ وہ ہمارے ہم خیال تھے بلکہ انھیں اصرار تھا کہ پریزیڈنٹ صاحب کو نوائے وقت اور چٹان کے اداریوں اور دوسرے تجزیوں سے باخبر رکھنا اشد ضروری ہے چنانچہ

ہم تینوں نے فیصلہ کیا کہ جس پرچے کو خاں صاحب ضروری سمجھیں ہم کسی نہ کسی طرح پریزیڈنٹ کے نوٹس میں لاتے رہیں۔ خاں صاحب کبھی اختر ایوب کے ذریعہ اور کبھی میرے ذریعہ پریزیڈنٹ کو مواد بھیجنا شروع ہو گئے۔

این اے فاروقی کو کافی دنوں تک ہمارے اقدام کی خبر نہ ہو سکی کیونکہ خاں صاحب اداریے کے کسی بھی حصے کو خط کشیدہ نہیں کرتے تھے۔ اختر صاحب کے ذریعہ ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ پریزیڈنٹ صاحب نے خود ایسے کوئی احکام نہیں دیے تھے اور فاروقی نے اپنے طور پر قدغن لگا یا تھا۔

دریں اثنا شورش کاشمیری نے اپنی عادت سے مجبور چٹان میں ایک اداریہ لکھا جس میں نواب صاحب کالا باغ کی تعریف اور ایوب خاں پر کڑی تنقید تھی۔ شورش نے یہ الزام بھی عائد کیا تھا کہ صدر ایوب نے اپنے گرد قادیانی جمع کر رکھے ہیں جو قادیانی جماعت کے سربراہ کی ہدایت پر صدر محترم کو گمراہ کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں، پاکستان کی اقتصادی پالیسی امریکہ کے زیر ہدایت ایم شعیب اور مرزا ناصر احمد کے کزن ایم ایم احمد تشکیل دیتے ہیں۔ ایوان صدر میں پرنسپل سیکرٹری این اے فاروقی اور ڈپٹی سیکرٹری عبدالوحید فیلڈ مارشل صاحب کو صحیح حالات سے بے خبر رکھنے کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ سب افسر پکے قادیانی ہیں اور اپنی کارکردگی اور حکومت کے خفیہ فیصلوں سے قادیانی جماعت کے سربراہ کو باقاعدہ طور پر باخبر رکھتے ہیں۔

خاں صاحب یہ اداریہ پڑھ کر اتنے خوش ہوئے کہ جوش میں ہمارے فیصلہ کو بھول گئے اور حسبِ سابق سُرخ پنسل سے خاص خاص سطروں کو خطِ کشیدہ کر دیا۔ اختر ایوب کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ وُہ شکار پر گئے ہوئے ہیں۔ چھ سات دن تک پرچہ ہمارے پاس رہا مگر اختر ایوب شکار سے واپس نہ آئے۔ خاں صاحب کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اُن کی بے چینی کم کرنے کے لیے میں نے اُن سے پرچہ لے لیا۔ ایک فائل کور میں رکھ کر کوئی دُوسرا کام نکال کر پریزیڈنٹ صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ ایک دو چیک پر دستخط کروائے اور پریزیڈنٹ صاحب کی نظر سے بچا کر فائل کور پریزیڈنٹ

کے دوسرے کا غذات میں رکھ کر چلا آیا۔ خاں صاحب کو بتایا تو اُن کے سینے کا بوجھ ہلکا ہول
پریزیڈنٹ نے دُوسرے دن Seen لکھ فائل کو رد واپس بھیج دیا۔ سب کاغذات
واپسی پر فاروقی کے پاس آتے تھے۔ اُس نے وُہ فائل کورا اور خاں صاحب کی خط کشیدہ
کاری دیکھی تو غصہ سے پاگل ہو گیا۔ ان کا چپڑاسی خاں صاحب کے پاس آیا کہ صاحب
نے سلام دیا ہے۔ خاں صاحب کو" کھٹک" گئی۔ فاروقی نے اداریہ والا صفحہ کھول کر
خاں صاحب کے آگے پھینکا جہاں اس کا نام لکھا ہوا تھا اُس کے سامنے حاشیہ میں
فاروقی نے لکھا ہوا تھا آئی ایم ناٹ اے قادیانی۔ لفظ ناٹ کو دو دفعہ خط کشیدہ
کیا ہُوا تھا۔ بات صحیح تھی کیونکہ فاروقی مرزائی تو تھا مگر قادیانی پارٹی کی بجائے مرزئیوں
کی لاہوری پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ ویسے بھی مرزائی خود کو قادیانی یا مرزائی کہلوانا
پسند نہیں کرتے بلکہ خود کو احمدی کہتے ہیں۔ پوچھا یہ پرچہ کیسے پریزیڈنٹ تک پہنچا جبکہ
منع کر رکھا تھا کہ نوائے وقت اور چٹان پریزیڈنٹ کو نہیں بھیجنا کیونکہ وُہ پسند نہیں کرتے۔
خاں صاحب نے لاعلمی ظاہر کی مگر چونکہ جھوٹ بولنے کی عادت نہیں تھی اس لیے چہرے
سے اعتراف صاف ظاہر تھا۔

دُوسرے دن فاروقی نے خاں صاحب کو واپس وزارتِ اطلاعات میں بھیج دیا۔
میں نے اختر ایوب سے ٹیلیفون پر بات کرنا چاہی مگر وُہ نہ مل سکے اور خاں صاحب
ایوانِ صدر میں داخلے کا پاس جمع کروا کر وزارتِ اطلاعات میں چلے گئے۔ وہاں سے
اُن کی پوسٹنگ انقرہ میں سینٹو کے ہیڈ کوارٹرز میں ہو گئی جہاں وُہ چار برس تک فرائض
سرانجام دیتے رہے اور اتنے پیسے جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ واپس آکر اسلام آباد
میں گھر بنوا سکیں۔ اُن کی طرح مسبب الاسباب نے میرے لیے اسباب پیدا فرمائے اور
آر سی ڈی تہران میں چھ برس سروس کے دوران مکان کی تعمیر کے لیے رقم میسر آگئی۔ سچ ہے

کار سازِ ما بفکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

مرزا صاحب

ادارہ برائے قومی تعمیرِ نو نے جز وقتی معاونین کے علاوہ کچھ اہلِ فکر و دانش کو کل وقتی ملازم بھی رکھا ہوا تھا۔ ان میں میرے سابق استاد اور پیر و مرشد جناب عبدالحمید مرزا ایم اے بھی شامل تھے۔ مرزا صاحب کا تعلق ضلع گجرات کے قصبہ جلال پور جٹاں سے تھا۔ ایوانِ صدر میں میرے کولیگ اور دوست نثار حسین درانی (فیلڈ مارشل کے اسسٹنٹ پی آر او) بھی وہیں کے رہنے والے تھے اور انھوں نے ہی مجھے ادارہ قومی تعمیرِ نو میں مرزا صاحب کی موجودگی کی خبر دی تھی۔ درانی صاحب نے مرزا صاحب سے میرا ذکر کیا تو انھوں نے بتایا کہ وُہ (یعنی میں) نہ صرف اُن کا پرانا شاگرد بلکہ حلقہ بگوش بھی تھا چنانچہ ہم تینوں کی ایک مقامی ریستوران میں ملاقات طے ہوئی تو مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ جس اُستاد کے جوشِ خطابت نے کسی زمانے میں مجھے ریش بڑھانے کی ترغیب دی تھی وُہ خود بھی کلین شیو ہو چکے تھے۔

اِس تازہ ملاقات کی طرح مرزا صاحب سے میری پہلی ملاقات بھی ڈرامائی تھی۔ ۴۰-۱۹۳۹ء کے سیشن کے دوران اسلامیہ کالج لاہور میں دینیات کے اُستاد مولانا محمد عمر صاحب ریٹائر ہوئے تو اُن کی جگہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا تقرر ہُوا مولانا مودودی اپنی شہرہ آفاق تصانیف کی بدولت کافی شہرت عزت اور احترام حاصل کر چکے تھے اور ہم طلبہ ان کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے پر بہت خوش تھے مگر جلد ہی کالج انتظامیہ کے ساتھ اختلاف کی بنا پر مولانا مستعفی ہو گئے۔ اس پر طلبہ نے ہڑتال کر دی کہ مولانا مودودی کو واپس لاؤ حالانکہ طلبہ اختلاف کی نوعیت سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے۔ کالج کے پرنسپل خواجہ دل محمد ایم اے نے طلبہ کو مقدور بھر

سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود اور ہنگامہ بڑھتا گیا۔

ایک صبح حبیبیہ ہال میں طلبہ جمع تھے کہ ایک خوبصورت باریش نوجوان نے سٹیج پر آ کر تلاوتِ قرآن شروع کر دی۔ تلاوت بڑی پُرسوز اور سحر آمیز تھی۔ تلاوت کے بعد اُس نوجوان نے آیات کی تشریح بیان کرنا شروع کر دی اور علامہ اقبال کے اشعار کی مدد سے خطابت کے خوب جوہر دکھائے۔ جب دیکھا کہ طلبہ مسحور ہو چکے ہیں تو اجازت طلب کی کہ عارضی طور پر دینیات کی کلاسیں لے لیا کریں۔ طلبہ یک زبان راضی ہو گئے۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ انجمن حمایتِ اسلام نے انھیں دینیات کا استاد مقرر کر کے بھیجا تھا۔ بہرحال ہڑتال ختم ہو گئی اور طلبہ مولانا مودودی کو بھول گئے۔

مرزا صاحب اسلامیہ کالج میں پروفیسری کے ساتھ اسٹیشن کے قریب آسٹریلیا مسجد میں خطیب بھی تھے جہاں اُنھوں نے اِدارہ اصلاح و تبلیغ قائم کر رکھا تھا۔ مسجد کے عقب میں اُن کی رہائش تھی جہاں ہم کچھ طلبہ کشاں کشاں اُن کے حلقہ ارادت میں شامل ہو کر ادارہ اصلاح و تبلیغ سے منسلک ہو گئے۔ جوشِ جوانی سے میرا بُرا حال تھا اس لیے بہت جلد میرا شمار کٹر مولویوں میں ہونے لگا اور اپنے سوا مجھے ساری دُنیا فسق و فجور اور لہو لعب میں مشغول نظر آنے لگی۔

اُن دنوں لاہور کی تین مساجد میں جمعہ کے روز ہجوم مومنین بہت زیادہ ہوتا تھا۔ ایک تو وہی مسجد جس کے بارے میں علامہ نے فرمایا تھا،

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
دل اپنا پرانا پاپی ہے۔ برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اِس مسجد میں مولانا محمد بخش مسلم بی اے خطیب تھے۔ دوسری مسجد ہائی کورٹ بلڈنگ کے عقب میں جہاں علامہ علاؤالدین صدیقی جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے خطبہ دیا کرتے تھے اور تیسری آسٹریلیا مسجد۔

افسوس کہ مرزا صاحب سے تجدید ملاقات بار آور ثابت نہ ہوئی۔ میں اور دُرانی اُن

کے عزائم سے اتفاق نہ کر سکے۔ یوں بھی اب پہلے والی بات نہ تھی یعنی۔

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وُہ حُسن میں رہیں شوخیاں
نہ وُہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وُہ خم ہے زلفِ ایاز میں

رامے صاحب

ادارہ برائے قومی تعمیر نو مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ نہ بنیادی جمہوریت کی بنیاد مستحکم ہو سکی اور نہ صدارتی نظامِ حکومت مقبول ہو سکا۔ باقی رہا ادارہ کا اپنا وجود تو یہی کہنا ہی کافی ہوگا۔

سبزہ را گاؤ خورد
گاؤ را قصاب بُرد
وقصاب در راہ مرد

تاہم وقتی طور پر کچھ ایسے دانشور ادیب وصحافی ضرور میسّر آگئے جو فیلڈ مارشل ایوب خاں کے خیالات کی ترجمانی فیلڈ مارشل سے بھی بہتر کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان بزرگوں میں ماہنامہ نصرت لاہور کے نوجوان مدیر جناب محمد حنیف رامے صاحب سرفہرست تھے۔

رامے صاحب کی نگارشات ادارہ قومی تعمیر نو کی طرف سے ترغیب وتحریص کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئیں یا "از خود برآدر ہر چہ اندر سینہ داری" کا نتیجہ تھیں۔ راقم کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہے کیونکہ جس طرح ہم نے ایوانِ صدر میں اپنے کرم فرماؤں کے اسمائے گرامی کو اخفا میں رکھا ویسے ہی ایف آر خاں کے ادارے میں خلوص تو اہتمام کیا گیا تھا اور کم از کم راقم کی سطح تک ایوانِ صدر میں بے خبری کا عالم تھا۔ ہاں اتنا ضرور معلوم ہے کہ رامے صاحب پہلے بھی گاہے بگاہے فیلڈ مارشل ایوب خاں کی تعریف کرتے رہتے تھے اور فیلڈ مارشل کے کسی طرزِ عمل کے خلاف دو بول کہے بھی تو اس احتیاط کے ساتھ کہ ستائش کا پہلو بہر حال نمایاں رہے۔

مثلاً جب فیلڈ مارشل نے عائلی قوانین ماہرانہ رائے حاصل کرنے کے لیے اسلامی مشاورتی کونسل کو ارسال کیے تو رامے صاحب ناراض تھے کہ صدرِ مملکت علماء کے دباؤ میں کیوں آئے۔ حالانکہ یہ قوانین شریعت سے لگا کھاتے تھے۔ رامے صاحب سیاسی جماعتوں کی بحالی تو ایک طرف اُن کے وجود بلکہ جمہوریت کے مروجہ اداروں ہی کو کفر و عصیاں سے تعبیر کرنے لگے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان سیاستدانوں اور علماء کی خوب خبر لی اور "پریس کی آزادی" کے بجائے "پریس سے آزادی" کا اشارہ کیا۔ اُنھوں نے اپنے جریدہ میں اپنے دستخطوں سے مضامین لکھے اور کاپی "صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی خدمت میں محبت احترام اور دُعا کے ساتھ" ارسال کی۔

ایک مضمون "سامری کا بچھڑا اور بندھے ہوئے ہاتھ" تے جو ماہنامہ نصرت کے شمارہ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہُوا سچ مُچ مشاعرہ لُوٹ لیا۔ ادارہ قومی تعمیر نو نے اس مضمون کے آف پرنٹس ایوانِ صدر میں تقسیم کی غرض سے بھیجے۔

بدقسمتی سے اس مضمون کے مندرجات کو فیلڈ مارشل ایوب خاں اپنے طور پر استعمال نہ کر سکتے تھے کیونکہ رامے صاحب نے نظریہ جمہوریت کو بقول شاعر

واجب القتل اُس نے ٹھہرایا

آیتوں سے روایتوں سے مجھے

یعنی ساری بات قرآن کے حوالے سے کی تھی اور ایوب خاں دینی معلومات کے سلسلے میں اپنے متعلق کسی خوش فہمی کا شکار نہ تھے لہٰذا انھوں نے خالصتاً دینی مباحث میں اُلجھنے سے ہمیشہ گریز کیا البتہ ایسا لگتا ہے کہ جمہوریت اور سیاسی جماعتوں کی تکذیب کے لیے صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے رامے صاحب کی بھولی بسری تحریروں سے ضرور استفادہ فرمایا ہے۔ کہیں کہیں تو الفاظ و معنی میں تفاوت بھی برائے نام ہے۔ مثلاً جنرل صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ انتخابات ضرور کروائے جائیں۔

رامے صاحب کا جمہوریت کے بارے میں طرزِ استدلال بھی ایسا ہی ہے۔ اپنے ایک مضمون "سیاسی جماعتیں اور جمہوریت" میں جو ان کی تصنیف "باز آؤ اور زندہ رہو" میں شامل ہے، لکھتے ہیں

"نام نہاد جمہوریت کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ ذکر ہے تو اس بات کا کہ عوام الناس کی اکثریت جاہل ہوتی ہے اور اکثریت کوئی فیصلہ کن قدر نہیں۔"

رامے صاحب کا دو پیراگراف پر مشتمل اداریہ اور اگلے "چند صفحات" اس قدر دلچسپ ہیں کہ آج بھی اتنے ہی تر و تازہ ہوں گے جتنے کہ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں تھے۔ انھیں پیش نہ کرنا رامے صاحب اور قارئین دونوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ملاحظہ ہو۔

سامری کا بچھڑا اور بندھے ہُوئے ہاتھ

حنیف رامے

ہمیں ایک طرف تو اسلام کا دعویٰ ہے اور دوسری طرف ہم ہر سیاسی نظام کو اِس نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ شاید اسی میں ہمارے دکھوں کا علاج مضمر ہو۔ جمہوریت اور جمہوریت کے سب سے اہم ادارے: سیاسی جماعتوں کے احیاء کے لیے کیا اخبارات، کیا اراکینِ اسمبلی، کیا علمائے اسلام سب یوں کوشاں دکھائی دیتے ہیں جیسے مسیحائی کا صرف یہی سرچشمہ رہ گیا ہے اور بس۔ اِدھر ہم یہ کہتے بھی نہیں تھکتے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے، دین جو انسانی زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے، سیاست پر بھی۔

بنی اسرائیل کو خدا نے آلِ فرعون کی بلائے عظیم سے تو نجات دلا دی لیکن ان کے دلوں پر اپنے سابق حکمران مصریوں کے دیوتا، سنہرے سانڈ کا ایسا رعب طاری تھا کہ وُہ خُدا کی تعلیم کو پس پشت ڈال کر کبھی چوری چھپے اسے پالتے تھے اور کبھی الاعلان سامری کے بچھڑے پر جان چھڑکتے تھے۔

خُدا نے ہمیں بھی اہلِ انگلستان کی غلامی سے نجات دلا دی ہے لیکن ہم بھی اپنے سابق آقاؤں کے خدائے خداوندان، جمہوریت کے سُنہرے بچھڑے کو اپنا خدا ماننے پر تلے ہوئے ہیں۔ وُہ جمہوریت جسے خُدا نے مشورے کی حد تک رکھا تھا اسے ہم اکثریت کا حکم بنانے کی ٹھان چکے ہیں وگوں کی اُس اکثریت کا حکم جو گمان کا پیرو ہے، جس کی نکیل ہوا و ہوس کے ہاتھ میں ہے۔ کیا ہمارا یہی مقدر تھا کہ سامری کے اس نئے بچھڑے کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہیں؟ —— یہ چند صفحات اسی سوال سے بحث کرتے ہیں۔

اداریہ

سیاسی جماعتوں کی بحالی پر ایک نظر

سامری کا بچھڑا اور بندھے ہوئے ہاتھ

حنیف رامے

ہمیں ایک طرف تو اسلام کا دعویٰ ہے اور دوسری طرف ہم ہر سیاسی نظام کو اُمید کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ شاید اسی میں ہمارے دکھوں کا علاج مضمر ہو۔ جمہوریت اور جمہوریت کے سب سے اہم ادارے: سیاسی جماعتوں کے احیاء کے لیے کیا اخبارات، کیا ارکین اسمبلی، کیا علمائے اسلام سب یوں کوشاں دکھائی دیتے ہیں جیسے مسیحائی کا صرف یہی سرچشمہ رہ گیا ہے اور بس۔ ادھر ہم یہ کہتے بھی نہیں تھکتے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے، دین جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے، سیاست پر بھی۔

بنی اسرائیل کو خدا نے آل فرعون کی بلائے عظیم سے تو نجات دلا دی لیکن ان کے دلوں پر اپنے سابق حکمران مصریوں کے معبود بیل 'سنہرے سانڈ' کا اس قدر رعب طاری تھا کہ وہ خدا کی تعلیم کو پس پشت ڈال کر کبھی چوری چھپے اسے پالتے رہتے اور کبھی علی الاعلان سامری کے بچھڑے پر جان چھڑکتے تھے۔ خدا نے ہمیں بھی اہل انگلستان کی غلامی سے نجات دلا دی ہے لیکن ہم بھی اپنے سابق آقاؤں کے خدائے خدا؛ یعنی جمہوریت کے سنہرے بچھڑے کو اپنا خدا ماننے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ جمہوریت جسے خدا نے مشورے کی حد تک رکھا تھا اسے ہم اکثریت کا حکم بنانے کی ٹھان بیٹھے ہیں، لوگوں کی اس اکثریت کا حکم جو گمان کی پیرو ہے، جس کی نکیل ہوا و ہوس کے ہاتھ میں ہے۔ کیا ہمارا یہی مقدر تھا کہ سامری کے اس نئے بچھڑے کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہیں؟ —— یہ چند صفحات اسی سوال سے بحث کرتے ہیں

سامری کا بچھڑا اور بندھے ہوئے ہاتھ

سیاسی جماعتوں کی بحالی پر ایک نظر

وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشٰهُ (الاحزاب: ۳۷)

(۱)

اللہ کا اعلان ہے کہ اُس نے اہل ایمان کے لیے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اس دین کی تکمیل کے لیے جو رحمت آخریں وحی نازل ہوتی تھی وُہ پوری ہوگئی ہے اور اس دین کا نام اسلام ہے (المائدہ ۳۰) اس طرح اسلام کا مطلب یہ ہُوا کہ اہل ایمان اللہ کے حضور اُس تعلیم کے مطابق تسلیم بجالائیں جو قرآنِ عظیم کی شکل میں خود اللہ نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی ہے۔ یہ ایک سیدھی، صاف اور کھری بات، اگر ہمیں قبول ہو تو وُہ سارا غبار چھٹ سکتا ہے جو مسلمانوں کے دل و دماغ میں اسلام کے تذکرے سے پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اسلام کیا ہے؟ اسی ایک سوال کے واضح جواب کے فقدان نے سائنس اور فلسفے پر کفر کے فتوؤں اور فنونِ لطیفہ کے خلاف مظاہروں کا در باز کیا ہے اور انسانی زندگی کے ان ضروری عناصر کو دبانے کے جرم میں افتراق و انتشار اور سقوط و زوال آمادگی کی پھسلن عام کی ہے۔ آج کوئی دو مسلمان اسلام کی اساس پر شاید ہی باہم متفق پائے جاتے ہیں۔ یہ اُس اسلام کا حال ہے جسے اللہ نے آسان بنایا ہے۔ اس آسانی کو تاریخِ اسلام میں ہمیشہ عملی سطح پر تلاش کیا گیا حالانکہ اسلام کی آسانی اس کی اساس یا بنیادی تعلیم کی بنا پر ہے۔ اسلام کی بنیاد قرآنِ حکیم کے مطابق مختصراً یہ ہے کہ بندگی کے لائق صرف ربِ العالمین ہے اور اس بندگی کے راستے کو قرآن کی تعلیم تا ابد منوّر کرتی رہے گی۔ اُس قرآن کی تعلیم جو بذاتہٖ فصیح ہے، مبین ہے، مفصّل ہے، مکمل ہے، جسے اسی کی آیات کی تعریف کی روشنی میں پڑھا جائے تو اہلِ علم کے لیے اس کے نور سے اپنا دامن بھرنا آسان ہے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ اسلام کی تعلیم

یا قرآن کی تعلیم کو عملی صورت دینا آسان ہے یہ غلط ہے، صبر و استقامت کا یہ گیر اصول لازم اللہ نے یونہی نہیں وضع کیا۔ مسلمانوں کی تاریخ البتہ یہی رہی ہے کہ اُنھوں نے اسلام کی تعلیم یا قرآن پر تو اُلجھی ہوئی روایتوں اور تفسیری تفصیلوں کے گراں بار پردے ڈال کر اسے ناقابلِ فہم بنانا چاہا ہے اور عملی زندگی کو آہستہ آہستہ، بغیر مُنہ سے اقرار کیے، دین سے جدا کر کے آسان بنا کے رکھ دیا ہے۔ کبھی قیلولہ و کنیز اور خمار و قمار کی خاطر، کبھی حریفوں سے مسابقت کے باعث صنعت و تجارت اور حریّت و جمہوریت کے نام پر۔

ہمارے نئے آئین کی رُو سے دستور سازی کے میدان میں ہمارا کوئی قدم اسلام کی تعلیم کے خلاف نہیں اُٹھ سکتا۔ لیکن اسلام کس چڑیا کا نام ہے، جب یہی معلوم نہ ہو تو ظاہر ہے کہ بھانت بھانت کی بولیوں اور مادر پدر آزاد تجویزوں کا جلوس اچھا خاصا بحران پیدا کر دے گا۔ چنانچہ اتفاق سے ایک عائلی قوانین جو ذرا اسلام یا قرآن کی تعلیم سے ہم آہنگ محسوس ہوتے تھے وہ اسلامی مشاورتی کونسل کو ارسالِ خدمت کر دیے گئے ہیں کیونکہ ملک بھر میں اِن کے بارے میں خلجان خیز بحث و مباحثہ شروع ہو گیا تھا۔ اب اسلامی مشاورتی کونسل اِن قوانین کے بارے میں اپنی رائے قومی اسمبلی میں پیش کرے گی کہ یہ اسلامی ہیں یا نہیں۔ اللہ کا کہنا ہے کہ قرآن کے منکر قرآن کی تعلیم کو اتنے ہی وثوق سے جانتے ہیں جتنے وثوق سے وُہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ لیکن جب دلوں میں شرک کی گوناگوں شکلیں گھر بنا لیں اور اللہ کی تعلیم کے ساتھ نبیوں، صحابیوں، اماموں، فقیہوں، صوفیوں کے اقوال بھی دینی حجّت قرار دے لیے جائیں تو پھر عائلی قوانین تو ایک طرف رہے اِس بات کا انتظار کرنا چاہیے کہ علمائے اسلام عوامی جلسوں میں بانگِ دہل یہ بتائیں کہ کس کس حدیث اور روایت نے اللہ کے کس کس قانون کو منسوخ و معطّل کر دیا ہے۔ ابھی تو یہ تحقیقات صرف عالمانہ تصنیفات کی زینت ہیں ذرا عملی زندگی کو اسلام سے ہمکنار ہونے یا اسلامی دستور کو نافذ ہونے کی گنجائش کو سامنے آنے دیجیے شرک کے کیا کیا نئے آفاق بے نقاب ہوتے ہیں۔

ہم نے قرآن سے میل کھاتے عائلی قوانین کو تو اسلامی مشاورتی کونسل کے پ

کر دیا ہے کہ اگر پریس اور علمائے اسلام انھیں اسلام کے منافی سمجھتے ہیں تو ان پر از سر نو غور ہو جائے لیکن ہم نے سیاسی جماعتوں کو قبول کر لیا ہے اور ذرا بھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ آیا اسلام یا قرآن کی تعلیم اس اقدام کی توثیق کرتی ہے یا نہیں۔ شاید یہاں پریس کے ساتھ قومی اسمبلی کے ممبروں کے پرزور مطالبوں کو اسلام کی آواز سمجھ لیا گیا ہے اور اس بات کی حاجت ہی محسوس نہیں کی گئی کہ اتنے اہم فیصلے پر دو گھڑی رک کر غور کیا جاتا کہ آخر یہ کس حد تک اسلام سے لگا کھاتا ہے۔ کیا حکومت نے ان علمائے کرام کے دوغلے پن کے آگے ہتھیار ڈال لیے ہیں جو ایک طرف تو احیائے اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف جمہوریت یا رفاہی مملکت کو عین اسلام سمجھتے ہوئے مکمل جمہوریت اور عوامی خواہشات کی تکمیل کا نعرہ لگاتے رہتے ہیں یا پھر کیا حکومت اس پریس کے پھندے میں آگئی ہے جس کا خدا اخبار کی اشاعت میں اضافے کے سوا کچھ نہیں۔ حالانکہ پریس کو اہمیت دینے کا رواج جہاں سے ہمارے ہاں منتقل ہوا ہے خود وہاں "امریکی المیہ" کے مصنف: تھیوڈور ڈرائنرز کا کہنا ہے کہ اب ہمیں پریس کی آزادی کے بجائے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے پریس سے آزادی اور "عقل کا گھر" کے مصنف: ژاک بارزون کے خیال میں پریس کے ہاتھ میں آئی ہوئی مقدس سے مقدس بات گھٹیا اور پھٹیچر بن کر رہ جاتی ہے، اور انگلستان کا مشہور ادیب اور اخبار نویس چیسٹرٹن اکثر کہا کرتا تھا کہ اخبار تو یوں سمجھیے وہ کاغذی چیتھڑا ہے جس پر اشتہارات درج ہوتے ہیں اور ان اشتہارات کی پشت پر چند خبریں۔ اور میں یہ کیسے باور کروں کہ حکومت اخبارات کو ایسی ہی اہمیت دیتی ہے جب کہ حال ہی میں مغربی پاکستان کے چیف جسٹس کے تقرر کے معاملے میں اخبارات کی ایک نہیں چلی۔ گویا ہر پھر کر بات یہاں آپہنچی ہے کہ اسلام کی اساس: قرآن مجید آنکھ سے اوجھل نہ ہو یا، ہم جان بوجھ کر اللہ کی اس تعلیم سے منہ نہ پھیر لیں تو پھر آج ہمارے طرز عمل میں جو تضاد و بے ربطی ہے وہ سلجھ بھی سکتی ہے۔ لیکن قرآن سے تو ہماری جان جاتی ہے۔

بہر حال دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اسلام کا اصل اصول: قرآن مبین کس حد تک

سیاسی جماعتوں کے وجود کا متحمل ہو سکتا ہے۔ قرآن کے بارے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ نے اسے نہ صرف پہلی کتابوں بلکہ تمام تر علم کا مصدق مقرر کیا ہے کہ ہر وُہ نظریہ یا طرزِ عمل جو قرآن کے مفصل یا مجمل اصولوں کے مطابق ہو اُسے قبول کرنے میں اہلِ ایمان کو عار نہ ہو اور جو اس کے اصولوں کے اُلٹ ہو اسے رد کرنے میں اُنھیں پس و پیش نہ ہو۔ اب قرآن میں سیاسی جماعتوں کی بحالی کے نام سے تو کوئی آیت یا صورت نہیں ہے، ہاں سیاسی جماعتوں کے وجود کے پس پردہ جو اصول کام کرتا ہے اُس کو قرآن کے نُور سے ضرور پرکھا جا سکتا ہے (اس ضمن میں نصرت کے ایک اداریے "سیاسی جماعتیں اور جمہوریت" میں پہلے بھی چند دلائل پیش کر چکا ہوں۔ اب ذرا تفصیل سے اس اصول کا تجزیہ ہونا چاہیے)۔

قرآن میں تفرقے کو ان قوموں کا خاصا بتایا گیا ہے جن پر اللہ کا غضب نازل ہُوا اور اہلِ ایمان کو بار بار اس لعنت سے باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ علمائے اسلام نے اللہ کے بندے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ڈھونڈ رکھی ہے جس میں تفرقہ یا فرقے بازی ملتِ اسلامیہ کے لیے باعثِ رحمت بتائی گئی ہے۔ اب یہ لوگ رسول اللہ کو قیامت کے دن کیا مُنہ دکھائیں گے، یہ ان کے اپنے سوچنے کی بات ہے۔ میں تو اس موقع پر محمدؐ کے دو برگزیدہ بھائیوں موسیٰؑ و ہارونؑ کے ایک اُسوۂ حسنہ کی یاد تازہ کرنا چاہتا ہوں۔ جب موسیٰؑ چالیس راتوں کے لیے بنی اسرائیل سے جُدا ہو کر اللہ سے وحی پانے گئے تو وُہ اپنے بھائی ہارونؑ کو اپنا خلیفہ مقرر کر گئے۔ ہارونؑ خود بھی نبی تھے چنانچہ موسیٰؑ کو اعتماد تھا کہ وُہ صلح صفائی سے کام لیں گے اور فساد نہ پھیلنے دیں گے۔ (الاعراف: ۱۴۲) اِدھر بنی اسرائیل جن کے دل اپنے سابق حاکم: اہلِ مصر کے دیوتاؤں سے چور تھے کبھی چوری چوری اِنھی کی طرح سُنہرا سانڈ پالنے کی تدبیر کرتے تھے اور جب خُدا نے اس تدبیر کا پردہ چاک کر دیا۔ (البقرہ: ۷۱-۶۷) تو اب اُنھوں نے نعم البدل کے طور پر سامری کی مدد سے اپنے زیوروں کی دھات گلا کر ایک بچھڑا یا چھوٹا سا سانڈ بنوا لیا اور اسے پوجنے لگے۔ جب موسیٰؑ پلٹے اور قوم کو اس

عالم میں پایا تو غضبناک ہو کر ہارون ؑ سے دست و گریباں ہو گئے کہ تم نے جب اُنھیں یہ ظلم ڈھاتے دیکھا، تو کیوں چُپ سادھے رہے۔ ہارون ؑ نے کہا "مجھے یہ خیال تھا کہ آپ آ کر یہ کہیں گے کہ میں نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور یوں آپ جو فساد سے بچنے کی نصیحت کر گئے تھے اِس کو بھلا بیٹھا۔" (طٰہٰ: ۹۴-۹۲)

جس طرح وحدتِ خداوندی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا شرک ہے اسی طرح وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کرنا بھی اہلِ ایمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا اور اگر دین میں زندگی یا سیاست یا کاروبارِ مملکت بھی شامل ہیں تو مذہبی تفرقے کے ساتھ ساتھ سیاسی یا دینوی تفرقہ بھی مقبول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ دین کے وسیع اور پورے معنی ذہن میں رکھتے ہوئے قرآن کی یہ آیات دیکھیے۔ "اے انسان! اپنا رُخ دینِ حنیف کی طرف پھیر لے، اسے اللہ نے بنایا ہے اور انسان کی ساخت کا تقاضا یہی ہے کہ وُہ اِس دین سے اپنے وجود کو ہم آہنگ کرتا چلا جائے، اللہ نے جو چیز جس انداز سے بنائی ہے وُہ ویسی کی ویسی رہے گی اور یہ دین (جسے اللہ نے اسلام کا نام دیا ہے) یونہی قائم رہے گا (اسے قائم رہنے والے خُدا نے بنایا ہے، اِسے کسی فانی نبی، صحابی، امام، فقیہہ، صوفی کے اقوال بدل نہیں سکتے) بس اللہ کی جانب جھکے رہو، تقویٰ و صلوٰۃ تمھارا شعار ہو اور مشرکین میں تمھارا شمار نہ ہو جو اپنے دین میں تفرقہ ڈال لیتے ہیں اور گروہ بندیاں کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور اِن میں سے ہر گروہ (حزب) اپنے مسلک پر خوش ہوتا پھرتا ہے۔"
(الرّوم: ۳۲-۳۰)

کسی مسلمان سے دین کے معنی پوچھ لیجیے، وُہ مُنہ سے دین اور دُنیا میں تفریق نہیں کرے گا۔ وُہ تو دین کو پوری انسانی زندگی پر محیط بتائے گا۔ اگر اللہ ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم دین میں تفرقہ نہ ڈالیں اور دین صرف نماز روزے ہی کا نام نہیں بلکہ حیاتِ انسانی کے تمام پہلوؤں پر مشتمل ہے تو آخر ہم کس مُنہ سے اپنی سیاسی اور سماجی زندگی میں تفرقے کو جائز قرار دے سکتے ہیں۔ گروہ بندی یا پارٹی بازی تو اِس ملّت میں ہو جہاں کوئی مرکزی لائحہ عمل موجود نہ ہو، جہاں دین اور دُنیا الگ الگ ہوں، جہاں خدا کو عبادت گاہ

کی حدود سے باہر کوئی اختیار نہ ہو۔ اسلام کی تو سب سے اہم فضیلت ہی یہ تھی کہ اس کے باعث لوگ ایک مرکز پر جمع ہو کر اللہ کے قانون کی اطاعت و نفاذ کے رشتے سے ایک ہو گئے۔ سورہ آل عمران کی ایک سو تیسری آیت لوگوں کو اکثر زبانی یاد ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص۔ "اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقہ پردازی نہ کرو۔" اسی آیت کا اگلا حصہ یوں ہے: "اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو نہ بھلاؤ کہ تم باہم دشمن تھے لیکن اُس نے تمھارے دلوں میں ایک دُوسرے کے لیے اُلفت ڈال دی اور تم اِس کی نعمت کے باعث بھائی بھائی بن گئے۔ تمھاری یہ حالت تھی کہ تم آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے لیکن اللہ نے تمھیں اس سے بچا لیا۔ اللہ اپنی آیات کھول کھول کر تمھارے سامنے رکھ رہا ہے تاکہ تم راہ پا سکو۔" ایک آیت چھوڑ کر پھر یہ ذکر آتا ہے: "تم تفرقہ پردازوں کی راہ پر نہ چل نکلنا کہ اللہ کے واضح احکامات کے باوجود باہم اختلافات میں اُلجھ جاؤ۔ ایسے لوگوں پر عذابِ عظیم نازل ہو کر رہے گا۔" آج ہم اپنی سماجی اور سیاسی بلکہ انفرادی زندگی پر بھی ایک نظر ڈالیں تو اِس عذابِ عظیم کے نزول میں کون سی کسر باقی محسوس ہوتی ہے؟

اللہ کے نزدیک امت ایک وحدت ہے۔ سورۂ انبیاء کی ۹۲ ویں آیت ملاحظہ ہو: "یہ تمھاری اُمت ایک اُمتِ واحدہ ہے۔" بلکہ اللہ تو پوری انسانیت کو اپنے عالمگیر دین کے ذریعے ایک ہی وحدت میں ڈھالنے کی راہ دکھاتا ہے: "انسان پہلے ایک ہی امت تھے" (البقرہ: ۲۱۳) لیکن لوگوں نے زیادتیاں کیں تو اللہ نے سزا یا عذاب کے طور سے اُنھیں گروہوں میں بانٹ دیا (الاعراف: ۱۶۸)۔ گروہ بندی یا پارٹی بازی میں سزا یا عذاب کا پہلو یہ ہے کہ: "تنازعات سے ایسی کم ہمتی پیدا ہوتی ہے کہ ملت کی ہوا اکھڑ جاتی ہے۔" (الانفال: ۴۶) اب اس سزا یا عذاب کے مقابلے میں کسی ملت پر اللہ کا انعام یا ثواب دیکھیے: "اللہ نے اہلِ ایمان کے دلوں میں باہم الفت ڈال دی، اگرچہ یہ لوگ دُنیا بھر کا مال و زر صرف کر دیتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ ہو پاتی، یہ تو اللہ ہی ہے جس نے ان کے درمیان اُلفت اُبھار دی ہے۔ سچ تو یہ ہے

کہ وہی صاحبِ غلبہ و حکمت ہے۔" (الانفال : ۶۳)۔ وہ شیرازہ بندی، وہ وحدت، وُہ اُلفت جسے دُنیا بھر کے خزانے بھی نہ خرید سکتے تھے اسے مسلمان آج، کیا علمائے اسلام اور کیا اراکین اسمبلی، ہر" داعیٔ حق" کی اطاعت میں مالِ مُفت کی طرح لُٹا رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اسلام کا دعویٰ بھی جاری ہے۔ منافقت اور اتنی سینہ زوری سے۔" جب اِن سے کہا گیا کہ جو تعلیم اللہ دے رہا ہے اسے اہمیت دینا اور اس پر کان دھرنا تو اُنھوں نے کہا کہ ہاں ہم کانوں سے سُن تو لیں گے لیکن مانیں گے نہیں، عمل پیرا نہ ہوں گے۔" (البقرا ۹۳)

شاید آپ سانپ کے کاٹے کی طرح رسّی سے ڈرتے ہوئے یہ سمجھیں کہ سیاسی جماعتوں کی بحالی کو جس قرآنی اصول کے معیار سے میں جانچ رہا ہوں وہ اس معاملے سے مناسبت نہیں رکھتا۔ لیجیے دو راہیں دیکھیے جن کے پیچھے قرآنِ عظیم کا یہ اصول جانے اَن جانے طور سے کارفرما ہے۔ یہ راہیں اس دَور سے تعلق رکھتی ہیں جب پاکستان میں بنیادی جمہوریت کا منصوبہ نیا نیا زیرِ عمل آ رہا تھا۔ بہاولپور ڈویژن کے کمشنر صاحب نے بیان دیا تھا" اب ایک ایسا نظام رائج ہوگا جس کے مطابق مُلک میں طبقاتی رسّہ کشی ختم ہو جائے گی اور سیاسی جماعتیں ناپید ہوں گی اور یُوں اِن کے باعث ملت ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچ جائے گی۔" (روزنامہ ڈان، کراچی۔ چار دسمبر ۱۹۵۹ء)۔

اب صدر مملکتِ پاکستان کا ایک اعلان سُنیے:" ہم نے یہ نیا نظام اسلام کی تعلیم سے اخذ کیا ہے۔ عام جمہوری نظام میں یہ ہوتا رہا ہے کہ حزبِ مخالف صِرف یہ کام کرتی تھی کہ برسرِ اقتدار جماعت کی مخالفت کرتی چلی جائے اور قومی مفاد کو ذرا بھی در خورِ اعتنا نہ سمجھے۔ اِدھر کمیونزم اور فاشزم نے یہ کیا کہ صِرف ایک سیاسی جماعت بنا کر ہر طرح کی انفرادی اور جماعتی مخالفت کو کچل کر رکھ دیا۔ اسلام اِن دونوں طریقوں کے خلاف ہے۔ جہاں بھی پارٹی بازی کی اجازت ہوگی وہاں ایک آزاد فرد کا کوئی مقام نہیں۔ اِسی لیے حضرت عمرؓ یہ لازم سمجھتے تھے کہ مشیر ایسے لوگ ہوں جو صاحبِ کردار ہوں اور کسی پارٹی سے وابستہ نہ ہوں۔" (روزنامہ ڈان کراچی۔

سولہ جون ۱۹۶۰ء) ۔

اب ایک محترم عالم دین کی رائے ملاحظہ ہو: "سیاسی پارٹیوں کی باہمی آویزشوں اور ٹکراؤ سے ملک کو جن ہولناکیوں کا سامنا کرنا پڑا اسے پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں سے یہ جواب ملتا ہے کہ فرعون کی سب سے بڑی ابلیسی حکمت یہ تھی کہ وُہ ملک کو پارٹیوں میں تقسیم کیا کرتا تھا۔ اسلام کے خُدا نے ملّت میں مختلف پارٹیوں کے وجود کو (خواہ وُہ مذہبی فرقے ہوں یا سیاسی پارٹیاں) اپنا غضب اور لعنت قرار دیا ہے اور اسے شرک ٹھہرا دیا ہے۔ جب تک ہماری یہ حالت رہے گی کہ ہمارے لبوں پر اسلام رہے گا اور دلوں میں مغربی معاشرت اور نظام کا تقدّس اور عظمت، ہم اسلام کے قریب کبھی نہ آسکیں گے . . . . پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسے مٹا دیا جائے . . . . اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کو پارٹیوں کی لعنت سے قانوناً پاک کر دیا جائے۔ ملّتِ اسلامیہ کے خلاف بہت بڑی سازش ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سازش کو کب تک روا رکھا جائے گا۔" (غلام احمد پرویز صاحب۔ طلوع اسلام غالباً ۱۹۵۴ء کا کوئی شمارہ)

میرا خیال ہے کہ اس موقع پر میں یہ پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ جب قومی اسمبلی اللہ کے اس غضب اور لعنت کو دعوت دینے پر تلی ہوئی تھی تو ان معزز حضرات نے اپنے اِن بیانات کو کیوں بھلا دیا؟ چلیے کمشنر صاحب اور صدر صاحب کے تو بقول اُن کے "ہاتھ بندھے ہوئے تھے"، قرآن کی تعلیم کے ایڈیشنوں نے اِس موقع پر اللہ کی آواز لوگوں کے کانوں تک پہنچانی کیوں ضروری نہ سمجھی۔ مانا کہ لوگوں کے کانوں میں علمائے اسلام کے اس فتوے کی گرانی تھی کہ اسلام اور جمہوریت مترادفات ہیں، مانا کہ لوگوں کی آنکھوں پر بے بصیرت اخبارات تنے ہوئے تھے لیکن کیا قرآن کی آواز اتنی ہی کمزور تھی کہ ملک اتنا "ہولناک" فیصلہ، چوری چھپے نہیں دن دہاڑے کرلے اور کوئی کسی کو۔ ٹوکے شاید یہ ہمارا شرف نہ تھا۔ اللہ کی تعلیم کے قیام و ثبات کا تو اللہ خود ضامن ہے۔ ہم اس شرف سے محروم رہے یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ لیکن اللہ نے شاید اب یہ باب عام

کرنے کی ٹھان لی ہے۔ ابھی دنوں میں نے ایک کتاب اُلٹ پلٹ کر دیکھی اور اس سلسلے میں میرے دل میں امید سی پیدا ہوئی کہ کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی سطح پر اللہ کی بات بندوں کو سُناتا ہی رہے گا کسی لیفٹیننٹ کرنل سید علی اسلم نے "اسلام کا جمہوری نظام" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ دو چار جملے سینئے: "اسلام کے جمہوری نظام میں حزبِ مخالف کا وجود مفقود ہے۔ موجودہ سیاست میں ایوانوں کی جو تشکیل حزبِ حکومت اور حزبِ مخالف کی صورت میں ہے وُہ صرف غیر اسلامی ہی نہیں بلکہ غیر فطری بھی ہے۔ طبعی اور فطری امکانات یہی ہیں کہ ایک معاملہ چند افراد کی سمجھ میں ایک ہی طرح سے آیا اس لیے وہ یکجا ہو گئے اور دُوسرا معاملہ اور طور سے آیا اِس لیے اِتّفاق رائے نہ ہو سکا۔ لہٰذا جو ایک دفعہ ممد و معاون تھے وُہ بہت ممکن ہے دُوسری دفعہ مخالف ہوں۔

(۲)

اِس مقام پر ہماری یہ بحث ایک ایسے موڑ پر پہنچ جاتی ہے جہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر سیاسی پارٹیوں کا وجود نہ ہو گا تو پھر کسی معاشرے میں جمہوری عنصر آخر کِس طرح پنپے گا؟

میں اپنے ایک پہلے اداریے "سیاسی جماعتیں اور جمہوریت" میں وضاحت کر چکا ہوں کہ اسلام میں جمہوریت کی حدود یہ ہیں کہ مِلّت کا قائد یا امیر یا سربراہِ حکومت مِلّت کے اہلِ حکمت سے ملکی و مِلّی معاملات میں مشورہ کر لیا کرے۔ عوام سے استصواب اس اعتبار سے فضول ہے کہ عوام کی اکثریت اپنی فوری خواہشات کی اسیر ہوتی ہے۔ ہاں اس سلسلے میں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ کوئی حکومت لوگوں کی مرضی کے خلاف زیادہ دن نہیں چل سکتی۔ اس لیے حکومت اور حکومت کے مشیروں کا ایک کام یہ بھی ہے کہ جن معاملات کو وُہ سلجھا رہے ہیں ان کے بارے میں یہ ثبوت بھی دیں کہ اِن کا طرزِ عمل کِس طرح اللہ کے قوانین کے مطابق ہے۔ اگر یہ طرزِ عمل خدا کی اطاعت سے متعین ہُوا ہے اور جانوروں جیسے حامیوں کی خواہشات کی اطاعت سے متعین نہیں ہوا تو انجام کے بارے میں زیادہ پروا نہ کرنی چاہیے ۔ یہاں پہنچ کر انسان کا کام ختم ہو جاتا ہے

اور اللہ پر توکل کا آغاز۔ اب اللہ جانے اور اس کا کام۔

حل طلب بات تو یہ ہے کہ سیاسی پارٹیوں کا وجود نہ ہوگا تو ملک میں طوائف الملوکی یا انارکی تو نہ پھیل جائے گی؟ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ   کیا وہی صورتحال پھر تو نہ پیدا ہو جائے گی، جب اسمبلیوں کے رکن آئے دن نئے الحاق کرتے رہتے تھے، آج اس جماعت میں ہیں تو کل دوسری ہیں۔

انارکی کے بارے میں دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ سیاسی جماعتوں کو وجود میں آئے دو سو سال سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور علم انسانیات کا دعویٰ ہے کہ انسانی معاشرے میں ریاست کا ادارہ پچھلے بیس ہزار سال سے کسی نہ کسی شکل میں قائم چلا آ رہا ہے۔ کیا انتشار و افتراق کی موجودہ مثالیں تاریخ انسانیت کے کسی دوسرے دور میں اتنی اجاگر نظر آتی ہیں اور اگر انارکی نے انسانی معاشرے کی اتنی دیر لگاتار خدمت کی ہے تو اس کے پیچھے کوئی معنویت نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آج کے مشہور جمہوری معاشروں میں بھی ایسے افراد کی مثالیں موجود ہیں جنھیں زمانہ اہلِ دانش مانتا ہے اور جن کے نزدیک انسانوں کے لیے انارکی سے بہتر معاشرتی نظام ممکن نہیں۔ امریکی مصنف: تھورو کو اہلِ امریکہ آج بھی نہیں بھولے اور نہ دنیا بھولی ہے اور انگریز ادیب: ہربرٹ ریڈ کا نام تو ہمارے ملک میں بھی خاصا چلتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انارکی محض ایک گالی نہیں۔ لیکن اس سے اگر یہی سمجھا جائے کہ کس طرح معاشرہ بے راہ ہو جاتا ہے اور اس کی حرکت میں کوئی سمت باقی نہیں رہتی تو ذرا تاریخ اسلام ہی اُٹھا کر دیکھ لیجیے کہ رسول اللہؐ کے عہد میں، ابوبکرؓ کے عہد میں، عمرؓ کے عہد میں، جب سیاسی جماعتیں ناپید تھیں، کس حد تک اِس انارکی نے بے راہ روی پیدا کی۔

معاف کیجیے گا اسلام اور چیز ہے، جمہوریت اور چیز ہے۔ ہاں جب اللہ کے شریک ٹھہرانے میں ہمارے علماء کو اعتراض نہ ہو تو جمہوریت کو اسلام کے ساتھ نتھی کر دینے میں کیا باک ہو سکتا ہے۔ خدا اور اس کے بندوں کو ایک ہی مقام پر کھڑا کر دینے والوں کے لیے یہ بہت ہی آسان بات ہے کہ وہ اسلام اور جمہوریت کا وصل بھی عام کر

کر دیں۔ اسلام تو صرف دو حقیقتوں کا معترف ہے۔ افراد اور ملّت۔ اقبال نے کہا تھا:
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ کوئی فرد ملّت سے کٹ کر، درخت سے جدا ہو کر،
ڈیڑھ پتّے کی الگ مسجد نہیں بنا سکتا۔ مسجد ضرار کی طرح یہ مسجد ڈھے کر رہے گی یا پھر
یہ قائم رہے گی تو ملّت کا درخت بھی زیادہ دن کھڑا نہ رہ سکے گا۔

سیاسی جماعتوں کے وجود کے لیے ایک چیز بنیاد کا حکم رکھتی ہے۔ ہر سیاسی
جماعت لوگوں کی چند خواہشات کی تکمیل چاہتی ہے اور اس دعوے کی بنا پر ایسی
خواہشات رکھنے والے لوگوں کو اپنے گرد جمع کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اسلام نے
انسان کی خواہشات کو بے لگام نہیں رہنے دیا۔ قرآن حکیم بعض خواہشات کو جائز
اور بعض کو ناجائز قرار دیتا ہے، پھر جائز خواہشات کی تکمیل کے لیے لائحۂ عمل بھی
پیش کرتا ہے۔ اب یا تو لوگ اسلام کے دائرے میں رہیں اور ایک خاص انداز اور
نوعیت کی خواہشات سے دست بردار ہو جائیں، اور اگر انھیں ناجائز خواہشات
کی تکمیل کی بھی لگن ہے تو اسلام سے الگ ہو جائیں۔ یہ کیا ہوا کہ اسلام کا نام بھی لیں
گے اور سنہرا سانڈ بھی پوجیں گے۔ ایک سے ایک بڑا سامری ہم میں موجود ہے جو
اسلام اور جمہوریت کو ایک کر کے دکھا سکتا ہے۔ ایسے کئی "ترجمان القرآن" ہیں جنھیں
ان دنوں اسلام کے ساتھ ساتھ جمہوریت بھی بہت عزیز خاطر ہے۔ انھیں بھٹکے ہوئے
مسلمانوں کی رہنمائی کا بھی دعویٰ ہے اور ساتھ ہی وہ اپنے سابق حاکم انگریز کی وراثت،
جمہوریت کے سنہری بچھڑے کو بھی محفوظ و مامون رکھنے کی تدبیر کرتے رہتے ہیں۔

اللہ کے یہاں تو سب اہل ایمان بس ایک ہی جماعت ہیں — حزب اللہ۔ اگر آلِ
عمران کی ایک سو چوتھی آیت سے کسی اسلامی جماعت کا جواز بھی نکالا جائے تو سراسر زیادتی
ہو گی، آلِ عمران کی ایک سو دسویں آیت پوری ملّت اسلامیہ کے ذمے وہ فریضہ ڈال
رہی ہے جسے ہمارے علما محض اپنا حق (اپنا فرض نہیں) سمجھتے ہیں۔ امر بالمعروف اور
نہی عن المنکر کرنے والوں کے لیے یہ شرط نہیں کہ وہ سیاسی عزائم کے تحت ایک
پارٹی میں بھی ڈھل جائیں۔ اسلام میں تو اطاعت صرف اللہ کے قانون کی ہے یا اس

کی جو اس قانون کے نفاذ کا ذمہ دار ہو۔ پارٹی تو یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اس کا رکن اس کی بھی اطاعت کرے اور کتنی سیاسی پارٹیاں یا مذہبی جماعتیں ہیں جو اللہ کے قانون کی اطاعت کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں ؟

اسلام کے قانون قرآن میں درج ہیں۔ قرآن میں انسانوں کی خواہشات میں تمیز کر دی گئی ہے کہ دُنیوی زندگی میں اس طرح چلنا چاہیے کہ آخرت نظر انداز نہ ہو جائے۔ قرآن بار بار انسانوں کی اکثریت کے بارے میں یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وُہ اپنی فوری اور وقتی خواہشات میں قید ہے، دُنیوی زندگی کو آخرت یا مستقبل قریب و بعید پر (جس میں موت کے بعد کی بھی زندگی شامل ہے) ترجیح دینے کی عادی ہے۔ اب حزب اللہ یا اہلِ ایمان تو ایک ہی جماعت ہیں اور اِن کے لیے اصول موجود ہیں۔ پھر جو بھی سیاسی نوعیت کی جماعت بنے گی ظاہر ہے وُہ اِن اصولوں کے علاوہ دُوسرے اصولوں کے تحت بنے گی جو ظاہر ہے بڑی حد تک باطل ہوں گے۔ اس طرح سیاسی جماعتوں کا کام یہ رہ جاتا ہے کہ انسانوں کی فوری اور وقتی خواہشات کو ہوا دیں، آخرت کے مقابلے میں حیاۃ الدُنیا کو سامنے لاتے رہیں اور یوں بھائی بندوں کو گھیر گھیر کے آگ کے اس گڑھے کے کنارے پہنچاتے رہیں جس سے اللہ نے اسلام کے ذریعے سے اُنھیں بچانا چاہا تھا۔ اسلام کے نام لیوا یا تو ایک ہی جماعت رہ سکتے ہیں یا پھر اُنھیں اسلام کو خیر باد کہہ کر صاف اعلان کرنے کی جراُت پیدا کرنی ہوگی کہ ہمیں قرآن نہیں، سامری کے بچھڑے سے عقیدت ہے۔

جب اصول سامنے ہوں تو باقی کام ان پر عمل پیرائی کا ہے۔ جب مسلمان یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے اور اس میں تا ابد کی انسانی ضروریات کے لیے ہدایت ہے تو پھر کسی سیاسی جماعت کے وجود پر اس خیال سے صاد کرنا بے معنی ہے کہ یہ ایسے اصولوں پر قائم ہوئی ہے جو انسانی ضروریات کے مطابق ہیں۔ اور اگر سیاسی جماعتوں کو اصولوں کے سلسلے میں اہمیت نہ دی جائے، کہ حکم یا قانون یا اصول تو صرف اللہ کی وحی ہی ہو سکتی ہے، تو پھر طرزِ عمل کے معاملے میں سیاسی جماعتیں یوں

بھی کبھی اہمیت کی حامل نہیں رہیں۔ سیاسی جماعتوں کا وجود ہو یا نہ ہو نظریات کے مطابق عمل پیرائی ہمیشہ ایسے افراد کا کام رہی ہے جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں ـــــ افسر، تاجر، مزدور، کسان، سائنس دان، فلسفی، فنکار۔

عشق اور مشک کی طرح حکمت بھی چھپی نہیں رہتی۔ ملّت کا امیر اہلِ حکمت سے ملکی معاملات میں مشورہ لے گا اور اہلِ حکمت مشورہ دینے کے بعد اپنی اس ذمہ داری سے فارغ ہو جائیں گے۔ اب امیر کا کام ہے کہ ان دانشوروں میں سے خُدا کی اطاعت کے اصولِ اولین کے تحت، انتخاب کرے یا پھر خود اس نے کوئی ایسی بات سوچی ہو جو ان مشوروں سے بہتر ہو تو اس پر عمل کرے۔ اِدھر یہ اہلِ حکمت جن سے امیر مشورہ کرتا ہے پارٹیوں میں نہیں بٹتے۔ وُہ بھی ہر معاملے میں اللہ کی اطاعت کے اصولِ اولین کے تحت رائے دیتے ہیں، خواہ ایک مرتبہ جن ساتھیوں سے متفق ہوں انھی سے دُوسرے معاملے میں اختلاف ہو جائے۔ اللہ کی رسّی ان سب کو باہم پروئے رکھے گی۔ وُہ موتی موتی ہوتے ہوئے بھی ایک ہی مالا ہوں گے، تفرقے کی لعنت سے بچے رہیں گے۔ تفرقہ تو اس وقت شروع ہوتا ہے جب افراد گروہوں میں بٹ جاتے ہیں اور اس بٹائی کو ایک طرح کا قیام و استقلال حاصل ہو جاتا ہے یا یوں کہیے کہ افراد اپنی بصیرت کے بجائے گروہی قواعد و ضوابط کی تحریک سے متعین ہونے لگتے ہیں۔ ملت کی پراگندگی ضروری نہیں۔ ہاں چوری چوری سُنہرے سانڈ پال رکھے ہوں اور اللہ ان سانڈوں کی ایک ایک تفصیل بھی عیاں کر دے تو ہم یہی کہتے چلے جائیں گے کہ بات ابھی واضح نہیں ہوئی اس لیے ہم اِن سانڈوں کو ذبح نہیں کریں گے۔ بھئی نہ کرو لیکن پھر یہ تو نہ کہو کہ اسلام کے ٹھیکیدار بھی ہم ہیں۔

(۳)

عائلی قوانین کے ضمن میں صدرِ مملکت نے ایک مرتبہ خواتین سے معذرت کی تھی کہ قومی اسمبلی کے وجود میں آجانے کے بعد "میرے ہاتھ تو بندھے ہوئے ہیں"۔ عائلی قوانین جو اللہ کے احکامات سے قریب تھے اُنھیں تو قومی اسمبلی اور علمائے اسلام کے

داد دینے نے دوبارہ غور کی بھٹی میں ڈال دیا ہے۔ کیونکہ صدر مملکت کے "ہاتھ بندھے ہوئے تھے"! ادھر سیاسی جماعتیں جو قرآنی تعلیمات کے صریح منافی ہیں اُنھیں بحال کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ صدرِ مملکت کے "ہاتھ بندھے ہوئے تھے" آخر کس کے سامنے بندھے ہوئے تھے یہ ہاتھ؟ لوگوں کے سامنے؟ اللہ تو کہتا ہے کہ لوگوں سے (یا لوگوں کی اکثریت سے جو قرآن کے مطابق فاسق، ناشکری، غافل، کافر جاہل ہوتی ہے) نہ ڈرا کرو، یہ صرف اللہ کا حق ہے کہ مومن اُس سے ڈریں (التوبہ: ۱۳، الاحزاب: ۳۷) صدر ہو یا اسمبلیوں کا کوئی رکن ہو، بڑے سے بڑا ہو یا چھوٹے سے چھوٹا سب کے ہاتھ صرف ایک ذاتِ عظیم کے سامنے بندھ سکتے ہیں اور بس ــــ وہ ہاتھ جنھیں اللہ نے صرف اپنے سامنے باندھا ہے، اپنے احکامات کی تعمیل کی خاطر باندھا ہے اُنھیں کسی دُوسرے کے سامنے نہ تو باندھنا چاہیے نہ بندھا ہوا محسوس کرنا چاہیے۔ سنئے سامریوں اور سامری کے تئیے پیروکاروں سے ڈرنا کسی امیر کا تو کیا کسی بھی اہلِ ایمان کا مسلک نہیں ہو سکتا۔ سامری اور اس کے پیروکار زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ہارونؑ کے قتل کے درپے ہو جائیں۔ لیکن اُوپر اللہ بھی تو موجود ہے، بلکہ وُہ تو ہر شخص کی شہ رگ پر بیٹھا ہے۔ اِن سامریوں اور ان کے پیروکاروں کو اپنی قبر میں پڑنا ہے اور ہمیں اپنی میں، اور جوابدہی ان کے سامنے نہیں اللہ کے سامنے ہوگی۔ اور کون ہے جو اس دن ہماری صلیب اُٹھائے گا۔ کوئی نہیں، کوئی نہیں۔

اور کیا یہ ہاتھ کسی آئین یا دستور کے سامنے بندھے ہوئے ہیں؟ اسلام کا تو ایک ہی آئین یا دستور ہے ــــ قرآنِ عظیم، واحد قولِ ثابت۔ اِس ابدی نور، اس شفاءٌ للمومنین، اس بیانٌ للناس کی موجودگی میں مسلمانوں کو آخر کس دُوسرے دستور کی حاجت ہے ــــ کیا اُنھیں اللہ کے اس دعوے پر بھروسا نہیں کہ قرآنِ حکیم میں انسانی زندگی کی ہدایت کے لیے ہر اصول اور تفصیل طے کر دی گئی ہے؟ ملکی دستور کو جمہوری بنانے کی مہم تو سائر ہے ہی، پوچھنے والی بات تو یہ ہے کہ قرآن کے ہوتے ہوئے کس دستور کی حاجت ہے، کس مہدی کا انتظار ہے؟ ــــ رحمۃٌ للعالمین کے پاس کون سا دُوسرا دستور تھا، اِن کے خلفاء

کے پاس کونسا دُوسرا دستور تھا؟ اور جب تک یہ دستور نہ تھے فتور بھی نہ تھا، بعد میں دستور بھی تھے اور فتور بھی! جو کام ہمارے فقہاء کے نظاموں نے کیا، دین کو جس طرح اُنھوں نے کھڑے سڑے پانی کی جھیل بنا کر رکھ دیا، آج ایک مرتبہ پھر اُسی کے اعادے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ملّت ابھی پہلی ظلمت سے نکلی نہیں کہ اِس پر ایک نئی کالی گھٹا تانی جارہی ہے۔ فقہ کے نہلے پر دستور کا دہلا۔

ساری بات یہ ہے کہ جب تک افراد قرآن کی تعلیم کے مطابق اپنی بعض خواہشات کو ناواجب اور غیر ضروری نہیں مانتے جمہوریت کی خواہش بھڑکتی رہے گی کہ صرف اسی کے راستے لوگوں کی اکثریت اپنی فوری اور وقتی خواہشوں کو تسلیم کرا سکتی ہے، پورا کرا سکتی ہے۔ اور جوں جوں جمہوریت جڑیں پکڑے گی ریاست کا کاروبارِ مملکت پیچیدہ سے پیچیدہ کام بنتا چلا جائے گا، انسانی اختیار سے باہر ہوتا چلا جائے گا۔ صرف ایک ہی راستہ ہے کہ افراد اپنا اپنا بوجھ اُٹھائیں اور اپنی خواہشات کو آخرت کے پیشِ نظر لگام دیں۔ ہر دستور صرف یہ کرتا ہے کہ انسانوں کے لیے عمل کی حدود متعین کرتا ہے۔ کیا حدود اللہ ہمارے لیے واضح نہیں، کیا اِن کے اندر انسان کو آزادی نہیں دی گئی، کیا اللہ کا دستور اِس کے بندوں کے لیے کافی نہیں؟ اور یہ تو سوچیے کہ انگلستان کا دستور کہاں ہے؟ اِس کا کوئی تحریری دستور ہے ہی نہیں۔ اور امریکہ میں بھی اب نئی ذہین آوازیں یہی کہہ رہی ہیں کہ تحریری دستور ہونا ہی نہیں چاہیے (ایڈونچرز آف مائنڈ، دوسری جلد میں، سائرل نارتھ کوٹ پارکنسن کا مضمون: "کیا جمہوریت پنپ سکتی ہے" ۔ دیکھیے) لیکن ہمارا دستورِ حیات تو قرآن کی صورت میں ہمیشہ کے لیے موجود ہے، ہمیں تو نئے دستور گھڑنے میں وقت ضائع کرنا ہی نہیں چاہیئے۔

فرقانِ حمید اور اِسکی میزان میں تُلا ہُوا علم ہمارے پاس ہے تو ہم اپنی صبح و شام بدلتی ہوئی تقدیر کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے کہ خالقِ اکبر ہمیں یہی اُمید دلاتا ہے۔ جمہوریت ہو یا رفاہی مملکت، اشتراکیت ہو یا آمریت، یہ سب حدود اللہ سے نکلنے، اللہ سے گریز کے بہانے ہیں۔ لیکن ارض و سموات پر محیط، قوی و عزیز، اعلیٰ و عظیم اللہ سے بھاگ کر کوئی جس بھی پناہ گاہ میں چھُپے گا وُہ اُسے اُگل کر رکھ دے گی۔

حنیف رامے

پیر صاحب

ایک جانے پہچانے اور نامی گرامی پیر صاحب نے صدر پاکستان سے ملاقات کی درخواست کی۔ فیلڈ مارشل صاحب کی منظوری کے بعد اُنھیں بلایا گیا۔ ملاقات کے لیے ساڑھے دس بجے کا وقت دیا گیا مگر پیر صاحب نو بجے سے پہلے ہی ایوانِ صدر تشریف لے آئے۔ کچھ دیر تک وُہ ملٹری سیکرٹری بریگیڈیر نوازش علی خاں کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ پھر بریگیڈیر صاحب نے اے ڈی سی کو بُلا کر کہا کہ پیر صاحب کو ویٹنگ روم میں بٹھا دو۔ نو بجے والے ملاقاتی ایک غیر ملکی مہمان تھے جو انتظار کر رہے تھے اگر اُن سے پہلے وزیرِ خارجہ منظور قادر تشریف لے آئے اور فیلڈ مارشل صاحب مصروف ہو گئے۔

پریزیڈنٹ کے اسسٹنٹ پی آر او نثار حسین درانی نے راقم کو دعوت دی کہ آؤ پیر صاحب کی زیارت کر لو۔ دونوں حاضرِ خدمت ہوئے۔ پیر صاحب غیر ملکی مہمان سے دور ہٹ کر اپنی سفید براق چادر میں سمٹے سمٹائے ایک صوفے میں دھنسے ہوئے تھے۔ آنکھیں نیم وا، سر جُھکا ہوا اور لب ہل رہے تھے۔ ہم نے ادب سے سلام کیا۔ ہمیں توقع تھی کہ پیر صاحب نبی اکرمؐ کی سُنت کے مطابق وعلیکم السلام کہیں گے مگر اُنھوں نے سر کی ہلکی سی جنبش سے ہمارے سلام کو شرفِ قبولیت بخشا اور اشارے سے ساتھ والے صوفے پر بیٹھنے کی ہدایت فرمائی جس کی ہم نے تعمیل کی۔ پیر صاحب نے حسبِ سابق سر کو جُھکا کر لب ہلانے شروع کر دیے۔ ہم خاموشی سے رُخِ انور کی زیارت کرتے رہے۔ غیر ملکی مہمان کبھی ہمیں اور کبھی ہمارے پیر صاحب کی طرف دیکھتا مگر پیر صاحب کسی کی طرف نہ دیکھتے۔

درانی صاحب سے زیادہ دیر تک "صُمٌ بکمٌ" بن کر نہ رہا گیا۔ دُعا کی درخواست کی جسکی پیر صاحب نے پذیرائی فرمائی۔ چادر کے اندر سے تسبیح سمیت ہاتھ باہر نکالا اور دستش

برخ کشید و دعا را بہانہ ساخت۔ بعد از دُعا اپنے دستِ شفقت کو آگے بڑھایا۔ ہم دونوں باری باری آگے کو جھکے اور شانوں پر تھپکی لی۔ سلام کر کے واپسی پاؤں آنے لگے تو پیر صاحب نے فرمایا خُدا خوش رکھے کبھی ڈیرے پر تشریف لانا۔

پیر صاحب کی دُعا آدھی قبول ہوئی یعنی خُدا نے ہمیشہ خوش رکھا۔ البتہ ڈیرے پر تشریف لے جانے کی سعادت حاصل نہ کر سکے۔

منظور قادر صاحب اور اُن کے بعد غیر ملکی مہمان کو ایوب خاں نے سوا گیارہ بجے فارغ کیا تو پیر صاحب کی باری آئی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد دیکھا تو اے ڈی سی پیر صاحب کو گاڑی میں بٹھا کر رخصت کر رہے تھے۔

درانی صاحب نے فوری طور پر پیش گوئی کر دی کہ پیر صاحب کے مرید ڈھنڈورا پیٹ دیں گے کہ صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے حضرت صاحب سے اڑھائی تین گھنٹے تک تنہائی اور بند کمرے میں ملاقات کی وغیرہ وغیرہ۔ پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور دُوسرے روز مقامی اخبار "تعمیر" میں تقریباً اسی قسم کی خبر درج تھی۔

ابھی ہفتہ نہ گزرا تھا کہ بذریعہ ڈاک حضرت پیر صاحب کی طرف سے فیلڈ مارشل کے نام خط موصول ہُوا۔ یہ خط انگریزی زبان میں ٹائپ شدہ تھا، البتہ دستخط اُردو میں تھے۔ فقیر۔ ۔ ۔ عفی عنہ۔ خط کا مضمون کچھ اِس طرح تھا کہ جنابِ والا۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ بندہ خود کو اسلام اور امتِ مسلمہ کی خدمت کے لیے ہمہ تن وقف کیے ہوئے ہے اور ہمہ وقت اسی کام میں مصروف و مشغول رہتا ہے۔ دن خلقِ خُدا کو رشد و ہدایت کی تلقین کرنے اور رات کا بیشتر حصہ صلوٰۃ و تسبیح میں گزر جاتا ہے۔ عیال داری بھی ہے جس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اِس مردِ ناتواں کے کندھوں پر ہے۔ خواہش ہے کہ بیوی بچوں کی کفالت کی طرف سے بے فکر ہو کر باقی ماندہ حیاتِ مستعار کو خدمتِ اسلام کے لیے وقف کیے رکھوں۔ آپ کی سفارش پر نواب آف کالا باغ صاحب نے چھ عدد روٹ پرمٹ عنایت فرمائے تھے جن کے لیے بندہ آپ کا اور نواب صاحب کا تہہ دل سے شکر گزار ہے۔ آپ سے کیا پردہ کثیر الاولاد ہونے

کی وجہ سے یہ بہت ناکافی ہے۔ لہٰذا التجا ہے کہ بندہ کو کم از کم چار سو ایکڑ نہری اراضی عطا فرما کر ثوابِ دارین حاصل کریں وغیرہ وغیرہ۔

میں نے لفافہ کھولتے ہی درانی صاحب کو آواز دی کہ لیجیے آپ نے پیر صاحب ۔ ۔ ۔ شریف کی زیارت کروائی تھی میں آپ کو اُن کے نامۂ مبارک کی زیارت کرا دیتا ہوں۔ خط پڑھ چکے تو فرمایا اتنے بڑے پیر اور صرف چار سو ایکڑ نہری اراضی نرخِ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔

خط کو پیڈ میں رکھا اور دُوسرے خطوط کے ہمراہ پریذیڈنٹ کو بھیج دیا۔

دُوسرے دن پریزیڈنٹ صاحب سے ڈاک واپس آئی تو پیر صاحب کے خط پر فیلڈ مارشل نے گورنر پنجاب کے نام حاشیہ میں چھوٹا سا نوٹ لکھا ہُوا تھا جسے میں یہاں نقل نہیں کر سکتا کیونکہ ایسا کرنے سے پیر صاحب کی فوراً شناخت ہو جائے گی جو میرا مقصد نہیں۔ پیر صاحب ابھی ماشاء اللہ بقیدِ حیات ہیں۔ میں ان کے مریدین کی جن کی تعداد لاکھوں میں بتائی جاتی ہے عقیدت کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا۔ ہم غریب غربا مشائخ عظام کو بڑی عزت سے دیکھتے ہیں تاہم خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لینے کا حوصلہ رکھنا کوئی بُری بات نہیں۔ گورنر پنجاب کو بھیجنے سے پہلے یہ خط میں نے اختر ایوب خاں کو دکھایا۔ جو لفظ فیلڈ مارشل صاحب نے پیر صاحب کے لیے استعمال کیا تھا اسی نام سے اختر ایوب خاں بھی پیر صاحب کو یاد کیا کرتے تھے۔ ان سے پُوچھا کیا یہ سچ ہے کہ فیلڈ مارشل پیر صاحب کے مرید ہیں جیسا کہ لوگوں میں مشہور ہے۔ کہنے لگے اسی لفظ سے اندازہ کر لیں کہ کیا کوئی مرید اپنے پیر کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے گا۔

ایوانِ صدر میں بھیک مانگنے والے اکثر آتے رہتے تھے۔ کوئی روٹ پرمٹ کا طلبگار تو کوئی امپورٹ یا ایکسپورٹ پرمٹ کا سوال کرتا۔ کوئی زرعی اراضی کی درخواست لے کر آتا تو کوئی کسی صنعتی لائسنس کی بھیک مانگتا۔ کوئی اپنی خدماتِ گزشتہ کو یاد دلاتا تو کوئی خاندانی وفاداریوں کا واسطہ دے کر رشوت لینے اور دینے کے جدید اور مہذب

طریقے استعمال کرتا ہے۔

سکندر مرزا کے دورِ اقتدار میں یہ کاروبار خوب چمکا مگر ایوب خاں کے دورِ اقتدار میں مندے کا رجحان رہا۔ تاہم کسی کسی کو چھوٹی موٹی ہڈی مل ہی جاتی تھی۔ اسلام کا واسطہ دے کر چار سو ایکڑ یعنی سولہ مربع نہری اراضی کی بھیک مانگ کر تو پیر صاحب نے حد کر دی۔ اگر یہی فقیری ہے تو خدا پاکستان کے بچے بچے کو فقیر کر دے یعنی چار سو ایکڑ نہری اراضی کے مالک۔ البتہ ایک مشکل ضرور ہوگی یعنی سب لوگ ایسے فقیر بن جائیں تو مرید یعنی مزارع کہاں سے آئیں گے۔

کہتے ہیں ایک دفعہ اقبال کی خدمت میں ایک پیر صاحب تشریف رکھتے تھے۔ اُن کے ایک مرید کو پتہ چلا کہ پیر صاحب اقبال کے پاس بیٹھے ہیں تو وُہ زیارت کے لیے وہیں آگیا۔ پیر صاحب سے درخواست کی کہ دُعا کریں وُہ پانچ سو روپے کا مقروض ہے خُدا قرض کی ادائیگی کی صورت پیدا فرمائے۔ پیر صاحب نے دُعا کی۔ دُعا کے بعد مرید نے پیر صاحب کی خدمت میں پانچ روپے نذرانے کے طور پر پیر صاحب کو پیش کیے۔ جو پیر صاحب نے رکھ لیے۔ جونہی پیر صاحب نے جیب میں روپے رکھے اقبال نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنی شروع کر دی "اے باری تعالیٰ اِس مرید کو ہدایت دے۔ یہ نادان ہے اتنا نادان کہ پہلے پانچ سو روپے کا مقروض تھا اب پانچ سو پانچ روپے کا مقروض ہو گیا ہے۔ خدایا اِس پیر صاحب کو بھی توفیق دے کہ یہ اپنے اس نادان مرید کا قرض اپنی جیب سے ادا کرے۔ مرید صاحب نے کھسیانا ہو کر مرید کے پانچ روپے واپس کیے اور قرض خود ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ شاید اسی واقعے کے متعلق اقبال کا یہ شعر ہو۔

نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقہ سالوس کے اندر ہے مہاجن

برصغیر پاک و ہند میں مدفون صوفیائے کرام، اللہ کی اُن پر رحمتیں ہوں، جن کی بدولت آج ہم مسلمان کہلاتے ہیں، اُنھوں نے تبلیغِ دین کے لیے کتنے مربع نہری اراضی طلب کی تھی اور کس سے کی تھی۔ خدمتِ دین کے لیے دستِ سوال دراز کرنا اور دستِ سوال

بھی دنیوی حاکم کے آگے۔

بنو عباس کے دور میں ایک بزرگ تھے عبداللہ بن محیرز اپنے عہد کے بڑے صاحب ورع وتقویٰ، کپڑا خریدنے بازار گئے۔ قیمت کم کرنا چاہی، دکاندار نہ مانا۔ دکاندار کا پڑوسی انھیں جانتا تھا، کپڑے والے سے کہا بھائی کچھ پیسے چھوڑ دو۔ جانتے ہو یہ کون ہیں؟ یہ عبداللہ بن محیرز ہیں۔ عبداللہ نے سنا تو اپنے لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگے بیٹے چلو یہاں ہم پیسوں سے کپڑا خریدنے آئے ہیں۔ اپنے دین سے نہیں۔ چنانچہ کپڑا خریدے بغیر واپس چلے گئے۔

دُوسرے پیر صاحب

ایوب خاں نے اقتدار حاصل کرنے کے کچھ عرصہ بعد غیر ملکوں میں پاکستانی سفیروں اور پاکستان کی مسلح افواج کے سربراہوں کو خط لکھ کر ان سے پاکستان کی خارجہ اور دفاعی پالیسی کے بارے میں اظہارِ خیال کے لیے کہا تھا۔

مسلح افواج میں سے ائیر مارشل اصغر خاں کا خط مندرجات کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ تھا یعنی اپنے ہمسائے ملک چین کی ابھرتی ہوئی قوت کی طرف اشارہ اور اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی ضرورت۔ ایوب خاں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں چین کے ساتھ سرحدی تعین کا ذکر صرف اپنے ذاتی حوالے سے کیا ہے اور اصغر خاں کے مشورے کا ذکر نہیں۔ ممکن ہے ایوب خاں کے اپنے ذہن میں یہ بات پہلے سے ہو مگر راقم کی دانست میں کم از کم کاغذات میں سرکاری سطح پر یہ مسئلہ کبھی زیرِ غور بھی نہیں آیا تھا۔

سفیروں میں روم میں پاکستان کے سفیر ایس کے دہلوی نے گزشتہ تاریخ کی روشنی میں آئندہ پیش آنے والے دور کے لیے امریکہ اور روس دونوں سپر طاقتوں کے ساتھ اپنے تعلقات میں توازن کی ضرورت پر زور دیا تھا غالباً اسی بنا پر انھیں وزارتِ خارجہ کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔

البتہ ہمارے ایک سفیر کبیر جن کے نام کے ساتھ پیر کا لاحقہ بھی شامل تھا بالکل پٹڑی سے اتر گئے۔ بجائے اس کے کہ وہ خارجہ پالیسی پر اظہارِ خیال فرماتے جیسا کہ ان سے کہا گیا تھا انھوں نے خارجہ پالیسی پر ایک لفظ کہے بغیر لعید از ادب آداب، آیتوں روایتوں اور تاریخی حکایتوں کے حوالے سے ایوب خاں کو باور کرانے کی کوشش کی

کہ نہ صرف پاکستانی قوم بلکہ پوری امت مسلمہ اپنے طبعی مزاج کے اعتبار سے ہمیشہ ہی کسی مردِ کامل کی محتاج رہی ہے اور آج وہ مردِ کامل جنرل محمد ایوب خاں کی شخصیت میں پاکستان کو میسر آچکا ہے چنانچہ وقت اور حالات کا تقاضا ہے کہ آپ فی الفور پاکستان میں بادشاہت کے قیام کا اعلان فرما کر اس ملک و قوم پر احسانِ عظیم فرمائیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ نبض شناس، مردشناس اور موقع شناس سفیر کبیر پیر علی محمد راشدی تھے۔

گورنر جنرل غلام محمد کی داستان بیان کرتے ہوئے ہم نے ایک صوبائی وزیر کا ذکر کیا تھا جن کا نام ہم نے قصداً نہیں لکھا تھا مگر یہ تحریر کیا تھا کہ اُن وزیر صاحب کا ذکر دوبارہ ایوب خاں کے تذکرے کے دوران ہوگا۔ اتنے حصّے کو دوبارہ نقل کرتے ہیں۔

"سکھر میں گورنر جنرل کو دریائے سندھ کی سیر کروائی گئی۔ ایک بڑی کشتی میں گورنر جنرل اور اُن کا سٹاف، دوسری کشتی میں مقامی انتظامیہ، تیسری کشتی میں سیکورٹی کا عملہ اور چوتھی کشتی میں پکی ہوئی دیگیں رکھ دی گئیں۔ ایک صوبائی وزیر صاحب گورنر جنرل کی مہمان داری اور دل بہلانے کے لیے بھی ہمراہ تھے۔ جب دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو ایک آدمی نے وزیر صاحب کے سامنے ہاتھ باندھ کر اطلاع دی کہ سائیں مانی تیار آہی۔ چاروں کشتیاں جڑ گئیں اور وزیر صاحب نے مقامی افسروں کے ہمراہ بیروں اور خدمت گاروں کے فرائض انجام دیے۔ یہ وزیر صاحب جو بعد میں وفاقی وزیر اور آخر میں سفیر کبیر بنائے گئے بڑے کائیاں تھے غلام محمد سلیم شاہی جوتی پہنے ہوئے تھے اور اُن کا ذاتی ملازم قاسم خاں اتارتا اور پہناتا تھا مگر کیا مجال جو وزیر صاحب نے قاسم خاں کو ایک دفعہ بھی موقع دیا ہو۔ وزیر صاحب ناک میں رہتے اور تیر کی طرح کہیں نہ کہیں سے نکل آتے۔ گورنر جنرل صاحب کو جوتا پہناتے اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو بوسہ دیتے۔ علاوہ اور بے شمار خوبیوں کے وزیر موصوف کی اضافی خوبی یہ بھی تھی کہ سگرٹ نہ پیتے تھے بلکہ بیڑی سے شوق فرماتے تھے۔

قیمتی برانڈ سیگرٹوں کے ڈبے میں بیڑیاں رکھتے اور باربرداری کام اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سے لیتے تھے۔ بیڑی کی طلب ہوتی تو پیچھے مڑکر دیکھتے۔ پرائیویٹ سیکرٹری تربیت یافتہ تھا کمال پھرتی سے آگے بڑھ کر سر کو جھکا اور ادب سے کہتا "سائیں بیڑی" سائیں بیڑی سلگا چکتے تو پرائیویٹ سیکرٹری واپس اپنی جگہ پر پہنچ کر سر کو ایک مرتبہ پھر تھوڑا سا جھکاتا جیسے خدا کا شکر بجالا رہا ہو۔"

جس زمانے میں پیر صاحب غلام محمد کی جوتیاں اُٹھا رہے تھے وہ صوبائی وزیر تھے۔ بعد میں انھیں وفاقی وزیر اطلاعات ونشریات بنا دیا گیا اور آخر میں سفیر کبیر کے مرتبہ جلیلہ پر فائز ہوئے مگر غلام محمد کی جوتیوں کی بدولت نہیں۔ غلام محمد کو تو خوشامد اور خوشامدیوں سے نفرت تھی۔ وہ زمانہ قبل ازمسیح کا فرمانبروا ہوتا تو جیسی اُس کی خصلت تھی جناب پیر صاحب کو فی الفور دریائے سندھ کے کسی بھوکے مگرمچھ کے حوالے کر دیتا۔ پیر صاحب کو ترقی پانے کے لیے غلام محمد کے چلے جانے اور سکندر مرزا کے مسندِ اقتدار پر تشریف لے آنے تک کا انتظار کرنا پڑا۔ آپ اگست ۱۹۵۵ء میں وفاقی وزیر بنے جب سکندر مرزا گورنر جنرل اور چوہدری محمد علی صاحب وزیراعظم تھے۔ پتہ نہیں چوہدری صاحب کو ان میں کیا خوبیاں نظر آئیں، ویسے اُن دنوں بھی آج کل کی طرح وزیر کسی ذاتی خوبیوں کی بنا پر نہیں بنتا یا بنایا جاتا تھا بلکہ سیاسی مفادات مدِنظر ہوتے تھے۔

مثال کے طور پر ایک صاحب ہوا کرتے تھے سردار امیر اعظم خاں۔ یہ حضرت اوّل مرتبہ ۱۹۵۳ء میں وزیر مملکت بنے بعد میں وزرائے اعظم آتے جاتے رہے امیر اعظم جہاں تھے وہیں رہے ہلنے کا نام نہ لیا۔ گل محمد بنے رہے۔ اگر تھوڑا سر کے بھی تو اُوپر کی طرف یعنی وزیر مملکت سے پورے وزیر بن گئے۔ اس دوران چھوٹے موٹے غیر اخلاقی سیکنڈلوں میں ملوث بھی پائے گئے۔ عمر مبارک اتنی تھی کہ اگر ۱۹۵۸ء کا مارشل لا ظہور پزیر نہ ہوتا اور وزارتوں کی تبدیلی اسی رفتار سے جاری وساری رہتی تو سردار امیر اعظم خاں کم از کم دس بارہ وزیراعظموں کے جنازوں کو کندھا دے سکتے تھے۔ لہٰذا پیر علی محمد راشدی کے صوبائی و وفاقی وزیر اور سفیر کبیر بنائے جانے پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔ باقی وزیروں سفیروں نے کون سے کارنامے انجام دیے تھے۔

مسعود صاحب

پورا نام ایم مسعود مگر مشہور ہوئے مسعود کھدر پوش کے نام سے کیونکہ کھدر کا کرتا پاجامہ پہنتے حالانکہ سول سروس آف پاکستان سے متعلق تھے بلکہ برصغیر کی تقسیم سے پہلے انڈین سول سروس میں تھے۔

۱۹۶۰ء میں ایوب خاں اور جواہر لال نہرو کے درمیان دریاؤں کے پانی کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ ایوب خاں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اس معاہدے کا تفصیل سے ذکر ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ بھارت کے ساتھ اس معاہدے سے ایسی فضا پیدا ہوگی کہ کشمیر کے مسئلہ کے حل کی کوئی صورت نکل آئے گی۔

مسعود کھدر پوش اُن دنوں ایگریکلچرل کمشنر تھے اور شہاب صاحب سے ملنے ایوانِ صدر آیا کرتے تھے۔ راقم سے بھی دُعا سلام ہوتی تھی۔ معاہدہ پر دستخط ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ اُن کا دو صفحات پر حاوی سرکاری پیڈ پر ٹائپ شدہ خط ایوب خاں کے نام موصول ہوا جو ہر لحاظ سے قابلِ گرفت تھا۔

خط میں معاہدے پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ لہجہ میں گستاخی تھی اور یہاں تک لکھا تھا کہ جناب صدر آپ کو قوم کبھی معاف نہیں کرے گی۔

میں نے لفافہ کھولا تو شہاب صاحب کے پاس لے گیا۔ اُنھوں نے پڑھا تو کہنے لگے کہ میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ دُوسرے دن دوبارہ بلا کر واپس کر دیا کہ پریزیڈنٹ صاحب کو دُوسری ڈاک کے ساتھ بھیج دو۔ اگلے دن پریزیڈنٹ صاحب سے ڈاک واپس آئی تو ایوب خاں نے حاشیے میں سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کو لکھا تھا:

will somebody put some sense into this men's head?

صدر ایوب اور پنڈت نہرو سندھ طاس کے معاہدے پر دستخط کر رہے ہیں

شہاب صاحب نے ڈاک دیکھ کر میرے پاس بھیج دی۔ میں یہ خط پھر اُن کے پاس لے گیا کہ کیا کروں۔ ایوب خاں کے حکم پر عمل درآمد کا مطلب مسعود کھدر پوش کا شکنجہ کسنا تھا۔ شہاب صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے مسعود مارا جائے گا۔ ایسے کرو کچھ دن اس خط کو اپنے پاس رکھ چھوڑو میں پریذیڈنٹ صاحب سے بات کروں گا۔

بعد میں جب بھی پوچھا جواب دیا ابھی رکھیے موقع نہیں مل سکا۔

ایک مہینہ، دو مہینے، کرتے کرتے سال کے قریب گزر گیا اور خط میرے پاس پڑا رہا۔

ایک دن مُسکرا کر کہنے لگے پریذیڈنٹ سے بات ہو گئی ہے خط کو ضائع کر دو۔ میں مطلب سمجھ گیا چنانچہ واپس کمرے میں آکر الماری سے خط نکالا اور پرزے پرزے کر دیا۔

اس دوران مسعود صاحب معمول کے مطابق شہاب صاحب سے گپ شپ کیلئے کئی دفعہ تشریف لائے۔ مجھ سے پہلے کی طرح دُعا سلام ہوتی رہی مگر اب اُن سے مصافحہ کرنے میں لُطف ہوا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے واقعی کسی نرمرد سے مصافحہ کیا جا رہا ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شہاب صاحب

اپنی کسی گزشتہ کتاب میں قدرت اللہ شہاب کے متعلق میں نے اقبالؒ کا یہ شعر نقل کیا تھا۔

امیرے در لباس خود فقیرے
فقیرے در صفاتِ خود امیرے

یہ شعر اس قدرت اللہ شہاب پر صادق آتا تھا جو آٹھ برس تک شاہ کا مصاحب رہ کر بھی اتراتا نہیں پھرے تھا کہ غالب سے نسبت نہ تھی اور اُس قدرت اللہ شہاب پر بھی جو ۳۵ برس پر محیط طویل مگر پُر آشوب ملازمت اور اُس کے بعد دس برس تک خاموش زندگی گزار کر ۲۴ جولائی ۱۹۸۶ء کی رات الرفیق الاعلیٰ سے جا ملا۔

وُہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں غلام محمد کے سیکرٹری کی حیثیت سے ایوان صدر (جو اُن دنوں گورنر جنرل ہاؤس کہلاتا تھا) تشریف لائے تھے۔ میں دو سال قبل اگست ۱۹۵۲ء سے غلام محمد کے پرسنل اسسٹنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ وُہ گورنر جنرل سیکرٹریٹ کے اعلیٰ ترین افسر تھے اور اس اعتبار سے ہمارا رشتہ افسر ماتحت کا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ سرکاری حدود سے پھلانگ کر دوستی کی شکل اختیار کر گیا اور یوں ۲۲ برس تک میں اُن کے لُطف وکرم سے بہرہ ور رہا۔

گورنر جنرل ہاؤس میں قدرت اللہ شہاب کی آمد بالکل اچانک عمل میں آئی تھی۔ یہ ڈائریکٹر آف انڈسٹریز پنجاب تھے کہ ایک شام ٹیلیفون پر حکم موصول ہوا کہ کل صبح سے گورنر جنرل کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنا ہوگا۔ موجودہ سیکرٹری اے جی رضا کو بھی پہلے سے تبادلے کا کوئی علم نہیں تھا لہٰذا اُنھیں اپنے کاغذات سمیٹنے کے لیے دو ایک

روز درکار تھے۔ اتفاق سے اسی شب گورنر جنرل کی طبیعت خراب ہو گئی اور ڈاکٹر نے انھیں کچھ روز کے لیے مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

شہاب صاحب اپنے سابقہ آفس سے فائلوں کا ڈھیر اُٹھا لائے تھے۔ کیبنٹ روم کے ایک تاریک کونے میں پڑی ہوئی فالتو کرسی پر دیوار کی طرف مُنہ کر کے بیٹھ گئے۔ ایک ایک فائل کو گود میں رکھ لیتے اور مطالعہ کرتے۔ پہلے روز تو گورنر جنرل کے سیکرٹریٹ سٹاف میں سے کسی کو پتہ ہی نہ تھا کہ یہ صاحب کون ہیں؟ کیوں آئے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ دوسرے روز انھیں کیبنٹ روم کی پرونفارمیز کو استعمال کرنے کی دعوت دی گئی مگر اصرار کے باوجود انھیں وہی گوشہ گوشۂ عافیت دکھائی دیا جب تک اُن کی اصلی کرسی رضا صاحب نے خالی نہ کر دی۔

اپنی کرسی پر بیٹھتے وقت بھی انھوں نے کچھ عجیب قسم کی جھجک محسوس کی۔ یہ جھجک ہمیشہ اُن کے ساتھ رہی۔ اس شرمیلے اور کم آمیز اور کم سخن شہاب نے ہماری تاریخ کا ایک نازک اور پُر ہیجان دور گزارا۔ قومی اسمبلی کے پرخچے اُڑے۔ غلام محمد خود بھی ٹوٹ پھوٹ کر رخصت ہوا۔ دورِ سکندری آیا اور مارشل لاء کی رسمِ بسم اللہ ادا ہوئی۔ ہر تبدیلی پر ایوانِ صدر کا سول عملہ تبدیل ہو جاتا سوائے قدرت اللہ شہاب کے۔ راقم بھی ہر دفعہ سلامت رہ جاتا۔ میری حیثیت تو معمولی تھی مگر قدرت اللہ شہاب کے بارے میں غلط فہمیاں جنم لیتیں۔ سید محمد جعفری کا یہ شعر انہی دنوں کی یاد ہے:

جب کبھی انقلاب ہوتا ہے
قدرت اللہ شہاب ہوتا ہے

ایوانِ صدر میں قدم رکھتے وقت شہاب اپنا مصلّہ ساتھ لیتے آئے تھے۔ ظہر اور عصر کی نمازیں اپنے کمرے کے ایک کونے میں ادا کرتے جہاں دروازے سے نظر نہ آئیں۔ رمضان میں سخت مجاہدہ کرتے۔ ۱۹۶۱ء میں انھیں پہلی دفعہ دل کی تکلیف ہوئی۔ اُن کی بیگم کے بقول اس کی وجہ یہی مجاہدہ تھا۔ کثرتِ عبادت کو چھپانے کی پوری کوشش کرتے جس طرح کہ فرقہ ملامتیہ کے بزرگ کیا کرتے تھے یا شاید رومیؒ کے اس

شعر پر عمل کرتے ہوں۔

تو دور گم شو وصال ایں است و بس
گم شدن گم کن کمال ایں است و بس

اپریل ۱۹۶۰ء میں بنیادی جمہوریت کا ملک گیر ہنگامہ کھڑا ہوا اور طبلے کی تھاپ پر اقبالؒ کا مصرعہ "سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ" اچھالا گیا تو قدرت اللہ شہاب نے صدر پاکستان کی خدمت میں سول سروس سے ہمیشہ کے لیے چھٹی کی درخواست دیدی۔

پوچھا گیا کہ سول سروس کو وقت سے پہلے ترک کرنا تھا تو آغاز ہی کیوں کیا تھا
کہا سول سروس کو چکھنا مقصود تھا، ہضم کرنے یا ہضم ہو جانے کا ارادہ نہ تھا۔

پوچھا تمھارا تو کوئی اثاثہ یا پس انداز نہیں۔ حج کرنے کے لیے جی پی فنڈ سے قرض لیتے ہو پیٹ کس طرح پالو گے؟

کہا میری پنشن میرے لیے کافی ہو گی۔ میں اپنی ضروریات کو گھٹا کر ایک وقت کی روٹی اور ایک جوڑا کپڑوں تک لا سکتا ہوں اور اگر ضروری ہوا تو میں یا میری بیوی جو ڈاکٹر ہے ملازمت کر سکتی ہے۔

جواب ملا استعفٰی تو منظور نہیں ہو سکتا، کوئی اور بات؟

کہا دو سال کی رخصت دے دی جائے۔ پوچھا کیا کرو گے؟ کہا ہیگ (ہالینڈ) چلا جاؤں گا وہاں مشرق و مغرب کے علوم پر بہت بڑا کتب خانہ ہے بیٹھ کر مطالعہ کروں گا اور نبی اکرمؐ پر کتاب لکھوں گا جو عصر جدید کے اذہان کے لیے سودمند ہو سکے۔

فرمایا یہ بھی مشکل ہے کہ اتنی دُور چلے جاؤ۔

کہا ایک تیسری بات ہے۔

پُوچھا وُہ کیا؟ بولے ایوانِ صدر سے تبدیلی۔

فیلڈ مارشل نے ہتھیار ڈال دیے پھر بھی مہلت مانگ لی کہ دستور کا خاکہ تیار کر لوں پھر کہیں نزدیک جگہ چلے جانا۔ اب شہاب کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور یوں دو برس اُوپر بیت گئے۔ ۱۹۶۲ء میں پہلے وزارتِ اطلاعات

کے سیکرٹری جس کا دفتر فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور پھر ہالینڈ میں سفیر بنا کر بھیج دیے گئے۔ شہاب صاحب کے اِس استعفیٰ کا ہاتھ سے لکھا ہوا مسودہ میرے پاس موجود ہے جو چھ صفحات پر مشتمل ہے۔

بقول اُن کے سول سروس کے چوہے دان سے رہائی پانے کی یہ اُن کی دُوسری کوشش تھی۔ پہلا استعفیٰ اُنھوں نے سکندر مرزا کو پیش کیا تھا۔ دورِ سکندری میں واقعتاً جہاں بانی سے بھی دشوار تر کارِ جہاں بینی۔ ایوانِ صدر سے دم گھٹنے لگا تو فرار کی ٹھانی۔ سکندر مرزا نے استعفیٰ پڑھ کر دراز میں رکھ لیا مگر "بھیناں نے بھر جائیاں" سے کہا کہ "پھلے شاہ کو سمجھاؤ۔ راجہ صاحب محمود آباد کی بات شہاب نہ ٹال سکے البتہ ایک ماہ کی رخصت لے کر اور جی پی فنڈ سے قرض لے کر مدینۃ الرسول چلے گئے کہ بقول خود اندر کی ٹوٹ پھوٹ Inner Disintegration محسوس کر رہے تھے۔ سکندر مرزا نے کہا چند دنوں کے بعد میں سرکاری طور پر سعودی عرب جانے والا ہوں اور تم تو میری پارٹی میں شامل ہو الگ کیوں جاتے ہو۔ اپنے کمرے میں واپس آ کر ڈرائیور سے کہا جمشید روڈ (موجودہ ایم اے جناح روڈ) لے چلو کچھ کام ہے۔ وہاں پہنچ کر گاڑی سے اُتر گئے اور ڈرائیور سے کہا تم چلے جاؤ میں خود آ جاؤں گا۔ وُہ راؤنڈ اباؤٹ Round About سے چکر کاٹ کر واپس جا رہا تھا تو دیکھا شہاب صاحب حاجی کیمپ کے اندر نیشنل بنک آف پاکستان کے سامنے زرِمبادلہ لینے کے لیے کڑا کے کی دھوپ میں لمبی لائن کے آخری سرے پر کھڑے ہیں حالانکہ اُنھیں معلوم تھا کہ پچھلے پہر بنک کا عملہ زرِمبادلہ لے کر ایوانِ صدر آنے والا ہے۔

فیلڈ مارشل ایوب خاں اپنے سیاسی نظام کی تشہیر کے لیے دورے پر نکلے۔ سفر بذریعہ ٹرین تھا جسے جمہوریت سپیشل کا نام دیا گیا تھا۔ راستے میں جگہ جگہ پبلک جلسے اور سوال وجواب کی مجالس منعقد ہوتا تھیں۔ پنجاب میں خانیوال کے علاقے میں ریلوے سٹیشن کے قریب سوال وجواب کی محفل تھی۔ ٹرین رکی تو ایوب خان مقامی حکام کی معیت میں جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ شہاب صاحب سب سے آخر میں گاڑی سے

برآمد ہوئے اور آہستہ آہستہ جلسہ گاہ کی طرف چل پڑے۔ آہستہ روی اُن کی عادت تھی۔ ایوب خاں اپنے سیکرٹری کی اس روش سے واقف تھے اور شہاب کی مجبوری سمجھتے تھے۔ جس وقت شہاب صاحب دروازے پر پہنچے صدر کی پارٹی کے ارکان جو صدر کے ہمرکاب تھے اندر داخل ہو چکے تھے۔ یہ اکیلے رہ گئے۔ ایک مجسٹریٹ قسم کے افسر گیٹ پر متعین تھے اُس نے یہ کہہ کر روک دیا کہ عام پبلک کے لیے دُوسرا دروازہ ہے اُدھر سے اندر تشریف لے جائیں۔ یہ رُک گئے اور پاس ہی ایک درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ اندر جلسہ گاہ میں ایوب خاں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر پکارا شوہاب۔ ایوب خاں شہاب کو ہمیشہ شوہاب اور غور خوض کو غور د غوث کہا کرتے تھے۔ اے ڈی سی دوڑے ہوئے باہر آئے تو شہاب صاحب کو ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوا پایا۔ مجسٹریٹ صاحب پر جب یہ انکشاف ہوا کہ جس شخص کو اُس نے داخل ہونے سے روک دیا تھا وُہ قدرت اللہ شہاب تھا تو بیچارے کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ جلسے کے اختتام پر وُہ بڑی لجاجت سے معافی مانگنے لگا۔ وُہ اپنی غلطی پر پشیماں اور یہ اس سے کہیں زیادہ پریشان کہ اُن کی وجہ سے بیچارہ شرمسار ہے۔

اِسی سفر کے دوران آگے جا کے اِس سے بھی زیادہ دلچسپ حادثہ پیش آیا۔ شہاب حسبِ معمول سب سے پیچھے تھے۔ سوال و جواب کی محفل تھی۔ صدر کے سٹاف کے لیے مخصوص نشستوں میں ایک پر بیٹھ تو گئے مگر کرسی پر آگے ہو کر اور اس انداز سے کہ منتظمین میں سے ایک نوجوان افسر کو جو علاقہ کا ایس ڈی ایم تھا شک گزرا کہ ضرور یہ کوئی غلط آدمی ہے جو مخصوص نشست پر بیٹھ گیا ہے۔ ایس ڈی ایم آیا اور شہاب صاحب کو بازو سے پکڑ کر اُٹھایا اور پبلک کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا اُدھر تشریف لے جائیے۔ یہ اُٹھ کر ایک دو قدم ہی چلے تھے کہ ایوب خاں نے جو دیکھ رہے تھے آواز دی۔ شوہاب۔ ایس ڈی ایم کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی مگر یہ اُس نوجوان افسر سے ایسے باتیں کرنے لگے جیسے کوئی واقعہ سرے سے ہوا ہی نہ ہو۔

جون ۱۹۶۲ء میں اپنے دستور کے تحت فیلڈ مارشل ایوب خاں کو حلفِ وفاداری

اٹھانا تھا۔ انتظام کی ذمہ داری کیبنٹ ڈویژن کی تھی اور وہاں سے سارا پروگرام بن کر آگیا۔ ابتدا تلاوت قرآن پاک سے ہونا تھی اور اُس آیت مبارکہ کا انتخاب مع ترجمہ کیا گیا تھا جس میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ شہاب صاحب نے اِن آیات کی بجائے تیسرے پارے کی اُن آیات کو تجویز کیا جن کا ترجمہ یہ ہے: "کہہ دو۔ اے اللہ ملک آپ کے ہیں جسے چاہتے ہیں ملک دے دیتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں ملک لے لیتے ہیں۔ جسے چاہیں عزت دیتے ہیں اور جسے چاہیں ذلت دیتے ہیں۔ آپ ہی کے اختیار میں سب بھلائی ہے۔ بلاشبہ آپ ہر چیز پر قادر ہیں۔" کیبنٹ سیکرٹری جناب این اے فاروقی تھے جو لاہوری پارٹی کے مرزائی تھے اور سول سروس میں شہاب سے بہت سینئر۔ فاروقی کا اصرار تھا کہ نہیں اُنہی کی تجویز کردہ آیات پروگرام کے مطابق تلاوت ہوں گی اور ایسا ہی ہوا۔ کارسرکار میں یہی رواج ہے۔ گدھا ہو گھوڑا ہو۔ چلے گی اُس کی جو سینئر ہوگا حالانکہ دونوں آیات مبارکہ قرآنِ پاک کی ہیں دونوں میں کوئی تضاد بھی نہیں۔ تضاد فقط فاروقی اور شہاب کے نقطہ نظر میں تھا۔ شہاب حلف اٹھانے والے کو باور کرانا چاہتا تھا کہ اقتدار تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہی آزمائش کے طور پہ ہے۔ لہٰذا اس کڑی آزمائش پر پورا اترنے کی کوشش کرتے رہنا ورنہ جو دیتا ہے وہ لے بھی لیتا ہے اور بالآخر ایسا ہی ہوا۔

ایوانِ صدر سے رخصت ہوتے وقت ایوب خاں اور شہاب صاحب کے درمیان تحائف کا تبادلہ ہوا۔ ایوب خاں نے شہاب کو اپنی آٹوگراف شدہ تصویر چاندی کے فریم میں لگوا کر دی۔ شہاب صاحب نے جو تحفہ دیا وہ خوبصورت پیتل کے اسٹینڈ کے اُوپر اخروٹ کی لکڑی پر دو آیات کندہ تھیں۔ نیچے پیتل پر ترجمہ تھا:

"لوگو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ خدا کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔"

یہ تحفہ ایوب خاں کی میز پر شہاب نے خود سجایا۔ اگست ۱۹۶۸ء تک یعنی جب تک راقم الحروف ایوانِ صدر میں رہا یہ آیات ایوب خاں کی میز پر موجود تھیں۔

شہاب صاحب ایوانِ صدر سے جانے لگے تو اپنے ذاتی کاغذات کی چھان پھٹک کی۔ آخری دن ردی کاغذوں کا ایک ڈھیر اپنے چپڑاسی کو دیا کہ اسے تلف کر دو۔ وُہ ڈھیر شہاب صاحب سے میں نے مانگ لیا۔ پوچھا کیا کرو گے؟ عرض کیا جناب سنار کی دکان کا کوڑا بکتا ہے۔ خریدنے والا چھلنی میں ڈال کر دھوتا ہے۔ مٹی بہہ جاتی ہے اور سونے چاندی کے ذرات رہ جاتے ہیں۔ میں بھی اس کوڑے کے ساتھ یہی سلوک کروں گا۔ فرمایا لے جائیں۔ اس مضمون میں مذکورہ استعفٰی وہی "ذرہ" ہے۔ اس کے علاوہ کئی قیمتی موتی ہیں مثلاً حفیظ جالندھری، ابنِ انشا، اور جسٹس جاوید اقبال کے خطوط۔ ایوب خان اور خود شہاب صاحب کے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریریں۔ بعد میں شہاب صاحب کو بتایا کہ خزانہ میرے ہاتھ لگا ہے۔ بس مُسکرا دیے۔

یحییٰ خاں کا زمانہ اُن کے لیے کرب و بلا کا دور تھا۔ لندن میں پناہ گزین تھے۔ یونیسکو سے ایک سو ڈالر یاہوار ملتے تھے۔ اسی پر گزارہ تھا۔ پنشن ضبط ہو چکی تھی۔ وفا شعار بیگم اور ایک بچّہ کے ساتھ فاقے بھی آئے۔ اسی فاقہ کشی نے بیگم کو نڈھال کر دیا اور وہ ثاقب شہاب کی شکل میں یادگار چھوڑ کر خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

اسی دوران شہاب صاحب نے اسرائیل کا خفیہ دورہ کیا جس کا اہتمام مصر کے صدر جمال ناصر کی مدد سے ممکن ہوا تھا۔ اسرائیل میں اپنے دس روزہ قیام کے دوران وُہ ایک پل نہ سوئے کہ مبادہ وہ نیند کے سبب اپنا فرضی نام اور کوڈ بھول جائیں۔ ہر وقت بیدار رکھنے والے کیپسول کے علاوہ ایک گولی بھی تھی جو راز افشا ہو جانے کے خطرے سے نگل جانی تھی تاکہ زندہ نہ پکڑے جا سکیں۔ ایک رات مسجد اقصیٰ میں گزاری۔ کیمرہ کی مدد سے جو سگار لیٹر میں فِٹ تھا نو سو (۹۰۰) تصاویر لینے میں کامیاب ہوئے۔ واپس آکر رپورٹ مرتب کی تو تہلکہ مچ گیا۔ یحییٰ خاں کو علم ہوا تو سیخ پا ہو گیا اور سفیر کی معرفت جواب طلبی کی۔

عرب ملکوں کے سفیر شہاب صاحب کے پاس پھول اور دیگر تحائف لے کر جاتے۔ پاکستان کا سفیر چارج شیٹ لے کر گیا۔

یحییٰ خاں کی سبکدوشی کے بعد وطن واپس لوٹے اور وزارتِ تعلیم میں افسر بکارِ خاص متعین ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں راقم الحروف آر سی ڈی سے واپس پاکستان آیا تو انہی کی وجہ سے میری پوسٹنگ بھی اُسی وزارت میں ہو گئی۔ ریٹائرمنٹ کے سال ڈیڑھ بعد شہاب صاحب داڑھی رکھ کر بے نقاب ہو گئے ورنہ نظر نہ آنے والی داڑھی تو اُس وقت بھی تھی جب ۱۹۵۴ء میں پہلی مرتبہ ایوانِ صدر میں داخل ہوئے تھے۔

ان کی وفات سے کچھ روز پہلے میں خدمت میں حاضر ہوا۔ اس دن بہت خوش تھے۔ ثاقب نے پنجاب یونیورسٹی کے ایم بی بی ایس کے امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔ کہنے لگے ریڈیو پاکستان نے امیر خسرو پر تقریر کروانی ہے۔ تمہارے پاس خسرو پر کتابیں ہیں ڈھونڈ رکھنا۔ ثاقب سے کہا جا کر لے آنا۔ میں نے کتابیں ڈھونڈ کر رکھیں مگر ثاقب اب کس کے لیے لے کر جاتا۔ وُہ خود تو جا چکے تھے ہمیشہ کے لیے۔

جو بادہ کش تھے پرانے وُہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

شہاب صاحب کے نام

ذاتی

۶-۸-۶۰

شہاب جی

میرا ایک پرانا شعر ہے ؎

ہر ایک قدم پر ہے جہاں خندۂ تقدیر
تدبیر گزرتی ہے اُس راہگزر سے

اور آج پھر ؎

خلافِ تقدیر کر رہا ہوں۔ پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں۔ خدا اگر کامیاب کر دے اور وُہ پُر تقصیر تدبیر یہ ہے
کہ آپ کو لکھ رہا ہوں۔ F.R پھر فوج میں چلے گئے۔ میں زخمی سپاہی ہوں۔ اور سچ
یہ ہے کہ اِس حادثے کے بعد نوموجود سا ہوں۔

اب آپ بتا سکتے ہیں ؎

کسی اُمید پر زندہ رہوں یا گھُٹ کے مَر جاؤں
وہ کیا کہتے ہیں اے قاصد وہ کیا ارشاد کرتے ہیں

حفیظ

برادرم قدرت اللہ شہاب، اسلامُ علیکم

جس رات آپ گئے۔ وُہ دِن آپ کے پیچھے پیچھے بھاگنے اور آخر نہ پانے پر ختم ہُوا۔ اب ؎

صُبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یُوں ہی تمام ہوتی ہے

صُبح نماز کے بغیر تمھارا چہرہ میرے لیے صُبح صادق ہوا کرتا تھا۔ سورج چاہے نہ چاہے پر سُورج سے روشنی پانے والے دُور کے دیدار ہی سے خوش ہونے کے لیے آنکھوں کے ٹھیکرے لیے پھرنے کے لیے مجبور ہیں۔ بہر صورت اب یہ ٹھیکرے بیکار معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ایسے کٹھن کٹھور بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھے آپ کی پہلی ملاقات یا آپ کے چہرے پر اپنی پہلی نگاہ بار بار یاد آتی ہے۔ اس اُفتاد نے مجھے تو کہیں کا نہیں رکھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ اظہارِ محبت ایسے مردِ مطلق سے بھی نہیں کرنا چاہیے۔ آج اپنا نہیں غالبؔ کا شعر پڑھ رہا ہوں ؎

ہم ہیں مشتاق اور وُہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

کیا آپ کے پاس ہے کوئی جواب میری اِس وحشت کا۔ کیا آپ کو اِس بات کا کبھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ میری صُبح ہر روز کس طرح شام ہو جاتی ہے۔

صرف ایک وجود ایسا نظر آیا تھا کہ اب اِس آخری مرحلے پر آس بن کر جینا یا جیتے چلے جانا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ کاش آپ منہ سے ایک مرتبہ کہہ دیتے کہ حفیظ صاحب تشریف نہ لایا کیجیے۔ اس سے میرا یہ بھلا ہو جاتا کہ ساری دُنیا کے انسانوں سے جس طرح رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ تم سے بھی ٹوٹ جاتا۔ اور میں سیدھا اللہ میاں

سے رشتہ باندھ لیتا۔ یہ شکوہ نہیں ہنستے ہنستے رونا رو رہا ہوں۔

یہ میں بخار کی حالت میں بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں۔ ۱۰۳ کے عالم میں خُدا کے بعد تم یاد آئے یہ لغویات لکھ دیں۔

لیکن تم دو حرف لکھو گے تو نہیں۔ پتہ لکھنے کا کیا فائدہ، پھاڑ ڈالوں نہیں رہنے دیتا ہوں۔

حفیظؔ

ذاتی

۲۹-۵-۶۱

قدرت اللہ۔ مجھے یاد ہیں تیرے الفاظ
صدر فرمائیں گے۔ خدماتِ گزشتہ کا لحاظ
منتظر ہوں۔ مری پژمردہ کلی کھل جائے
"دفتریت" سے رہائی کی سند۔ مل جائے

پیارے شہاب لاکھوں کام تیرے ہاتھوں انجام پذیر ہو رہے ہیں۔ مجھے ازسرِ نو شاعر بنا دے، وہی شاعر جو ملّت کے لیے شاہنامۂ اسلام کو مکمل اور رزمیۂ پاکستان تصنیف کر ڈالے۔ پیارے شہاب۔ گزشتہ سال سے دماغی ہیمریج کے بعد جو سلوک میرے ساتھ مسیح الزّماں کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ اس کا شاہدِ عادل خداوند کریم ہی ہے۔ اگر دماغ کی رگیں پھٹ جانے کے ساتھ ہی مر جاتا۔ تو آخر آپ قدر شناسوں کے سوا اور کون تھا جو میرے اُجڑے ہوئے کُنبے کا نگران ہوتا۔ اب پھر اُور کس سے کہوں کہ میں اپنے آخری سانس مسلسل اُس کام میں صرف کروں جس کی توقع مجھ سے ہے۔ میرے پیارے شہاب اَب میں واقعی بڑھاپا شدّت سے محسوس کر رہا ہوں۔ چراغِ زیست بے روغن اور آخری سنبھالے پر ہے۔ ہو سکے تو میری عاقبت خراب ہونے سے مجھے محفوظ رکھنے کی سعی کرو شہاب جی۔ پورے ایک سال کی خرابیٔ بسیار کے V. AID والوں نے جناب نظیر کا حکم کرہاً مانا۔ لیکن اس ایک سال میں میرے حوصلے پست کر دیے گئے۔ ساری عمر جس قوم کی والہانہ خدمت کی، اِس کا صلہ مرگِ مایوسی تو نہ ہونا چاہیئے۔ میرے لیے اب ہر سانس مشکل ہے۔ لیکن صدرِ عالی قدر ـــــ اپنے بوڑھے شاعر کے یہ جاتے ہوئے سانس آسان کر سکتے ہیں۔ میں آزادی سے کام کرنے اور کیے چلے جانے کا متمنی

ہوں اور شہاب جی گزشتہ ملاقات پر جو اطمینان مجھے دلایا گیا تھا۔ اس کو یاد دلانے کے لیے یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ چاہتا کیا ہوں۔ یہ کہ مجھے میرے جتنے بھی دن باقی ہیں۔ میرے احساس عزتِ نفس پر اعتماد فرماتے ہوئے تنخواہ کی جگہ وظیفہ مقرر کر دیا جائے تاکہ دفتر کے بابوؤں کے آگے سر ٹیک کرنے کی ذلت سے رہائی پاؤں۔

بُوڑھا حفیظؔ

صُبحِ انقلاب

عرشِ اعظم سے دُعاؤں کا جواب آہی گیا
ارضِ پاکستان میں بھی انقلاب آ ہی گیا

انقلاب، ایسا کہ عالم میں نہیں جسکی نظیر
زم زم اس مرتبہ اُٹھا ہے دستِ سخت گیر

چھا گیا ابرِ کرم، بجلی گرانے کے بغیر
خون کیا، آنسو کا اِک قطرہ بہانے کے بغیر

ہو گئیں مظلوم بندوں کی دُعائیں مستجاب
چیر کر ظلمات کے سینے کو اُبھرا آفتاب

آفتاب اُبھرا، گھٹا چھائی تجلّیات کی
ہو گئیں رُو پوش اَولادیں اندھیری رات کی

خارجی خطروں کا سدِّ باب فرماتا ہُوا
داخلی فتنوں کا زَہرہ آب فرماتا ہُوا

مژدہ لَاتَقْنَطُوا۔ رنجورِ ملّت کی شفا
زخمِ محتاجی کا مرہم۔ دردِ ذِلّت کی دوا

عدل کی میزان قائم کرنے والا انقلاب
ہر تہی قسمت کا دامن بھرنے والا انقلاب

ضامنِ دَورِ مساوات و اُخوّت آ گیا
دامنِ جمہور میں سامانِ قوّت آ گیا

آؤ ہم بھی رُوحِ آئینِ نَو جاری کریں
صبحِ صادق آگئی۔ اعلانِ بیداری کریں

آؤ رسمِ لا اُحِبُّ الآفلین تازہ کریں
چشمِ ابراہیم سے ذوقِ یقیں تازہ کریں

ابرِ رحمت بن کر برسیں کائناتِ زیست پر
کشتِ اُمیدِ بشر کو ہر کہیں تازہ کریں

عید کی صورت میں دیکھیں معنیٔ ذبحِ عظیم
عشق کے عہدِ کہن کو پھر دِیں تازہ کریں

گونج اُٹھے، آسماں جس نعرۂ توحید سے
پھر وہی ایمان بالائے زمیں تازہ کریں

سرکش نے کر دیئے دُھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں، لوحِ جبیں تازہ کریں

آؤ آنکھوں میں بسالیں پھر مدینے کی بہار
دل میں حُبِّ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْن تازہ کریں

دُوسروں سے کیوں کہیں قربان ہونے کو حفیظؔ
کیوں نہ اِس رسمِ کہن کو پھر ہمیں تازہ کریں

حفیظؔ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

آفتابِ انقلاب صدرِ والاقدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمدّ ایوب خاں کی خدمت میں

عالی سے جاہا - اسلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں حفیظ جالندھری چھوٹا سا قومی شاعر ترانہ پاکستان اور شاہنامۂ اسلام کا مصنف ہوں۔ آج اِس حال میں ہوں کہ خُدا اور رسولؐ کے بعد آپ کے سوا اِس دُنیا میں اپنی مدد کے لیے کسی کو نہیں پکار سکتا۔ کیونکہ ؎

آپ کی چشمِ عنایت نے بڑھا دی عزّت

ورنہ انصاف سے پوچھو تو وہی خاک ہوں میں

مَیں قوم کا ایک ناچیز خادم ہوں۔ پاکستان سے پہلے اور قیامِ پاکستان کے بعد میں نے جان اور ایمان کے ساتھ اپنی بساط بھر ہر وُہ خدمت کی ہے جو مجھ سے متوقع تھی اور جس کا مجھے حکم دیا گیا۔ مجھے اب تک ایک دن کی بھی چھٹی نصیب نہیں ہوئی۔

انقلاب کے دن سے دو برس میں مَیں نے ۲۳، دیہات میں مقاصدِ انقلاب اصلاحاتِ زرعی اور بنیادی جمہوریتوں کے سلسلے میں لاکھوں اَن پڑھ لوگوں میں آفتابِ انقلاب کی روشنی پہنچائی۔

آخر ۲۰ اپریل ۱۹۶۰ء کو راولپنڈی میں میرے دماغ کی رگیں پھٹ گئیں۔ میں خُون میں لت پت مُردہ پایا گیا۔ قائم مقام صدر کی قدر افزائی سے افواجِ پاکستان نے مُجھے ملک الموت کے ہاتھ سے چھین لیا۔

حضور۔ میں زندہ ہوں، مگر ضعیف اور پریشان حال۔ اگرچہ مجھے ہلال امتیاز بنا دیا گیا ہے۔ لیکن اللہ جانتا ہے کہ میرا گھرانا (جس میں میری پانچ ناکتخدا لڑکیاں۔ ایک بیوی کے علاوہ اُن عزیزوں کی بیوہ بہنیں اور بیویاں ہیں جو تقسیم کے وقت مارے گئے جو قطعاً بلاوسیلہ ہیں کیا چاہتا ہوں خیرات ہرگز نہیں البتہ آپ سے اور محض آپ کے وجود باجود

سے امید رکھتا ہوں کہ مجھے دفتری اُلجھنوں سے رہائی دلا کر تھوڑی سی عمر جو باقی رہ گئی ہے آزادی سے ملّت کا کام کرنے کی صورت مرحمت کر دیں۔

میں رزمیۂ پاکستان اور شاہنامۂ اسلام کی پانچویں جلد مکمل کر کے مرنے کی آرزو رکھتا ہوں۔

تو کیا ہمارے پیارے محبوب ایوّب اس کام میں مدد نہیں فرما سکتے؟

کیا تنخواہ اور ضابطہ بازی کی بھاگ دوڑ سے نکال کر مجھے اپنے کنبہ کو ایک جگہ لے کر بیٹھنے اور آخری سانس تک کام کرتے چلے جانے کی اجازت اور اس اجازت کے ساتھ اس تنخواہ کو وظیفہ رزق نہیں بنایا جا سکتا۔ کیوں نہیں — ؟ آپ اگر میری گزارش کو صداقت پر محمول خیال فرمائیں۔ تو اِس بوڑھے بیل کو دفتری قصائیوں سے بچا کر، چند محدود دلیروں کے درمیان کام کیے۔ چلے جانے اور انجام بخیر ہونے میں محض آپ ہی مدد کر سکتے ہیں —

دیرینہ غلامے را مفروش بہ بازارے

ہمیشہ دُعا گو ابوالاثر حفیظ جالندھری

[illegible] نے میں کیا کہنا چاہتا تھا اور بہک کر گیا۔ کہنے لگا۔ دیوانہ ہوں مگر [illegible] کی بات یہ ہے کہ میں نے گزشتہ دو مہینے میں ۶۳ مقامات پر (دیہات میں) مسجدوں، میلوں اور مدرسوں اور خانقاہوں۔ بھرے اجتماعات میں تقریریں کیں۔

پیارے ایوّب اور ایوب کے مہتمم تے جس زندگی بخش بوجھ کو اٹھایا ہے اور قوم ہر مرد و زن کو جس خلوص اور شکر گزاری کے ساتھ ایوّب کی سرکردگی میں ترقی کی طرف آگے بڑھنا چاہیئے اُس سب کو نظم اور تقریر دونوں کے ذریعے کانوں تک نہیں دلوں کے اندر تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ میں نہیں جانتا آپ میری اِس جدوجہد کے بارے میں کیا رائے قائم کریں۔ یا وُہ جو بظاہر اس انقلاب کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے عہدوں کو قائم رکھتے ہیں مجھے کس کروٹ ماریں میں اپنے دل کے ہر قطرہ ہائے خون کو اور اِن بوڑھی ہڈیوں میں [illegible]

باقی ہے ایوب خاں کے قدموں پر قربان کرنے کے لیے قسم کھا چکا ہوں۔ سبب ایوب خاں کا جسم یا مقام بلند نہیں ہے۔ ایوب کی توانا، حلیم اور روح ہے جو پاکستان کی روح بننی چاہیئے۔ سبب یہ ہے کہ میری زندگی کے گزشتہ تجربوں کی تلخی کے بعد صرف ایک یہی شیریں آبِ حیات کا چشمہ نظر آیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ پاکستان اس چشمے سے سیراب ہو اور زندہ و پائندہ بن جائے لیکن میرے عزیز دوست۔ ہم لوگ۔ یعنی عوام کو عزت نفس کا سبق دے کر اس انقلاب کو واقعی زندگی بخش انقلاب بنانے والے۔ کتنے کم ہیں۔ تعداد میں۔ کتنے قلیل۔ اور وہ لوگ کس قدر انبوہ در انبوہ جو رات دن لوگوں کو محض مارشل لاء کے نام پہ ذلیل کرنے اور مارشل لا کو اپنی پاجیانہ حرکتوں کا اصل سبب بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ معاف کرنا۔ مجھے فوجیوں کا تجربہ ہے۔ وہ ذہین ہیں۔ صاحبانِ جرأت ہیں۔ لیکن رسول اللہؐ کی قسم بہت سادے ہیں۔ وہ ہتھکنڈے جو انگریز کے اصل پالتو کتے جانتے ہیں۔ فوجیوں کو قطعاً ان کا احساس نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام پرانے جغادری جس رنگ سے ملّت کے ساتھ معاملہ کر رہے ہیں۔ کون ہے جو ان کی اصل صورت اِن مجاہدوں کو دکھائے۔ بہر صورت میں تو یہ تہیہ کر چکا ہوں کہ زندگی کا معاملہ اس آخری جرعہ تک ہے جو میں نے پی لیا ہے۔ یعنی اس چشمہ حیات کی طرف عوام کو بلانا اور بس۔

آہ۔ ہر دفتر، سیکرٹیریٹ اور ہر محکمہ میں چالاکیوں اور بدمعاشیوں اور ہتھکنڈوں کا بازار پہلے سے بھی زیادہ گرم ہے۔

حفیظ

مفتی جی!

آداب۔

شہاب صاحب نے بتایا کہ ان کی کہانی کا ترجمہ آپ نے کیا ہے (۱۸ سول لائنز کا) اچھا کیا لیکن میرا اِن سے اصرار تھا کہ ترجمہ نہ کریں بلکہ اسے انگریزی میں لکھیں اور جو پہلو وُہ چھوڑ گئے ہیں ان کا بھی احاطہ کرلیں۔ ان سے کہیے اب بھی آپ کے ترجمے کو مسودہ شمار کریں اور اسے انٹرنیشنل ٹ۔یال کرتے ہوئے لکھیں باقی آپ کا اختیار۔

محکمے کی صورتِ حال میں نے سمجھا دی تھی تشویش کی کوئی ضرورت نہیں۔ احمد بشیر کے معاملے میں مَیں نے تاکید درخواست کر دی ہے۔ وُہ ہو جائے تو آپ کی منزل بہت آسان ہو جاتی ہے۔

شہاب صاحب کو یہ جو خط میں نے لکھا ہے اس کا جواب بھجوانا آپ کا ذمہ۔

ابن انشاء

۲۲ - ۹ - ۶۰

برادرم شہاب صاحب!

آداب

آپ نے ہم قلم کے لیے کچھ نہ بھیجا لیکن ہم کچھ نہ کچھ چھاپ رہے ہیں۔
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نام کے

جمیل آرٹسٹ (جس کا میں نے مختصراً ذکر کیا تھا) کی تصویروں کی نمائش اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ہوتی طے پائی ہے۔ آپ سے یہ درخواست باضابطہ کی جاتی کہ اس کا افتتاح فرمائیں۔ تاریخ آپ کے چار روزہ قیام میں سے کوئی بھی دن ہو سکتا ہے۔ یعنی ۳۰ ستمبر تا ۱ اکتوبر۔ مقام نمائش YWCA (Not YMCA) آپکو آرٹ کے متعلق جی کی بات کہنے کا موقع بھی ملے گا اور میں سمجھتا ہوں میں اور آپ اس معاملے میں ایک طرح سوچتے ہیں۔ میں Abstraction کو ایک ذہنی رجحان سمجھتا ہوں۔ ذہنی زوال۔ ابتری اور انتشار کی نشانی جس طرح Abstract شاعری وغیرہ۔ پرائیویٹ طور پر بے شک میں آپ کسی وش کنیا کے لیے کشتوں کے پشتے لگانے کو تیار رہوں لیکن سنجیدہ لمحات میں لازماً ہم ادب میں سماجی ذمہ داری (بمقابلہ انارکی) ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی آرٹسٹ عوام کی زندگی کی حقیقت پسندانہ (ساتھ ہی ساتھ فنکارانہ) عکاسی کرتا ہے تو میں اسے ساری آرٹس کونسل کے لال بھجکڑوں پر فوقیت دوں گا۔ پھر یہ اسالیب ہیں بھی غیر ملکیوں کا پس خوردہ جس میں ہمارے کلچر کی آدھ فیصدی روایت بھی شامل نہیں۔ ادب میں کوئی شخص ایسی حرکت کرے تو ہم گلا دبا دیتے ہیں۔ آرٹ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ سب ازراہ اخلاق تعریف کر دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ طفیلی پودا ترقی کر رہا ہے۔ میں سنجیدگی

سے آرٹ کی Abstract خریب کو پڑھے لکھے نوجوان طبقہ کی ذہنی تندرستی کے لیے فالِ بد سمجھتا ہوں۔ آپ اگر سوال کو اُٹھائیں گے تو ایک طرح سے ایک ہوشمند اور ریجنل سوچنے اور قومی اور عوامی bias رکھنے والے طبقے کی نمائندگی کریں گے۔ شاید آپ کی بات کا اثر ہو اور اس انتشار کا سدِباب ہو سکے۔ میں سمجھتا ہوں تعبیرِ نو میں کوئی سمجھ سوچ والا ہے تو اُسے یہ باتیں سوجھنی چاہئیں۔

میں نے Sponsors سے کہہ دیا ہے کہ میں شہاب صاحب سے آپ کی جانب سے درخواست کیے دیتا ہوں۔ جواب آنے پر تاریخ کا اعلان کر دیجئے گا۔ اس آرٹسٹ کی مختصر کیفیت آپ کو بھجوا رہا ہوں۔ کیا آپ تار کے ذریعے اپنی منظوری اور تاریخ سے اطلاع دے دیں گے۔ تار میرے نام گلڈ کی معرفت بھیجی جا سکتی ہے۔ احمد بشیر کا معاملہ براہِ کرم کرا دیجئے۔ مفتی کا معاملہ اس کے ساتھ منسلک ہے۔

ابنِ انشاء

۲۹ - ۵ - ۶۱

برادرم شہاب صاحب!

سلام ممنون۔

یہ خط آپ کو ایسے وقت ملے گا جب کہ آپ مری کے لیے پابہ رکاب ہوں گے۔ کیا عجیب مری ہی میں ملے۔ بہر حال ہمیں جلتا بھنتا چھوڑ کے آپ مری جائیے۔ ہمارا بھی خدا ہے ہمیں یہیں ٹھنڈا رکھے گا۔ اسلامیہ کالج والے قریشی صاحب پھر آئے تھے۔ طالبِ علموں کی تنظیم کے معاملے میں مَیں نے انہیں Discourage کیا ہے۔ ہوسٹل کی زمین اُنھیں مل سکتی ہے لیکن اس کے لیے اُنھیں ہوائی جہاز اور ہوٹل کے کرائے (در مری) کا انتظام کرنا ہوگا۔ خیر

معلوم ہوا ہے پبلک سروس کمیشن والوں نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ریسرچ کے لیے میری درخواست قبول نہیں کی۔ عذر یہی کہ آخری تاریخ گزر چکی۔ اگر آخری تاریخ نہ گزر چکی ہوتی تو میں پنڈی کیوں جاتا۔ انفرمیشن والوں سے چٹھی کیوں لکھواتا۔ بہر حال میرے پاس سرکاری اطلاع نامہ اس مطلب کا نہیں آیا۔ ان کے دفتر میں مَیں نے جا کر فائل دیکھی۔

لاہور میں گلڈ ہوٹل یعنی پرنس ہوٹل کے حاجی صاحب حیلے بہانے کر کے ٹال رہے ہیں۔ بہر حال ایک انیکسی کا کچھ حصّہ خالی ہے۔ اُنھوں نے گلڈ کو پیشکش کی ہے کہ اس میں اپنا دفتر لے آئیے۔ میں نے سید وقار عظیم کو تار دیا ہے کہ فوراً قبضہ کیجیے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ہاتھ پاؤں پھیلائیے۔ اعرابی کے اونٹ کا قصہ آپ کو معلوم ہے! پہلے تھوتھنی اندر کی پھر سر۔ پھر بیچارے عرب کو نکال دیا۔ حاجی صاحب عرب نہیں لیکن عرب ہو تو آئے ہیں۔

کرنل عطا الرحیم کی درخواست یہیں پڑی رہ گئی۔ براہ کرم اسے اپنی سفارش کے ساتھ گورنر مغربی پاکستان کو بھجوا دیجیے۔ وہاں سے نیچے آئے گی تو ایڈمنسٹریٹر صاحب کام کر دیں گے۔ وغیرہ۔

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے

لاہور کے اخبار شور مچا رہے ہے کہ ہم فیضؔ اور جوشؔ کے مجموعے انگریزی میں چھاپ رہے ہیں۔ یہ غلط ہے صحیح صورت حال سے میں نے بیرد وقار عظیم کو مطلع کر دیا۔ وہ تردید شائع کرا دیں گے۔ ذکر جی الانا کی کتاب کا ہے اس میں اردو، سندھی بنگالی پشتو بلوچی سب زبانیں ہیں اور اقبالؔ، حفیظؔ، احسانؔ دانش، ظفر علی خاں کے ساتھ ایک ایک نظم فیضؔ اور جوشؔ کی بھی ہے۔ چونکہ آپ کو بھی خط یا تراشے آئیں گے۔ اس سے یہ لکھنا ضروری معلوم ہوا اگرچہ آپ کے لیے تو یہ معاملہ برپ تو ہے۔ مرحوم عبدالستار (برش رشنا) کی بیوہ کی درخواست برائے امداد آئی ہے۔ آپ کیا فیصلہ کر سکتے۔ کاپی ملفوف ہے۔ ایک ہزار سے زیادہ ہم عموماً نہیں دیتے اور مرحوم تو ہمارے ممبر بھی نہ تھے۔

ابنِ انشا

۶۱-۶-۱۰

برادرم شہاب صاحب

سلام ممنون

آج یہ تیسرا چوتھا خط ہے جو میں آپ کی خدمت میں لکھ رہا ہوں۔
منسلکہ اقتباس بیگم یوسف جمال حسین کے ایک خط میں سے ہے جو موصوفہ نے ذاتی حیثیت سے مجھے لکھا ہے PEN تو واقعی ایک ریکٹ بنا ہوا ہے اور خالص امریکی ریکٹ۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ کانگریس فار کلچرل فریڈم وغیرہ کیا چیز ہیں۔ اس کے پردے میں دیگر امریکی اداروں کی طرح کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ایشیا فاؤنڈیشن کو بھی آپ جانتے ہوں گے جواب بھی گولڈ کو پھانسنے کے چکر میں ہے۔ PEN دراصل سید علی احسن اور کچھ لوگوں کے گھر کی لونڈی ہے وہ اس کے ذریعے بیرون ملک سیر و تفریح کرتے ہیں۔ پرورش اس کی غیر ملکی سرمائے سے ہوتی ہے اور BNR کو بھی یہ کسی وجہ سے GUILD سے زیادہ عزیز ہے۔ اگر آپ اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہیں تو بیگم حسین کا نام نہ ظاہر ہو۔

ابن انشاء

فون: ۵۲۰۵۵/۲۰

ہم قلم

ادارہ مصنفین پاکستان
(شاخ کراچی)

پاکستان رائٹرز گلڈ
(کراچی ریجن)
۲۰ ایکسلسیئر ہوٹل، کراچی

نمبر ——————

تاریخ 15/11/61

برادرم شہاب صاحب،

سلام مسنون۔

آج یہ تیسرا یہ مکا خط ہے جو میں آپ کی خدمت میں لکھ رہا ہوں۔

مسئلہ اتنا سا ہے بیگم یوسف جمال حسین کے ایک خط میں سے ہے جو موصوفہ نے ذاتی حیثیت سے مجھے لکھا ہے

PEN تو واقعی ایک ریکٹ بنا ہوا ہے اور خالص امریکی ریکٹ۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ کانگرس فار کلچرل فریڈم وغیرہ کیا چیز ہیں۔ اس کے پردے میں دیگر امریکی اداروں کی طرح کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ایشیا فاؤنڈیشن کو بھی آپ جانتے ہوں گے جو اب بھی گلڈ کو بچانے کی کوشش میں ہے۔ PEN دراصل سید علی احسن اور کچھ لوگوں کے گھر کی لونڈی ہے وہ اس کے ذریعے بیرون ملک سیر و تفریح کرتے ہیں۔ پرورش اس کی غیر ملکی سرمایے سے ہوتی ہے اور BNR کو بھی یہ کسی وجہ سے

[illegible]

The P.E.N. Seminar (financed by the Bureau of National Reconstruction who paid Rs.12,000/- to Syed Ali Ahsan for the purpose), ignored us completely. A few Guild members from Dacca attended; otherwise it was a vested-interest membership show. I think Central Guild should formally protest. We must also find out why, despite the constitution, the headoffice of P.E.N. has been shifted to Dacca and is no longer in Karachi. I, as you may already be knowing am one of the oldest members of the PEN (from 1951) and was Treasurer plus Executive Member last year. PEN is an international organisation and there was no reason in the present economic sta--te of our country to have so lavish a conference of no national effectiveness in a cyclone devastated land. From PEN we must try to draw resources, not dissipate our limited own. Had a conclave of writers been at all necessary just now, the auspices should have been that of the Pak. Writers' Guild. What does Pakistan stand to gain by popularising or propagating the name of non-national organisations in the country just now? The PEN as you know is subsidised by the Congress for Cultural Freedom in Pakistan, and the Secretary-General of CCF is the Secretary-General of the PEN, who is also these days Director of Bengali Academy and employed as such by the BNR.

نوٹ: یہ سیمینار [illegible]

[illegible]

To

The Secretary General,
Pakistan Writers' Guild,
KARACHI.

Sir,

I beg most humbly to state that my husband Syed Abdus Sattar, Lecturer in Bengali, Chittagong Govt. College, and recipient of Adamjee Literary Prise, 1960, for his drama "Kabida" breathed his last in the Chittagong General Hospital on the 19th April, 1960. The disease, he was suffering from, could not be diagnosed till a few hours before death. It is now revealed that he died of Enciphalitis. Inspired with Adamjee Prize awarded by the President of Pakistan himself my husband devoted himself whole heartedly to more contribution to National Literature. But this heavily told upon his health, and death robbed him of the chonse. He, however, has left completed manuscripts of four books yet to see high, and another drama "Promithens Punarvaba" (Riappearanse of Promidens) half-completed.

My husband's premature death, he was only 32 years old, is an irreparable loss to my whole life, my age being 22 years only, and my one-year daughter Pupie. After his shocking demise I took shelter at my father's house, P.O. Khipupora, Dt. Barisal. But the recent cyclone over the southern part of East Pakistan of which you already know much has rendered an unaccountable loss to his property and family. So at present I am to need of financial assistance from any good source.

May I, therefore, hope and request that you would be kind enough to consider my case sympathetically and grant me some financial help from the Guild. A copy of the resolutions of condolence meeting held at Chittagong College is sent herewith.

I remain,
Sir,
Yours faithfully,

Begum Sabha Sattar.
C/o Prof. K.M. Aizzul Haque,
Station Road,
P.O. Khipupora, Dt. Barisal.

Khipupara, Barisal,
May 23, 1961.

Copy to Dr. Mohammad Shahidullah,
one of the permanent Judges,
Adamjee Literary Prise Competition.

Begum Sabha Sattar.

فون نمبر: ۱۹۱۰۳۰ اردو روڈ، کراچی - ۱

No.1120. نمبر — May 21, 1961. مورخہ

The President of Pakistan.

Sir·

I have the honour to apply for the allotment of two buildings out of the eleven buildings previously occupied by the Karachi University. The two buildings will accommodate the Higher Secondary College and the degree college according to the recommendation of the Commission on National Education.

The two buildings we are applying for were used to hourse Mathematics and Zoological Departments by the Karachi Universit . They are adjacent to one another and are next door to the college. In the compound of one of these buildin s there . a Botanical Garden which was established by the Karach. University after six years continuous efforts. This garden is a necessity for the college. If the building is no' given to us then the garden will be of no use to any other institution and will cease to exist. This building has a Hall which this college lacks.

In this connection it may not be out of place to mention that the College has about 1500 students on roll and has four departments viz. Arts, Science, Commerce and Law. The present building is totally inadequate for the requirements of the college. We have constructed improvised shedes consisting of ten rooms and they are unfit for use as class rooms.

Moreover, the expanding needs of the Anjuman to which these buildings are allotted, would make it unavoidable that they may be taken back for the additional activities of the Anjuman.

The college is run by the Anjuman Taraqqi-e-Urdu which is a Trust and the buildings applied for, are also Educational Evacuee Trust buildings.

Thanking you,

Your most obedient servant,

(M. A. Rahim) Lt.Col.,
Principal, Urdu College; &
Joint Secretary, All Pakistan
Anjuman Taraqqi-e-Urdu.

Principal
Urdu College.
KARACHI

جاوید منزل
علامہ اقبال روڈ
لاہور
مورخہ ۲۰ مارچ ۵۹ء

پیارے شہاب سلام مسنون

وزیر خارجہ کے بیانات پر مولانا احتشام الحق کا تبصرہ ممکن ہے آپ کی نظر سے گزرا ہو۔ بہر حال اگر نہیں تو ارسال کر رہا ہوں۔ یہ "نوائے وقت" مورخہ ۱۵ مارچ ۵۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔

"کوہستان" کے ۱۹ مارچ ۵۹ء کے پرچہ میں "سخن ہائے گفتنی" کے عنوان سے بھی وزیر خارجہ کے بیانات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ارسال کر رہا ہوں۔

ابھی تک ۔ ۔ نے Ideology of Pakistan پر کچھ تحریر کرنا شروع نہیں کیا۔ صرف اپنے NOTES مرتب کیے ہیں۔ انشاء اللہ دو چار دنوں تک اُنھیں ترتیب دینا شروع کر دوں گا۔

کراچی بلائے جانے کے لیے سفر خرچہ کا بل ارسالِ خدمت ہے۔

بھابی کو سلام کہیے گا۔

مخلص

جاوید اقبال

DR. JAVID IQBAL,
M.A., Ph.D. (CANTAB),
BARRISTER-AT-LAW,
ADVOCATE, HIGH COURT,
LAHORE.

مورخہ ۲۰ / مارچ ۶۹ء

جاوید منزل
۱۱۶ علامہ اقبال روڈ
لاہور

پیارے شہاب صاحب سلام مسنون۔

منیر صاحب کے بیانات پر مولانا احتشام الحق کا تبصرہ ممکن ہے آپکی نظر سے گزرا ہو۔ بہرحال آج ہی تمہ ارسال کر رہا ہوں۔ یہ "نوائے وقت" مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا ہے۔

"کوہستان" کے ۱۷ مارچ ۱۹۶۹ء کے پرچے میں "منتخبات تلخی" کے عنوان سے جو منیر صاحب کے بیانات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ارسال کر رہا ہوں۔

ابھی تک میں نے Ideology of Pakistan پر کوئی کام شروع نہیں کیا۔ صرف اپنے Notes مرتب کئے ہیں۔ انشاءاللہ دو چار روز تک انہیں ترتیب دینا شروع کروں گا۔ اگر ایک ماہ کے اندر اندر اسکی کوئی شکل بن سکی تو آپکو [illegible] کیلئے تحریر کروں گا۔

[illegible] بھی ارسال خدمت ہے۔

بھابی کو سلام کہئے گا۔

مخلص
جاوید اقبال

جاوید منزل
علامہ اقبال روڈ
لاہور

مورخہ ۷، اپریل ۵۹ء

پیارے شہاب سلام مسنون

کراچی سے واپس آکر آپ کو ایک خط تحریر کیا تھا لیکن آپ کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ پھر توقع تھی کہ کرکٹ کے ٹیسٹ میچ کے موقعہ پر لاہور میں آپ سے ملاقات ہوگی۔ میاں ممتاز دولتانہ آپ سے ملنا چاہتے تھے۔ مجھے پیغام ملا تھا کہ اگر شہاب مجھے ملنے کے لیے جاوید منزل آئیں تو میاں صاحب کو بھی بلوالوں۔ اس سلسلہ میں آپ کے بھائی صاحب کے گھر یہ معلوم کرنے بھی گیا تھا کہ آپ لاہور آئے ہیں یا نہیں لیکن اطلاع ملی کہ آپ اس مرتبہ بھی کراچی رہ گئے ہیں۔ بہرحال۔

Pakistan Ideology کے موضوع پر آجکل اپنے خیالات قلمبند کر رہا ہوں، لیکن یہ مقالہ کچھ طویل ہوتا جا رہا ہے۔ ممکن ہے Type Script میں توتے یا سو صفحوں پر مشتمل مسودہ بنے۔ (اب تک کوئی چالیس کے قریب صفحے ٹائپ ہو چکے ہیں)۔ مجھے یہ احساس بھی ہے کہ اس قدر طویل مسودے کو پڑھنے کے لیے ممکن ہے، صدر صاحب وقت نہ نکال سکیں اور میری محنت اکارت جائے۔ بہرحال اس احساس کے باوجود جو مناسب سمجھتا ہوں کر رہا ہوں۔

مسودہ کی نقلیں نکلوا رہا ہوں، مکمل ہونے پر اُنھیں مجلد کرا کے کتابی صورت میں آپ کو ارسال کر دوں گا۔ ایک نقل خود رکھ لیجیے گا اور دوسری صدر صاحب کو پیش کر دیجیے گا۔

اس موضوع پر میری تحریر ایک تحقیقی مقالہ کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ جن کتب سے مواد حاصل کیا ہے اُن کی تفصیل Foot Notes میں دیتا جا رہا ہوں۔ میرے خیال میں جب تک Pakistan Ideology کو اُس کے تاریخی پس منظر میں نہ سمجھا جائے، مستقبل کے لیے کوئی Suggestions یا Proposals دینا

بیکار ہے۔ اِس لیے اِس قدر تفصیل میں جانے کی ضرورت پڑ رہی ہے۔
موضوع کو جن عنوانات یا ابواب میں مَیں نے تقسیم کیا ہے اُس کی تفصیل لف ہے۔ ایک نظر دیکھ لیجیے۔
یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ یہ کام ایک ماہ میں مکمل نہ ہو سکے گا۔ اِس لیے کم از کم مئی ۵۹ء کے آخر تک کی مہلت درکار ہے۔ بعض کتب جو میں دیکھنا چاہتا ہوں وُہ لاہور کے کتب خانوں میں نہیں مل رہیں۔
آپ ازراہ کرم میری یہ گزارش صدر صاحب تک پہنچا دیجیے کہ میں اس کام کو مئی ۵۹ء کے آخر تک انجام دینے کے قابل ہو سکوں گا۔ لہٰذا مجھے تب تک کی مہلت دی جائے۔
اِس سلسلے میں اگر آپ کے ذہن میں کوئی باتیں ہیں تو تفصیل سے مجھے تحریر کیجیے گا۔ میں منتظر ہوں۔
خواجہ عبدالرحیم صاحب سے معلوم ہوا کہ صدر صاحب لاہور کے "یوم اقبال" کی تقریب پر شامل نہ ہو سکیں گے کیونکہ وُہ ڈھاکہ جا رہے ہیں۔
غالباً خواجہ صاحب اب کیانی صاحب Chief Justice West Pakistan High Court کو صدارت کے لیے کہیں گے۔ آپ لاہور کب آ رہے ہیں ؟! اگر آپ صدر صاحب کے ہمراہ ڈھاکہ نہیں جا رہے تو لاہور چلے آئیے اور اِس تقریب پر ایک مقالہ پڑھ ڈالیے۔ کیا خیال ہے ؟!
چند ہفتے ہوئے چیف سیکرٹری صاحب (فدا حسن) نے حمید نظامی مدیر "نوائے وقت" اور دُوسرے اخبارات کے مدیروں کو بلایا تھا اور اُنھیں Warning دے دی تھی کہ وُہ اگر وزیر خارجہ اور وزیر داخلہ کے بیانات پر تبصرہ یا نکتہ چینی کریں گے تو مرکزی حکومت Ministry of Interior سخت کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اُنھوں نے کہا کہ چیف سیکرٹری صاحب اِن دونوں وزیروں کو مدیروں کی طرف سے یہ پیغام پہنچا دیں کہ وُہ ایسے موضوعات

پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے گریز کریں جو Public Controversy بن سکتے ہیں۔ چیف سیکرٹری نے وعدہ کیا کہ وہ ان مدیروں کے پیغام کو مرکزی حکومت تک پہنچا دیں گے۔ تب سے اخبارات نے خاموشی اختیار کر لی ہے۔

باقی خیریت ہے۔ بھابی کو سلام کہیے گا۔

مخلص

جاوید

[illegible]

DR. JAVID IQBAL,
M.A., Ph.D. (CANTAB).
BARRISTER-AT-LAW,
ADVOCATE, HIGH COURT.
LAHORE.

جاوید منزل
علامہ اقبال روڈ
لاہور

پیارے شہاب — سلام مسنون۔

کراچی سے واپس آ کر آپکو ایک خط تحریر کیا تھا لیکن آپکی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ مجھے توقع تھی کہ گزشتہ تعطیلات کے موقعہ پر لاہور میں آپ سے ملاقات ہو گی۔ میاں ممتاز دولتانہ آپ سے ملنا چاہتے تھے۔ مجھے خیال ہوتا تھا کہ اگر شہاب مجھے ملنے جاوید منزل آئیں تو میاں صاحب کو بھی بلوا لوں۔ اس سلسلہ میں میں نے آپکے ہاں ٹیلیفون کیا تو یہ معلوم کرنے پر پتہ چلا تھا کہ آپ لاہور آئے ہی نہیں لیکن اطلاع ملی کہ آپ اس مرتبہ بھی کراچی رہ گئے ہیں۔ بہرحال —

Pakistani Ideology کے موضوع پر مکمل اپنے خیالات قلمبند کر رہا ہوں۔ لیکن یہ معاملہ کچھ طویل ہوتا جا رہا ہے۔ ممکن ہے Typescript میں ڈیڑھ سو صفحوں پر مشتمل مسودہ ہے۔ (اب تک کوئی چالیس کے قریب صفحے ٹائپ ہو چکے ہیں)۔ مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اتنے طویل مسودے کو پڑھنے کیلئے ممکن ہے صدر صاحب وقت نہ نکال سکیں اور میری محنت اکارت جائے۔ بہرحال اس احساس کے باوجود جو مناسب سمجھتا ہوں تحریر کر رہا ہوں۔

مسودے کی نقلیں نکلوا رہا ہوں۔ مکمل ہونے پر انہیں مجلد کرا کے کتاب کی صورت میں آپکو ارسال کر دوں گا۔ ایک نقل آپ خود رکھ لیجئے گا اور دوسری صدر صاحب کو

پیش کرتے رہیں گے۔

اس موضوع پر میری تحریر ایک تحقیقی مقالہ کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ جن کتب سے مواد حاصل کیا ہے اُن کی تفصیل Footnotes میں دیتا جا رہا ہوں۔ میرے خیال میں جب تک Pakistani Ideology کو اُسکے تاریخی پس منظر میں نہ سمجھا جائے مستقبل کیلئے کوئی suggestions یا proposals دینا بیکار ہے۔ اس لئے اس قدر تفصیل میں جانے کی ضرورت پڑ رہی ہے۔

موضوع کو جن عنوانات یا ابواب میں میں نے تقسیم کیا ہے اُسکی تفصیل لف ہے۔ ایک نظر دیکھ لیجئے۔

یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ یہ کام ایک ماہ میں مکمل نہ ہو سکے گا اس لئے کم از کم مئی ۱۹۸۴ء کے آخر تک کی مہلت درکار ہے۔ بعض کتب جو میں دیکھنا چاہتا ہوں وہ لاہور کے کتب خانوں میں نہیں مل رہیں۔

آپ سے از راہ کرم میری یہ گزارش صدر مملکت تک پہنچا دیجئے کہ میں اس کام کو مئی ۱۹۸۴ء کے آخر تک انجام دینے کے قابل ہو سکوں گا لہذا مجھے تب تک کی مہلت دی جائے۔

اس سلسلہ میں اگر آپکے ذہن میں کوئی باتیں ہیں تو تفصیل سے مجھے تحریر کیجئے گا۔ میں منتظر ہوں۔

خوام [illegible]

وعدہ کیا کہ وہ ان مدیروں کے پیغام کو مرکزی حکومت تک پہنچا دیں گے۔ تب سے اخبارات نے خاموشی اختیار کر لی ہے۔

ہاں درست ہے۔ یہ جان کر صدمہ پہنچا تھا۔

مخلص

[illegible]

DR. JAVID IQBAL,
M.A., Ph.D. (CANTAB),
BARRISTER-AT-LAW,
ADVOCATE HIGH COURT.
LAHORE

PAKISTANI IDEOLOGY

(1) What led to the establishment of Pakistan?

a. The isolation of Muslims and Hindus from one another because they were two distinct religious communities.

b. Islam and Hinduism confronting each other:
Historical Prospect:
From the eighth to the fifteenth century A.D.
Sixteenth century.
Seventeenth century.
Eighteenth and nineteenth century.

(2) Communal Problem in Modern times (twentyth century).

a. The religious aspect.
b. The economic aspect.
c. The social aspect.
d. The cultural aspect.
e. The political aspect.
(Two-nation Theory: Territorial specification of the Muslims in the Indo-Pak. sub-Continent.)
f. How far the development of Muslim Nationalism in the Indian sub-Continent has been responsible or the secession of Islam from India?

(3) What then is the [illegible] of Pakistan?

a. Two-nation Theory and its implications in Pakistan.
b. Muslims to develop themselves on the lines of their own distinctive culture.
c. Muslim Nationalism: The significance of this ideal.

Problems which Pakistan faces:

a. The problem of Pakistani nationality.
b. The problem of the language and the script.
c. The problem of the Constitution.

(5) Suggestions with regard to the solution of the above, keeping in view the Pakistani Ideology in its historical prospect.

This is the outline of paper which Javid Iqbal is producing for the President. As he has collected a lot of material, it is going to be a lengthy document — covering about 80 pages.

[signature]
9/4

President. — This sounds all right.

[signature]

[signature]

جاوید منزل
۳ علامہ اقبال روڈ
لاہور

مورخہ ۲۶ مئی ۶۶ء

پیارے شہاب، سلام مسنون۔

معلوم ہوا ہے کہ لندن سے واپسی پر آپ کچھ روز لاہور ٹھہرنے کی بجائے سیدھے راولپنڈی چلے گئے۔ لندن کا دورہ کیسا رہا؟ خاصی مصروفیت رہی ہو گی۔

میں بھی آج کل استنبول میں پڑھنے کے لیے اپنا مقالہ تیار کر رہا ہوں اور ساتھ ساتھ اپنے Passport Office کی Efficiency کی داد بھی دے رہا ہوں۔ تین ماہ ہوئے میں نے پاسپورٹ بننے کے لیے Passport Office Lahore کو Apply کیا تھا۔ تمام Formality مکمل ہوتے یہ وقت آگیا ہے لیکن ابھی تک Passport تیار نہیں ہو سکا۔ Passport Authorities Lahore والوں نے اب مجھے یہ بتایا ہے کہ Ministry of Education کی طرف سے مجھے ترکی جانے کا جو اجازت نامہ ملا ہے اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ Ministry of Foreign Affairs نے مجھے ترکی جانے کی اجازت دی ہے یا نہیں۔ اسی بنا پر اب لاہور والوں نے Chief Passport Officer Karachi کو اس سلسلہ میں مناسب ہدایات روانہ کرنے کے لیے تحریر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مناسب ہدایات اگر کراچی سے آجائیں تو ایک دن میں آپ کا Passport آپ کو بنا دیں گے۔ لیکن مناسب ہدایات کراچی سے آنے تک ممکن ہے ایک ماہ لگ جائے۔ اس لیے انھوں نے کہا ہے کہ اب سفارش کر دیجئے۔ اب بات نہ ہمارے بس میں ہے نہ آپ کے بس میں ہے۔

سو اس لحاظ سے تو شاید میرا ترکی جانے کا وقت بھی نکل جائے گا۔ (میں نے وہاں جولائی کا پہلا ہفتہ صرف کرنا ہے) ایک ہفتہ ہوا استنبول یونیورسٹی والوں نے زادِ راہ کے لیے خرچہ وغیرہ بھیج دیا اور روانگی کی تاریخ کے متعلق پوچھ

رکھا ہے۔ نہایت شرم کا مقام ہے کہ اُن سے زادِراہ کا خرچ وصول کر کے انھیں جلد جواب نہیں دے سکتا کہ کب استنبول پہنچوں گا۔ عجیب مشکل میں ہوں۔ خدا جانے آپ اس سلسلہ میں میری کوئی مدد کر سکتے ہیں یا نہیں۔ میں تو مایوس ہو کر بیٹھ گیا ہوں۔ مقالہ تو گو تیار کر رہا ہوں لیکن یہ علم نہیں کہ استنبول پڑھنے کا موقعہ ملے گا یا یہیں پڑھ کر دل خوش کرنا پڑے گا۔

شیلا کی کتاب قریب قریب Compose ہو چکی ہے۔ اس لیے اگر ہفتہ عشرہ تک اِس کا Foreward تحریر کر سکیں تو اُسے Kinnard College Jail Road Lahore کے پتہ پر ارسال کر دیجیے گا۔ آج کل وُہ کسی امریکی رسالہ کے لیے Universities in Pakistan کے موضوع پر ایک مضمون لکھ رہی ہے اور اُس میں جدید Educational Reforms پر بحث ہے مکمل ہونے پر غالباً آپ کو بھی ایک نقل ارسال کریں گی۔

مجھ سے شیلا نے ذکر کیا تھا کہ اُس کے کینیڈا جانے سے پیشتر آپ نے انھیں صدر صاحب سے Interview دلانے کے متعلق کہا تھا۔ میری رائے میں نہایت نیک خیال ہے۔ شیلا جولائی کے آخری ہفتہ میں واپس کینیڈا جا رہی ہے۔ اُسے کینیڈا میں پاکستان کے موضوع پر یونیورسٹی وغیرہ یا دوسری جگہوں پر تقاریر کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ اِس لیے پاکستان کی پبلسٹی کے لیے بہتر ہو گا کہ اس کا صدر سے Interview کروا دیجیے۔ (جون یا جولائی کے اوائل میں جب بھی مناسب خیال کریں)۔ باہر کے ملکوں کے Intellectuals میں انڈیا کا پراپگنڈا بہت ہے۔ لیکن ہم نے بدقسمتی سے کبھی اس موضوع کو Seriously نہیں لیا۔ بلکہ ہمارے ملک کی تو باہر پبلسٹی ہی بہت کم ہے اور اگر ہے تو اس سلسلہ میں جنھیں یہ کام سونپا گیا ہے بالکل بیکار اور ناکارہ ہیں۔ ملک کی عزت کی بجائے بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ اُن میں سے بیشتر تو Western Mind کو سمجھتے تک نہیں۔ بہرحال عنقریب لاہور آنے کا پروگرام کوئی ہے یا نہیں؟ بھابی راولپنڈی میں ہیں کہ لندن؟ اگر

یہیں ہیں تو سلام کہیے گا۔ اگر داؤ لگا تو اِن دو تین ہفتوں کے اندر کسی Week End پر آپ کو ملنے راولپنڈی کا چکر لگاؤں گا۔ بشرطیکہ مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ اب آپ کا قیام کچھ عرصہ کے لیے پنڈی میں ہی ہو گا۔

مخلص

جاوید

ثیلا نے جن مضامین کی نقول آپ سے مانگ رکھی تھیں، اب اُن کی ضرورت نہیں ہے۔ اُنھیں دوبارہ تحریر کر کے Compose کروا لیا ہے۔

DR. JAVID IQBAL.
M.A., PH.D. (CANTAB)
BARRISTER-AT-LAW
ADVOCATE, HIGH COURT
LAHORE

مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۶۰ء

جاوید منزل
۳ [illegible] روڈ
لاہور

پیارے صاحب بیگم منیرہ۔

معلوم ہوا ہے کہ تم لندن سے واپس آ گئی ہو۔ کچھ عرصہ یورپ اور انگلستان کی
سیاحت میں گزرا۔ لندن کا دورہ کیسا رہا؟ خاصی مصروفیت رہی ہو گی۔

میں بھی آج کل استنبول میں پڑھنے کیلئے خاصی تیاری کر رہا تھا
لیکن ساتھ ساتھ Passport Office کی efficiency کا دار
بھی دیکھ رہا ہوں۔ تین ماہ ہوئے میں نے پاسپورٹ بنانے کیلئے Passport Office Lahore
کو apply کیا تھا۔ تمام formalities مکمل ہو چکی ہیں۔ وقت آ گیا ہے لیکن
ابھی تک passport تیار نہیں ہوا۔ Passport Authorities Lahore والوں
نے اب مجھے یہ بتایا ہے کہ Ministry of Education کی طرف سے مجھے
ترکی جانے کا جو اجازت نامہ ملا ہے اُس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ
Ministry of Foreign Affairs نے بھی مجھے ترکی جانے کی اجازت دی ہے یا نہیں۔
اس بنا پر اب لاہور والوں نے Chief Passport Officer, Karachi کو
اس سلسلے میں مناسب ہدایات حاصل کرنے کیلئے تحریر کیا ہے۔ وہ کہتے
ہیں کہ مناسب ہدایات اگر کراچی سے آ جائیں تو ایک دن میں آپ کا
passport آپ کو جاری ہو جائے گا۔ لیکن مناسب ہدایات کراچی سے آتے
ممکن ہے ایک ماہ مزید لگ جائے۔ اس لئے انہوں نے کہا ہے کہ اب
سفارش کروائیے۔ اب بات نہ ہمارے بس میں ہے نہ آپ کے بس میں ہے۔
سوائے اس کے تو شاید میرا ترکی جانے کا وقت ہی نکل
جائے گا۔ (میں نے وہاں جولائی کا پہلا ہفتہ صرف کرنا ہے)۔ ایک ہفتہ ہوا
استنبول یونیورسٹی والوں نے مجھے زادِ راہ کیلئے زرِ مبادلہ بھیج دیا بعد روانگی

عنقریب ستمبر آنے کا پروگرام کر رہا ہے یا نہیں؟!

اب بھی راولپنڈی ہی میں ہیں کہ لندن؟! اگر یہیں ہیں تو معلوم کرنا تھا۔
اگر واپس آ گئے تو ایک دو تین ہفتوں کے اندر کسی weekend
پر آپ سے ملنے راولپنڈی کا پروگرام بنا لوں گا۔ بشرطیکہ مجھے یہ
معلوم ہو جائے کہ آپ کا قیام کچھ عرصہ پنڈی ہی میں رہے گا۔

مخلص
جابر

پ ن
شہید نے جن مضامین کا تقاضا آپ سے فرمایا تھا
تھی، اب ان کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے اپنا دیباچہ
تحریر کر کے compose کروا لیا ہے۔

ہمایوں منزل

۳۔ علامہ اقبال روڈ　　　　　　　　　　　　مورخہ ۸ ؍جون ۱۹۶۱ء

لاہور

پیارے شہاب سلام مسنون

آپ کا خط مل گیا۔ شکریہ

میں نے شیخ غلام علی اینڈ سنز فرم کے پروپرائٹر شیخ نیاز صاحب کو آپ کی تحریر کردہ تفصیل بتا دی ہے۔ شریف صاحب کی واپسی پر آپ کو ٹیلی فون کرونگا۔ اور آپ سے شیخ نیاز کے لیے Appointment کا وقت لے کر انھیں بتا دوں گا تاکہ وہ مری پہنچ کر آپ سے اور شریف صاحب سے مل لیں۔

خدا کرے اس مرتبہ بھابی عفت کی مراد بر آئے اور ہم آپ سے مٹھائی کھانے کے مستحق ہو سکیں۔ انشاء اللہ۔ مجھے یہ پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی ہے۔

شیلا نے مجھے بھی تحریر کیا تھا کہ کچھ عرصہ ہوا ایوب کے صدر حبیب نے کینیڈا کا دورہ کرتے ہوئے Montreal کے Islamic Institute کا چکر بھی لگایا اور ایک تقریر بھی کی جس میں کہا کہ اس دورِ جدید میں اشد ضروری ہے کہ مسلمان تحقیقی جرأت سے کام لیں۔ ہو سکے تو آپ بھی صدر صاحب کو وہاں تقریر کرنے کے لیے کہیے گا۔ جب میں Montreal میں تھا اور Islamic Institute گیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ لوگ صدر ایوب کی اسلام کے بارے میں تقریر کو بہت سراہتے ہیں۔ میں نے خود صدر ایوب کی تقریر (جو انھوں نے مصر میں کی تھی) کی اخباری Clippings ، Prof, Smith کو دیے کیونکہ وہ انھیں حاصل کرنے کا مشتاق تھا۔

ایک ہفتہ تک علامہ کی Diary شائع ہو جائے گی۔ انشاء اللہ اگلے ہفتہ آپ کو چھ جلدیں ارسال کر دی جائیں گی۔

لاہور میں انتہا کی گرمی پڑ رہی ہے۔ میرا فی الحال تو مری آنے کا کوئی پروگرام

نہیں۔ شاید جولائی میں چند دن نکال کر چکر لگا دُوں۔ بہر حال اگر کوئی صورت بنی تو آپ کو اطلاع دے دوں گا۔

منیرہ آپ کو اور بھابی عفت کو سلام لکھواتی ہیں۔ وہ ابھی تک اُس پنجابی مقولے (اندھے کتے ہرنوں کے شکاری) کے مطابق اپنی کوشش میں سرگرداں ہے۔ کوئی ایک ماہ ہُوا وہ اِسی سلسلہ میں راولپنڈی کا دورہ بھی لگانے والی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ وہاں جا کر بھابی عفت سے بھی ملوں گی اور اکٹھے کہیں دھاوے بولنے کا ارادہ تھا۔ لیکن اُس کا پروگرام بن نہ سکا۔ بہر حال۔

بھابی کو سلام کہئے گا۔

مخلص

جاوید
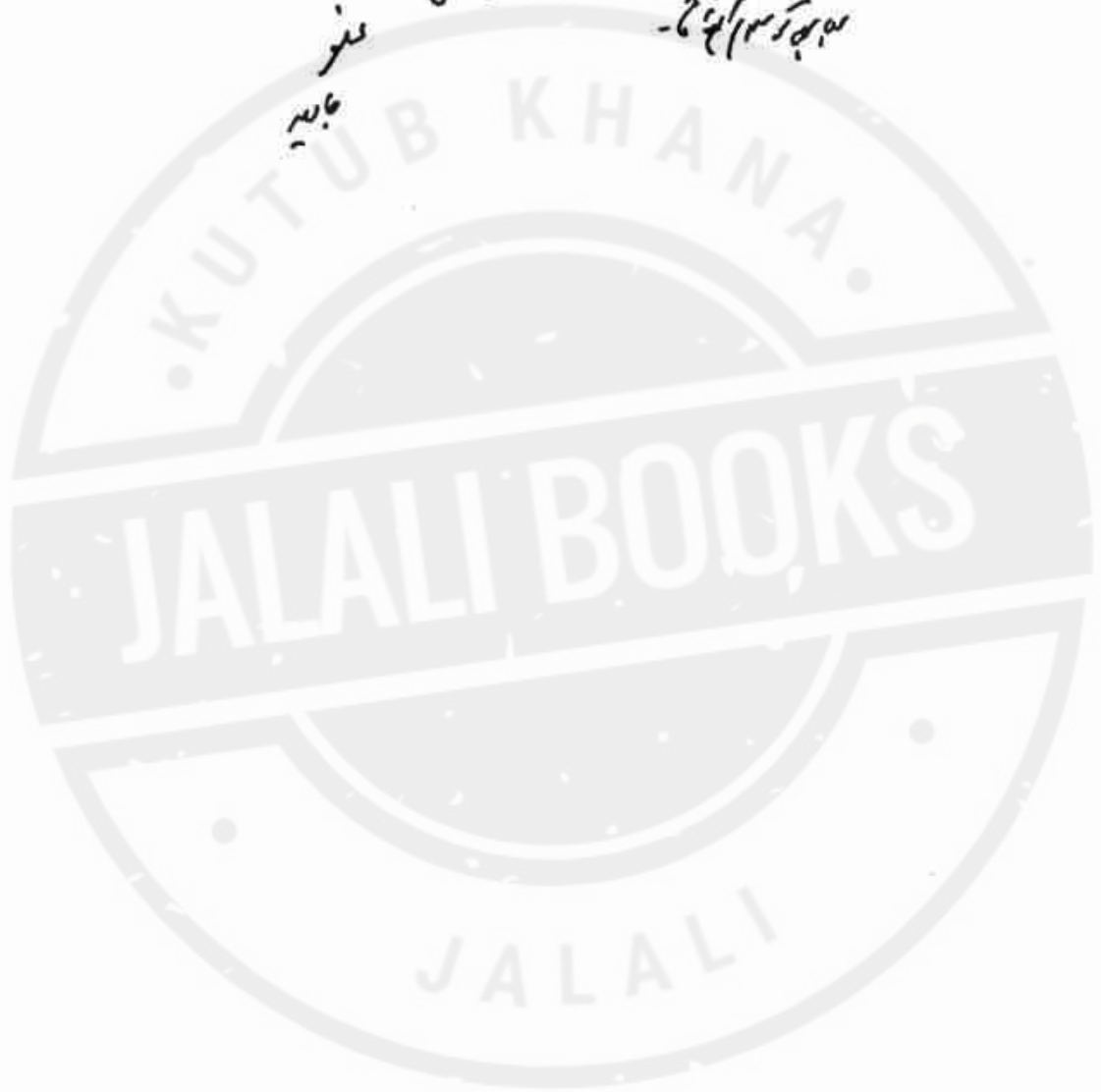
شہاب صاحب اور غلام محمدؐ صاحب

گورنر جنرل غلام محمد کے سیکرٹری کی حیثیت سے جناب قدرت اللہ شہاب اکتوبر ۱۹۵۴ء میں تشریف لائے تھے۔ فروری ۱۹۵۵ء میں غلام محمد علالت کے باعث صاحبِ فراش ہو گئے اور صرف ضروری کاغذات پر دستخط کروانے کے لیے اُن تک رسائی کی اجازت تھی تاکہ کارِ سرکار کے قانونی تقاضے پورے ہوتے رہیں۔ اگست اور ستمبر کے دو مہینے انھوں نے رخصت لے لی اور میجر جنرل سکندر مرزا ایکٹنگ گورنر جنرل تھے۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں غلام محمد خرابیٔ صحت کی بنا پر ریٹائر ہو گئے۔ یوں شہاب صاحب نے غلام محمد کے ساتھ تقریباً آٹھ دس مہینے کام کیا۔

گورنر جنرل کے ذاتی معالج کرنل محمد سرور، غلام محمد کی علالت کے دوران زیادہ وقت وہیں گزارتے اور اُن سے پرسنل سٹاف کو غلام محمد کی کیفیت کے متعلق خبریں ملتی رہتیں۔ کرنل صاحب بہت خوش مزاج تھے اور سٹاف کے سب ممبران سے ہنسی مذاق کا مشغلہ جاری رکھتے۔ شہاب صاحب سے اُن کی دوستی ہو گئی تھی اور خالی وقت اُنھی کے کمرے میں گزارنے لگے۔ وُہ غلام محمد کو لمبے عرصے سے جانتے تھے اور بڑے قصّے سنایا کرتے تھے۔

قدرت اللہ شہاب گورنر جنرل ہاؤس میں آنے سے پیشتر ہی بطورِ ایک افسانہ نگار شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اُن سے قبل گورنر جنرل کے سیکرٹری کا عہدہ کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں تھا اور ساری عزّت و احترام پرائم منسٹر کے سیکرٹری کو حاصل تھی۔ قدرت اللہ شہاب نے جہاں اِس عہدے کو عزّت بخشی وہاں اِس عہدے کی وجہ سے شہاب صاحب کی شہرت میں بھی اضافہ ہوا۔ پھر اُنھوں نے ادیبوں کا ٹریڈ یونین (پاکستان رائٹرز گلڈ) قائم کر کے ادبی دُنیا میں ایک مستقل مقام حاصل کر لیا اگرچہ بعض حلقوں کی طرف

سے یہ الزام عاید کیا گیا کہ گلڈ کا قیام محض خدمت سرکار کی خاطر عمل میں آیا ہے اور سچی بات بھی ہے کہ گلڈ نے اپنے قیام کے ابتدائی دو چار سالوں میں اس الزام کو صداقت کا رنگ دینے میں بڑی مدد کی۔

گورنر جنرل ہاؤس میں قدرت اللہ شہاب کی آمد غلام محمد کے پرسنل سٹاف کے لیے باعث رحمت ثابت ہوئی۔ غلام محمد کے مزاج کی تیزی سے سٹاف کے سبھی ممبر یکساں "مستفید" ہوتے تھے مگر جو زیادہ قریب ہوتا تھا زیادہ نشانہ بنتا تھا۔ باوردی سٹاف میں اے ڈی سی اور سول سٹاف میں پی اے سب سے جونیئر تھے۔ چونکہ طغیانی ہمیشہ اوپر سے نیچے کی طرف سفر کرتی ہے اس لیے سینیئر افسر طوفان کا رُخ ہمیشہ جونیئر کی طرف موڑ دینے کی کوشش کرتے اور اے ڈی سی اور پی اے ہر قسم کے کردہ یا ناکردہ گناہ کے مرتکب ٹھہرائے جاتے تھے۔ شہاب صاحب کے آنے سے یہ رسم کہن ٹوٹ گئی۔ یہ دُوسروں کی خطاؤں کو بھی اپنے کھاتے میں ڈلوا کر خوش ہوتے۔ یوں سارا سٹاف شہاب صاحب کا گرویدہ ہو گیا تھا۔

قدرت اللہ شہاب اُردو کے ادیب تھے مگر شاید کم ہی لوگوں کو علم ہو گا کہ اُن کی انگریزی اُن کی اُردو سے کہیں بہتر تھی۔ وہ ایوانِ صدر میں ہر نئی تبدیلی پر دلچسپ مضمون لکھتے جو صرف ایوان صدر کے اندر ہی گردش کرتا لہٰذا نیا پریزیڈنٹ شروع ہی میں شہاب صاحب کے اشہبِ قلم سے مرعوب ہو جاتا اور موصوف سے اپنے تعلقات میں اس بات کو ضرور ذہن میں رکھتا کہ میرے جانے کے بعد یہ شخص مجھ پر بھی مضمون لکھ کر مجھے بنا یا بگاڑ سکتا ہے۔

غلام محمد کی ریٹائرمنٹ پر اسکندر مرزا گورنر جنرل بنے اور بعد میں آئین کے نفاذ پر ملک کے پہلے صدر منتخب ہوئے تو شہاب صاحب نے غلام محمد پر جو مضمون لکھا اُس کا عنوان تھا "میری زندگی کی سب سے ناقابلِ فراموش شخصیت"

The most unforgetable character I have met·

غلام محمد ہی پر انھوں نے ایک اور مضمون ایوب خاں کے آنے کے بعد لکھا۔

اُس کا عنوان تھا "محمد کا غلام بطورِ گورنر جنرل" The Slave of Muhammad as Governor General پہلے مضمون میں غلام محمد کا اپنے سٹاف کے ساتھ برتاؤ کے کئی دلچسپ واقعات لکھے تھے جن سے غلام محمد کی بے صبری، جلد بازی اور تیزی و تندی ہی ظاہر ہوتی تھی مگر ساتھ ہی اُس کے کردار کی بلندی اور خلوص نیّت کی جھلکیاں بھی تھیں۔ دُوسرا مضمون غلام محمد کی شخصیت کے کچھ پنہاں گوشے اجاگر کرنے کے علاوہ اسلام سے اس کی وابستگی کا مظہر تھا۔

اگرچہ شہاب صاحب کا اپنا پی اے (راحت علی محمود) موجود تھا مگر اس قسم کے مضامین وُہ مجھے ٹائپ کرنے کے لیے دیتے اور میں پریزیڈنٹ کے کام سے وقت نکال کر ٹائپ کر دیتا۔ جو مضمون مجھے زیادہ پسند آتا اس کی ایک کاپی یا شہاب صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ رکھ لیتا جس کی اُنھوں نے اجازت دے رکھی تھی۔ مذکورہ دونوں مضامین کی کاپیاں میرے پاس محفوظ ہیں۔ اُن کی خوبصورت انگریزی کا اُتنی ہی خوبصورت اُردو میں ترجمہ کرنا میرے لیے ناممکن ہے تاہم اپنے طور پر سلیس اُردو میں اُن کے اُس مضمون کا ترجمہ پیش کرتا ہوں جس کا عنوان ہے "محمد کا غلام بطورِ گورنر جنرل"۔

"غلام محمد یا لغوی اعتبار سے محمد کا غلام، غیر معمولی ذہانت و فطانت کا حامل تھا۔ A Genious of Extraordinary Character

اپنے کیریر کے آغاز ہی سے وُہ ایک انتہائی ذہین مگر تند خو شخص مشہور ہو گیا تھا۔ چالیس کے عشرے میں انگریز جرنیل اُس کی تند مزاجی کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے تھے مگر اُنھیں یہ گوارا نہ تھا کہ جنگ کے لیے سپلائی کا کام کسی دُوسرے کو سونپا جائے۔ جنگ کے ختم ہونے پر نظام حیدر آباد نے غلام محمد کو اپنا وزیرِ خزانہ مقرر کر لیا جہاں اُسے ریاست کے مالی امور کو اپنی مرضی سے چلانے کی کھُلی چھٹی تھی۔ برصغیر کی تقسیم پر قائدِ اعظمؒ نے غلام محمد کو پاکستان کا پہلا وزیرِ خزانہ مقرر کیا۔

پاکستان کے قیام کے وقت حالات بڑے سنگین تھے۔ ملک کے دونوں حصّوں کے درمیان بارہ سو میل لمبا دُشمن کا علاقہ حائل تھا۔ اتنی

لاکھ سے زیادہ لٹے پٹے مہاجرین کا سیلاب اور انتظامیہ کی یہ حالت کہ قلم پنسل تک ندارد۔ غلام محمد نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے چار سال تک مسلسل متوازن بجٹ پیش کیے۔ پاکستان کی اپنی کرنسی جاری کی، بنک قائم کئے اور صنعتی، زرعی اور دیگر ترقیاتی اداروں کی بنیاد رکھی۔ بلاشبہ یہ غیر معمولی کارنامہ تھا مگر غلام محمد کو اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ ہائی بلڈ پریشر اور فالج کے پے در پے حملے ہوئے۔ انھی حملوں کی وجہ سے نڈھال ہو کر صاحب فراش تھے کہ ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خاں کی شہادت پر اُنھیں گورنر جنرل کا عہدہ پیش کیا گیا۔ کابینہ کا خیال تھا کہ غلام محمد اپنے پیش رو کی طرح عیش و عشرت کے دن گزاریں گے اور سرکاری تقریبات کو زینت بخشنے کے علاوہ پارلیمنٹ کی کارروائی پر رسمی منظوری کی مُہر ثبت کر دیا کریں گے۔

تاہم بعد میں پیش آنے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ سب اندازے غلط تھے کیونکہ غلام محمد کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وُہ خاموش تماشائی بنا رہے اور نااہل مفاد پرست سیاست کی آڑ میں ملک کی قسمت کے ساتھ کھیلتے رہیں۔ چنانچہ جب پروڈا Proda اور ایبڈو EBDO جیسے حربے بھی ناکام ثابت ہوئے تو غلام محمد کو ایسے اقدام کرنے پڑے جو اُن لوگوں کے لیے ناخوشگوار تھے اور انھوں نے واویلا شروع کر دیا۔ مگر غلام محمد کا یہ پختہ عزم تھا کہ ملک جو دین اسلام کے نام پر وجود میں آیا اُسے صرف چند سیاسی اصطلاحات کی خاطر تباہ نہ ہونے دے گا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اللہ کے حضور میں وُہ اس بات کا جواب دہ ہے۔

درحقیقت غلام محمد وہ پہلا مفکر تھا جو اس نتیجہ پر پہنچ پایا کہ پارلیمانی نظام حکومت پاکستانی عوام کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اُس کے خیال میں یہ اسلامی اصولوں کے قطعی منافی تھا کہ سربراہ مملکت صرف خانہ پُری

اور محض سرکاری تقریبات میں شرکت کرنے کے لیے موجود رہے۔ یہ خدا کی طرف سے عطا کردہ صلاحیتوں کا ضیاع اور اصراف ہوگا جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دیتا۔

۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے نفاذ پر جنرل محمد ایوب خاں نے اپنی نشری تقریر میں پہلی دفعہ یہ انکشاف کیا کہ کئی مواقع پر انھوں نے مرحوم غلام محمد کی طرف سے اقتدار کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا اس امید پہ کہ شاید سیاستدانوں میں اتنا شعور پیدا ہو جائے اور وہ ملکی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا شروع کر دیں۔ بے شک یہ جنرل ایوب خاں کے اعلیٰ ظرف اور بے لوث ہونے کا بین ثبوت ہے مگر ہمیں غلام محمد کی بصیرت کو بھی خراج تحسین ادا کرنا چاہیے جس نے سب سے پہلے حالات کا صحیح ادراک حاصل کیا پھر صحیح علاج تجویز کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے سے بہتر آدمی کے لیے جگہ خالی کرنے کی پیش کش کر دی۔ ظاہر ہے ایوب خاں میں اُسے وہ شخص نظر آگیا تھا جو ملک کو نہ صرف تباہی سے بچا سکتا تھا بلکہ سیاسی استحکام کے ساتھ پاکستان کو اقوام عالم میں اس کا جائز مقام بھی دلوا سکتا تھا۔ اگر جنرل ایوب خاں نے غلام محمد کی اُس پیش کش کو مان لیا ہوتا تو ملک اُن مصائب سے بچ سکتا تھا جو اس پیش کش اور اکتوبر ۱۹۵۸ء کے درمیانی عرصے میں مقدر رہے۔

غلام محمد دراصل ایک انقلابی ذہن کا مالک تھا۔ فروری ۱۹۵۱ء میں لاہور کے موچی دروازے میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اُس نے کہا تھا کہ وہ انقلاب لانا چاہتا ہے۔ ذہنی اور اخلاقی انقلاب۔ وہ سمجھتا تھا کہ پاکستان کی مادی ترقی کے لیے ایسا انقلاب ناگزیر ہے۔ وہ غور و فکر کے بعد جب کسی نتیجہ پہ پہنچ جاتا تو دُنیا کی کوئی طاقت اُسے اپنے فیصلے پر عمل کرنے سے نہ روک سکتی تھی۔ اس کی زندگی اور

موت پاکستان کی خاطر تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ہمارا وجود پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے الفاظ تھے

Who Dies if Pakistan lives
Who Lives if Pakistan dies

افسوس کہ غلام محمد کی باتوں سے ہم نے کچھ نہ سیکھا اور ملک مادی اور روحانی طور پر زوال پذیر ہوتا چلا گیا اور نوبت اکتوبر ۱۹۵۸ء تک پہنچ گئی

غلام محمد کو خوشامد سے سخت نفرت تھی۔ ایک مرتبہ کسی خوشامدی نے جو غلام محمد کے مزاج سے واقف نہیں تھا اُسے قائداعظم کا صحیح جانشین قرار دیا۔ غلام محمد غصہ سے لال پیلا ہو گیا۔ کہنے لگا سب بکواس ہے۔ قائداعظم یگانہ روزگار تھے۔ وہ ہم سب سے بہت بلند تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی اُن کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ اُن کی عظمت میں کوئی بھی شریک ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پھر یہ شعر پڑھا:

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ ہم میں نہ تھا کوئی بھی یگانہ ہرگز

غلام محمد کو البتہ اس بات پر فخر تھا کہ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ ہر دو تین ماہ بعد وہ غریب و نادار بچوں کو کھانے پر بلایا کرتا۔ اُن کے ساتھ دری پر بیٹھ کر باتیں کرتا۔ ایک دفعہ ایسی ہی نشست میں اُس نے بچوں سے کہا کہ بچو کبھی میں بھی تمہاری طرح ایک غریب بچہ تھا مگر مجھے محنت کرنے کی عادت تھی۔ تم بھی محنت کرنے کی عادت ڈالو تاکہ ایک دن بڑے آدمی بن سکو۔ وہ اکثر اپنے مصیبت زدہ دوست احباب کے خطوط پڑھ کر غم زدہ ہو جاتا اور خاموشی سے اُن کی مالی امداد کرتا رہتا تھا۔

دوسری بات جس پر اُسے فخر تھا وہ اس کا نام تھا۔ ایک جلسے میں کسی نے جناب رسالتمآب کے ساتھ غلام محمد کی محبت کا ذکر کیا۔ جواب میں غلام محمد نے کہا کہ میں ایک گناہ گار آدمی ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے توفیق

عطا فرمائے کہ اپنے فرائض پوری دیانت داری اور خلوص مگر بے خوف وخطر ہو کر ادا کر سکوں۔ میں رسول اکرمؐ کا ادنیٰ ترین غلام ہوں اور مجھے اپنے نام پر فخر ہے۔ اتنا کہہ کر اپنا داہنا ہاتھ اُوپر اُٹھاتے ہوئے فرطِ جذبات سے کہا

نازم بنام خود کہ غلام محمدؐ است

غلام محمد نے اپنے اکلوتے بیٹے کا نام انعام محمد رکھا تھا اور اُس کے دل کے نہاں خانے میں شدید خواہش تھی کہ زندگی کے بقیہ ایّام مدینۃ الرسولؐ میں بسر کرے۔

مالی معاملات میں غلام محمد کی دیانتداری مثالی تھی۔ اُس نے کبھی سرکاری سٹیشنری کو ذاتی خط وکتابت کے لیے خرچ نہ ہونے دیا۔ اس غرض کیلئے بازار سے رائٹنگ پیڈ خریدے جاتے اور پی اے ٹکٹوں وغیرہ کا باقاعدہ حساب رکھتا تھا۔

غلام محمد کو قرآنِ حکیم کی تلاوت سُننے کا بڑا شوق تھا۔ گورنر جنرل ہاؤس میں نذیر احمد نامی ایک چپڑاسی تھا اور جو ابھی زندہ ہے وُہ غلام محمد کو تلاوت سُنایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ سر آغا خان کراچی میں غلام محمد کے مہمان تھے کہ ناشتے کی میز پر اسلام اور قرآن پر بات چل نکلی۔ غلام محمد نے نذیر احمد کو بلوایا جب نذیر احمد تلاوت کر چکے تو غلام محمد سر آغا خاں کو بیٹھا چھوڑ کر نذیر احمد کو رخصت کرنے دروازے تک چل کر گیا۔

غلام محمد دن کی ابتدا ہمیشہ نماز سے کرتا تھا۔ اگر کسی وجہ سے بر وقت فجر کی نماز ادا نہ کر سکتا تو ناشتہ سے پہلے بہرصورت ادا کر لیتا۔ گورنر جنرل بنتے ہی اُس نے حکم دیا تھا کہ جمعہ کی نماز گورنر جنرل ہاؤس کے سبزہ زار میں ادا ہوا کرے گی اور اُس دوران گورنر جنرل ہاؤس کے دروازے کھلے رکھے جائیں۔ چنانچہ جمعہ کے دن بعد دوپہر کوئی سرکاری مصروفیت نہ رکھی جاتی اور غلام محمد کلرکوں، چپڑاسیوں اور مالیوں کے درمیان عموماً آخری صف میں نماز ادا کیا کرتا۔

غلام محمد کو صوفیا سے بڑی عقیدت تھی جنھوں نے برصغیر میں اسلام کو فروغ دیا اور جن کی برکتوں سے مسلم اکثریت والے علاقے پاکستان بن سکے۔ جب بھی لاہور یا ملتان جاتا تو صوفیا کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کیلئے ضرور جایا کرتا۔ وہ خود بھی وارثی سلسلہ سے بیعت تھا جس کے بانی سید وارث علی شاہ لکھنوٴ (بھارت) کے قریب دیوی شریف میں دفن ہیں۔ وارثی سلسلے کی نسبت سے وہ ہمیشہ زمین پر سوتا۔

ایک چیز جس سے غلام محمد کو نفرت تھی وہ سستی اور تساہل تھا جو اُس کے لیے ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ معافی تھی۔ وہ سٹاف سے اپنے جیسی حاضر دماغی کی توقع رکھتا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی اُس سے چھپانی مشکل تھی۔ تاہم دل سے وہ ایک مہربان تھا۔ جھاڑ جھپاڑ کرنے کے فوراً بعد شفقت کا اظہار کرنے لگتا اگرچہ شفقت کا وقفہ مختصر ہوتا تھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد غلام محمد کلفٹن میں اپنی بیٹی کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ ایک دوپہر کھانے کے بعد سو گیا تو خلافِ معمول جلدی بیدار ہو گیا۔ خوش تھا کہ سید وارث علی شاہ خواب میں تشریف لاکر رات دس بجے ملاقات کے لیے فرما گئے ہیں۔ گھر والوں سے کہا کہ ہوائی جہاز چارٹر کر دو جو اُسے دیوی شریف لے جائے اُس کے معالج کرنل سرور نے سمجھایا کہ صحت کے لیے سفر مناسب نہیں یہ سُنتے ہی دل کا دورہ پڑا اور دو گھنٹے تک بے ہوش رہے۔ آٹھ بجے دُوسرا اور آخری دل کا دورہ پڑا اور ٹھیک دس بجے غلام محمد نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور شاہ صاحب سے جاملے۔

شہاب صاحب اور اسکندر مرزا صاحب

سکندر مرزا اگست ۱۹۵۵ء میں ایکٹنگ گورنر جنرل بن کر تشریف لائے تھے۔ قبل ازیں وہ وفاقی وزیرِ داخلہ اور امورِ کشمیر تھے۔ دو ماہ وہ ایکٹنگ گورنر جنرل رہے اور اکتوبر ۱۹۵۵ء میں غلام محمد کی ریٹائرمنٹ پر باقاعدہ گورنر جنرل بنا دیے گئے۔ مارچ ۱۹۵۶ء میں آئین کے نفاذ پر قومی اسمبلی نے اتفاق رائے سے انھیں اسلامی جمہوریہ پاکستان کا پہلا صدر منتخب کیا یا دوسرے لفظوں میں انھوں نے قومی اسمبلی سے خود کو متفقہ طور پر صدرِ پاکستان منتخب کروا لیا۔

سکندر مرزا جب باقاعدہ گورنر جنرل بنے تو گورنر جنرل کا سول پرسنل سٹاف چار افسران پر مشتمل تھا۔

سیکرٹری	قدرت اللہ شہاب
اِسسٹنٹ سیکرٹری	فرخ امین
پرسنل سیکرٹری	مِس روتھ بورل
پرسنل اسسٹنٹ	راقم

سکندر مرزا نے آتے ہی اسسٹنٹ سیکرٹری اور پرسنل سیکرٹری کو تبدیل کر دیا۔ فرخ امین حضرت قائدِاعظم کے پی اے رہ چکے تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے انھیں ترقی دے کر اسسٹنٹ سیکرٹری بنایا تھا۔ غلام محمد سب سے زیادہ بھروسہ فرخ امین ہی پر کرتا تھا۔ وہ بہت ذہین اور قابلِ اعتماد آفیسر تھا۔ مس روتھ بورل سویڈن کی رہنے والی تھیں۔ مغربی جرمنی میں سفارت پاکستان میں سٹینوگرافر ہوتی تھیں کہ ۱۹۵۳ء میں غلام محمد نے انھیں پرسنل سیکرٹری مقرر کیا۔ فرخ امین پلاننگ کمیشن میں چلے گئے اور

رودھ واپس وطن چلی گئیں۔

پرسنل سیکرٹری کی اسامی پر این ڈی احمد آ گئے جو وزارتِ داخلہ میں سکندر مرزا کے پرائیویٹ سیکرٹری ہوتے تھے۔ اسسٹنٹ سیکرٹری کی اسامی آفس سپرنٹنڈنٹ عبدالوحید نے پُر کر دی۔ یہ شخص کٹر قادیانی تھا۔

سکندر مرزا کے آنے کے کچھ دنوں بعد قدرت اللہ شہاب نے غلام محمد پر ایک مضمون لکھا عنوان تھا۔

The most unforgetable character I have met.

یعنی میری زندگی کی انتہائی ناقابلِ فراموش شخصیت۔ سکندر مرزا نے مضمون پڑھا تو اُسے علم ہو گیا کہ بظاہر یہ کم گو اور ڈھیلا ڈھالا سیکرٹری کس قدر خطرناک یا مفید ہو سکتا ہے۔ سکندر مرزا انڈین پولیٹیکل سروس کا تربیت یافتہ تھا۔ قدرت اللہ شہاب کا رتبہ ایک درجہ بلند کر دیا اور مجھے بھی اگلے گریڈ میں ترقی دے دی۔ اس کے علاوہ بھی اُس نے اور کئی طرح سے پرسنل سٹاف پر نوازشیں کیں۔ تاہم تھوڑے ہی عرصے بعد اُس نے سیاسی جوڑ توڑ کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کیا تو قدرت اللہ شہاب بہت دلگیر ہوئے اور سول سروس سے کنارہ کشی کی کوشش شروع کر دی۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں سکندر مرزا رخصت ہو گئے تو شہاب صاحب نے کوئی خصوصی مضمون نہ لکھا جیسا کہ غلام محمد کے چلے جانے کے بعد لکھا تھا تاہم اُن کی مختلف تحریروں سے سکندر مرزا کے متعلق اُن کے تاثرات کا پتہ چلتا ہے۔ غلام محمد پر ایوب خاں کے آنے کے بعد لکھا ہوا مضمون "محمد کا غلام بطور گورنر جنرل" میں انھوں نے سکندر مرزا کا ذکر کیا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں اُنھوں نے ایوب خاں سے سول سروس چھوڑنے کی اجازت کے لیے جو خط تحریر کیا تھا اُس میں بھی سکندر مرزا کا ذکر ہے اور آخر میں ایوانِ صدر سے رخصت ہوتے وقت ۱۹۶۲ء میں اپنے مضمون "ایوان صدر میں میرا آخری دن" میں بھی اسکندر مرزا کا تذکرہ کیا۔ یہ تینوں دستاویزات انگریزی زبان میں ہیں۔ یہاں ہم متعلقہ حصوں کا اُردو میں ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

"غلام محمد کا پختہ عزم تھا کہ کسی بھی قسم کی مادی ترقی کے لیے اخلاقی اور روحانی ترقی ناگزیر ہے۔ اُسے اپنے ایمان و ایقان سے زیادہ کوئی شے عزیز نہ ہوتی تھی۔ اس کی زندگی اور موت پاکستان کی خاطر تھی۔ وُہ اکثر کہا کرتا کہ ہمارا وجود و عدم وجود پاکستان کے ساتھ ہے۔

Who lies if Pakistan dies, and who dies if Pakistan lives.

بدقسمتی سے غلام محمد کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ مادی و اخلاقی زوال جاری رہا اور قول و فعل سے صدق و سچائی کا عنصر مفقود ہوتا چلا گیا۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ جنرل سکندر مرزا حُب الوطنی کے زعم میں یہاں تک کہنے لگ گیا کہ My Country Right or Wrong اگر سو گن کی منطقی تشریح کرنے لگیں تو جو صورت سامنے آئے گی وُہ یہ ہے۔

میرا ملک ، سچا ہو یا جھوٹا
میری حکومت ، سچی ہو یا جھوٹی
میری پارٹی ، صحیح ہو یا غلط
میرا دوست ، سچا ہو یا جھوٹا
اور آخر میں
میرا ذاتی مفاد ، جائز ہو یا ناجائز

سکندر مرزا کے پورے کردار کا خلاصہ یہی ہے۔"

۱۹۶۱ء میں قدرت اللہ شہاب نے ایوب خاں کے نام اپنے جس خط میں سول سروس چھوڑنے کی اجازت طلب کی تھی اُس کے تیسرے پیرا گراف میں لکھتے ہیں:

"۱۹۴۱ء میں جب میں نے انڈین سول سروس میں شرکت کی تو میں نے اپنے دل میں صرف پانچ برس تک سروس میں رہنے کا ارادہ کیا تھا تاکہ بیوروکریسی کی نفسیات سے آگاہی حاصل کر سکوں۔ تاہم پاکستان کے قیام نے مجھے اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں

میں نے اُس وقت کے صدر پاکستان (سکندر مرزا) کی خدمت میں استعفیٰ پیش کر دیا کیونکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ میں اُن حالات میں سروس سے نباہ نہیں کر سکوں گا۔ میں اس قدر پریشان تھا کہ دل چاہتا تھا ملک چھوڑ کر جلا وطنی اختیار کر لوں چاہے حکومت میری پنشن ہی کیوں نہ ضبط کر لے۔ لیکن مجھے ملازمت چھوڑنے کی اجازت نہ دی گئی۔ پھر ۱۹۵۸ء میں انقلاب رونما ہوا اور اس کے ساتھ ہی میرے سروس کیریر کا خوشگوار ترین دور شروع ہو گیا جو ابھی تک جاری ہے۔

شہاب صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا چھ صفحات پر محیط اس خط کا مسودہ (ڈرافٹ) میرے پاس موجود ہے۔ اسی طرح میرے پاس اُن کے اُس مضمون کا آٹھ فل سکیپ صفحات کا ڈرافٹ بعنوان "ایوانِ صدر میں میرا آخری دن" موجود ہے۔ اس مضمون میں غلام محمد کا تذکرہ کرنے کے بعد سکندر مرزا کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جنرل سکندر مرزا کے ماتحت کام کرنے کا عرصہ میرے لیے کم اعصاب شکن نہیں تھا۔ جب ۱۹۵۶ء میں پاکستان اسلامی جمہوریہ بنا اور جنرل سکندر مرزا نے جمہوریہ کے پہلے صدر کا حلف اٹھایا تو میں پھولا نہ سماتا تھا کہ اپنے ملک کے پہلے صدر کا سیکرٹری ہوں مگر افسوس کہ یہ جذباتی کیفیت بہت قلیل المدت ثابت ہوئی۔ وزارتیں بننے اور ٹوٹنے کا سلسلہ اس برق رفتاری سے شروع ہوا کہ طبیعت اچاٹ ہونے لگی ہر صبح دفتر آنے سے پہلے ریڈیو پاکستان سے صبح کا خبرنامہ ضرور سن لیتا تاکہ اگر راتوں رات کابینہ بدل چکی ہو تو میں اپنا کوٹ اور ٹائی ساتھ لیتا چلوں تاکہ حلف اٹھانے کی تقریب میں اپنے فرائض منصبی ادا کر سکوں۔

ایک مرتبہ کسی صاحب نے آدھی رات کو مجھے ٹیلیفون کر کے پوچھا کہ کل صبح نئی کابینہ کتنے بجے حلف اٹھائے گی تاکہ وہ وقت پہ پہنچ سکیں۔

ایک دفعہ نئی کابینہ کئی روز تک حلف نہ اُٹھا سکی کیونکہ "تر" اور "خشک" وزارتوں کی تقسیم پر سمجھوتا نہ ہو سکا تھا۔ بالآخر جب سودا طے ہو گیا تو وزراء کرام حلف اُٹھاتے ہی اپنی اپنی وزارت کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ اچانک انکشاف ہوا کہ وزارتِ تعلیم کسی نے قبول نہیں کی۔ مجھے بھگایا گیا کہ جاؤ دیکھو کونسا وزیر ابھی تک گاڑی کی انتظار میں کھڑا ہے۔ اتفاق سے ایک صاحب جن کی ٹانگ میں تکلیف تھی اور بھاگ نہیں سکتے تھے ابھی پورچ میں گاڑی کے منتظر تھے۔ اُنھیں پکڑ کر لایا گیا کہ چلو تعلیم کی وزارت کا قلمدان بھی سنبھال لو۔ وُہ بندۂ خدا راضی نہ ہوتا تھا اور بڑی مشکل سے وزارت تعلیم اس کی مرضی کے خلاف اُس کے سر تھوپ دی گئی۔"

حلف برداری کی تقریبات میں شرکت کرنے کے علاوہ میرا دُوسرا کام صدرِ پاکستان کے لیے تقریریں تیار کرنا ہوتی تھیں۔ مجھے مہارت حاصل ہو گئی تھی کہ ہر موقع کے لیے چار پانچ صفحات کی تقریر گھسیٹ دوں کیونکہ مجھے علم تھا کہ مقرر اور سامعین دونوں خود سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے کہ اس کا وہی مطلب نہیں ہے بلکہ آرٹ برائے آرٹ والی بات ہے۔

ایک مرتبہ ایک ہی دن میں دو تقریبات تھیں۔ ایک تقریب سائنس کانفرنس اور دُوسری ہسٹری کانفرنس کا افتتاح تھا۔ میں نے ایک ماسٹر ڈرافٹ تیار کر لیا اور پھر نفسِ مضمون کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ الفاظ کی رد و بدل کر دی۔ ایک تقریر میں کہا گیا تھا کہ سائنس تاریخ ساز کردار ادا کرتی ہے اور دُوسری تقریر میں کہا گیا تھا کہ ہسٹری بذاتِ خود ایک سائنس ہے۔ بقیہ متن تقریباً ایک جیسا تھا۔ سوئے اتفاق سے

ADC نے دونوں مواقع پر غلط تقریر جناب صدر کو پڑھنے
کے لیے تھما دی۔ چونکہ سائنس اور ہسٹری میں چولی دامن کا ساتھ ہے
اس لیے کسی کو بھی اس غلطی کا احساس نہ ہو سکا البتہ پریس کے
نمائندوں کو متن حوالے کرتے وقت ضرور احتیاط برت لی گئی تھی۔

PRESIDENT'S HOUSE

Ministers he sworn at!"

One, newly formed Cabinet sat unsworn-in for a couple of days because there was some difficulty over the division of "wet" and "dry" portfolios. When ultimately a bargain was struck, the Ministers took their oath of office and rushed to their Ministries. Suddenly it was discovered that nobody had asked for Education and the portfolio, therefore, had remained unallocated. I was asked to run and bring back any minister who had not yet left the President's House. The only gentleman available was a sickly person who could not walk fast and was therefore still in the porch waiting for his car. He was hurried back into the Cabinet room and told, "Come on, take Education also" He was not much thrilled by it and pocketed the portfolio with a rather non-committal air.

My only other job during this period was to produce speeches of some sort for one occasion or another. This was a perfunctory work because what was said in those speeches was hardly meant and those who heard it knew that it was so. It was all art for art's sake

Once two functions fell on the same day. One was the inauguration of a Science Conference and the other of a History Conference. I produced one master draft for both

PRESIDENT'S HOUSE

the specially chartered Super-Constellation was parked, a minister, deeply addicted to photography, rushed forward to open the door of the car to greet the Governor-General and snap him. For a moment he was bewildered when mighty I stepped out of the vehicle and, true to my part, I tried to shake a warm protocol hand with him! Naturally, the minister stepped back and swore rather loudly

x x x x x x

My term under Major-General Iskander Mirza was also one of continued hyber-nation

When, in March 1956, Pakistan was declared a Republic and the first President was sworn-in, I was deeply thrilled. It was a privilege to be the Secretary of the first President, but this emotional jubilation proved to be only short-lived. Cabinet after Cabinet started being made and unmade with such lightning rapidity that the process became much too boring. Before leaving my house for the office, I made it a point to listen-in to the morning news-bulletin of Radio Pakistan. If it announced the formation of a new Govt. during the course of the night, I would take a coat and necktie with me to be able to hang round the swearing-in ceremony

Once a new-comer to a Cabinet telephoned to me asking, "At what time will the new

شہاب صاحب اور فیلڈ مارشل صاحب

سات اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات جب وفاقی اور صوبائی وزارتوں اور اسمبلیوں کو توڑ کر جنرل سکندر مرزا نے مارشل لاء نافذ کیا تو اس کارروائی میں قدرت اللہ شہاب شریکِ محفل نہیں تھے۔ سکندر مرزا نے اپنے پرسنل سیکرٹری (نصرت) اور پرسنل اسسٹنٹ (راقم) کو بلا رکھا تھا اور سارا دفتری کام ہمیں سے لیا گیا تھا۔ آدھی رات کے قریب جب وفاقی سیکرٹریوں کو ایوانِ صدر طلب کیا گیا تو شہاب صاحب بھی اُس وقت تشریف لائے اور بریفنگ میں شریک ہوئے۔ بیس روز بعد یعنی ۲۷ اور ۲۸ اکتوبر کی رات کو جب جنرل ایوب خان نے سکندر مرزا کے خلاف کارروائی کر کے زمامِ اقتدار کلی طور پر اپنے ہاتھ میں لے لی تو صدر کے پرسنل سٹاف کا کوئی ممبر موجود نہیں تھا۔ سب کو صبح کے ریڈیو کے خبرنامہ سے واقعہ کا علم ہوا۔

نومبر کا سارا مہینہ جنرل ایوب خاں صاحب سابق پرائم منسٹر ہاؤس میں مقیم رہے۔ اور ایوانِ صدر سے سول سٹاف کے کسی ممبر کو طلب نہ کیا۔ اس دوران سٹاف کے متعلق خفیہ انکوائری ہوتی رہی۔ دسمبر کے شروع میں جنرل صاحب صدر پاکستان کی حیثیت سے ایوانِ صدر منتقل ہوئے اور سول سٹاف سے رابطہ قائم ہوا۔ پرسنل سیکرٹری نصرت کو جنھیں سکندر مرزا وزارت داخلہ سے ساتھ لائے ہوئے تھے خفیہ انکوائری کے نتیجے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

شروع شروع میں قدرت اللہ شہاب نے اپنی عادت کے مطابق کسی قسم کی گرمجوشی کا اظہار نہ کیا اور بن بلائے محض سلام کرنے کی غرض سے جنرل صاحب کے سامنے کبھی نہ گئے مگر زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ اُن کے اور صدر ایوب کے درمیان باہمی اعتماد کی فضا

قائم ہوگئی، شہاب صاحب صدر کے سیکرٹری کے عہدے پر جون یا جولائی ۱۹۶۲ء تک فائز رہے اور اس سارے عرصے میں اُنھوں نے پوری دل جمعی سے ایوب خاں کیلئے خدمات انجام دیں۔

ایوب خاں کے بارے میں شہاب صاحب کے تاثرات میرے پاس موجود اُن کی بیشتر تحریروں میں ملتے ہیں۔ دو تحریروں کا ذکر میں نے پچھلے باب میں سکندر مرزا کے حوالے سے کر دیا ہے یعنی ۱۹۶۱ء میں تحریر کردہ شہاب صاحب کے اُس خط کا مسودہ یا ڈرافٹ جس میں شہاب صاحب نے ایوب خاں سے سول سروس چھوڑنے کی اجازت طلب کی تھی اور دُوسرا وہ مضمون جو "ایوانِ صدر میں میرا آخری دن" کے عنوان سے اُنھوں ۱۹۶۲ء میں تحریر کیا تھا:

اِن دو دستاویزات کے علاوہ بھی میرے پاس اُن کی کئی اور تحریریں ہیں جن میں ایوب خاں کے متعلق اُن کے مثبت خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ اِن میں سب سے اہم اُن کے دو مضامین ہیں اوّل وُہ جو اُنھوں نے ۱۹۵۹ء کے وسط میں سول سروس کے افسروں کی ایسوسی ایشن میں پڑھنے کے لیے تحریر کیا تھا جس کا قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ عنوان تھا

انقلاب کے دس مہینے

دُوسرا مسودہ گیارہ صفحات پر مشتمل بغیر عنوان کے اُس مضمون کا ہے جسے اُنھوں نے فروری ۱۹۶۰ء میں تحریر کیا تھا اور جس میں ایوب خاں، جو اُس وقت فیلڈ مارشل بن چکے تھے، کے کام کرنے کا طریقہ، ان کا انداز فکر اور ملک کی خدمت کے لیے بے لوث جذبے کو بے حد سراہا گیا ہے۔

اِن سب دستاویزات کا ترجمہ پیش کرنا غیر ضروری طوالت کا باعث ہوگا۔ البتہ چیدہ چیدہ حصّوں کا ترجمہ پیش کرتا ہوں تاکہ شہاب صاحب کا ایوب خاں کے بارے میں مافی الضمیر بھی عیاں ہو جائے اور ایک جیسی باتوں کی تکرار بھی نہ ہو۔

سول سروس کے افسروں سے خطاب کے لیے قدرت اللہ شہاب نے جو مضمون

"انقلاب کے دس مہینے" کے عنوان سے لکھا تھا۔ اُس کے شروع میں اُنھوں نے واضح کر دیا کہ چونکہ یہ ایک قسم کی نجی گپ شپ ہے More or less in the way of a family Chat اِس لیے میں جو کچھ بھی کہوں گا بالکل صاف دلی اور پورے خلوص سے کہوں گا۔ مضمون کے صفحہ نمبر ۱۲ پر لکھتے ہیں:

" خدا کے لیے یہ گمان نہ کریں کہ میں جذبات کی رو میں بہہ رہا ہوں مجھے معلوم ہے کہ گزشتہ دس مہینوں کے دوران پوری قوم شدید قسم کے ذہنی بحران میں مبتلا رہی ہے۔ تاہم یہ باعثِ اطمینان ہے کہ انقلابی حکومت نے جس خلوص اور لگن سے اصلاحِ احوال کی ابتدا کی ہے اُس سے ایک واضح سمت کی نشان دہی ہو جاتی ہے۔ یہاں میں انقلاب کے لیڈر جنرل محمد ایوب خاں کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔ مجھے احساس ہے کہ میری سچائی پر کچھ لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے کیونکہ میں جنرل ایوب خاں کے ذاتی سٹاف کا ایک ممبر ہوں اور میں اُن لوگوں کو یقین دلانے سے قاصر ہوں تاہم میں اس قدر اعتراف کر لینے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتا کہ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے بعد اگر مجھے کوئی شخص ایسا نظر آیا کہ جس کے سامنے میں خود کو چھوٹا محسوس کرتا ہوں تو لاریب وُہ جنرل محمد ایوب خاں ہیں۔

"گزشتہ پانچ برسوں میں جو میں نے ایوانِ صدر میں گزارے ہیں میں نے تقریباً آدھی درجن سے زیادہ حکومتوں کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ کچھ حضرات جو بامِ اقتدار تک پہنچ پائے حقیقتاً لائق اور منجھے ہوئے تھے۔ جبکہ کچھ حضرات ہماری سیاسی تاریخ کے جانے پہچانے لوگوں میں سے تھے۔ مگر سب مسائل کو حل کرنے میں بُری طرح ناکام رہے۔ اقتدار کی خاطر اُن لوگوں نے جیسے جیسے گھٹیا ہتھکنڈے استعمال کیے اُنھیں یاد کر کے دُکھ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جنرل ایوب خاں نے ہمہ مقتدر ہونے کے باوجود اعلیٰ ظرفی اور تدبّر کا مظاہرہ کیا ہے۔ بنیادی مسائل کے صحیح ادراک

کی صلاحیت اور حوصلہ، یقینِ محکم، عمل پیہم، عزم و ہمت، قوتِ فیصلہ، خلوص اور لگن دوسروں میں پوشیدہ جوہر کا کھلا اعتراف اور اُن کی ہمت افزائی، بلاشبہ یہ وُہ خصوصیات ہیں جو صرف ایک عظیم انسان ہی میں یکجا ہو سکتی ہیں۔ جس نیک نیتی اور احسن طریقے سے جنرل ایوب خاں ملک کو آئینی اور دستوری سمت کی طرف لے جا رہے ہیں، ایک ایسے آئین کی طرف جو ہماری معاشی، معاشرتی اور اخلاقی بنیادوں کو مستحکم کرے۔ وُہ پورے حق دار ہیں کہ ہم اُن کی کامیابی کے لیے دُعا کرتے رہیں۔"

اپنے مضمون جسے اُنھوں نے کوئی عنوان نہیں دیا تھا اور جو سارا ایوب خاں کے بارے میں ہے، قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں کہ ایوب خاں ہمیشہ اپنی ذات سے بلند ہو کر غور و فکر کرنے کے عادی ہیں کیونکہ اُنھیں اِس بات کا یقین ہے کہ آج کے بعد ایک کل بھی آتا ہے جب وُہ خود نہیں ہوں گے ملک ہو گا۔ اُن کے مدِ نظر اپنی ذات نہیں بلکہ ملک اور قوم کا مستقبل ہوتا ہے۔ آگے چل کر صفحہ نمبر ۲ پر لکھتے ہیں:

"اکتوبر ۱۹۵۴ء میں مرحوم غلام محمد نے جب یہ محسوس کیا کہ ملکی مشینری صحیح سمت نہیں چل رہی تو اُس نے اُسے درست کرنے کی خاطر پرزے پرزے کر دیا مگر ایک ناتجربہ کار مستری کی مانند وُہ اُن پُرزوں کو دوبارہ جوڑنے سے قاصر رہا۔ گھبراہٹ کے عالم میں اُس نے ملک میں مارشل لا نافذ کر کے اقتدار بری فوج کے کمانڈر انچیف کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُن دنوں اقتدار کی خاطر ضمیر فروشی معمولی بات ہوتی تھی مگر کمانڈر انچیف اقتدار کا بھوکا نہیں تھا۔ بغیر توقف کے مگر شد و مد کے ساتھ اُس نے اقتدار کی پیش کش ٹھکرا دی۔"

اکتوبر ۱۹۵۴ء اور اکتوبر ۱۹۵۸ء کے درمیان چار برس کا عرصہ ہے۔ اس دوران شیطان اور گہرے سمندر میں سے کسی ایک کے انتخاب کا موقع بھی ضائع ہو چکا تھا اور ملک دونوں بلاؤں کا شکار تھا۔ سوال

پیدا ہوتا ہے کہ جنرل ایوب جس نے ایک اکتوبر میں اقتدار کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا دوسری اکتوبر میں اقتدار پر قبضہ کرنا کیوں قبول کر لیا۔ اس اہم سوال کا جواب گزشتہ ساڑھے پندرہ مہینوں میں رونما ہونیوالے واقعات سے باآسانی مل جاتا ہے۔

غالباً یہ نومبر ۱۹۵۸ء کا ذکر ہے کہ جناب صدر نے ایک اہم تقریر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک تجربہ کار سیکرٹری کی طرح میں نے متن تیار کر کے دے دیا۔ اس متن میں لفاظی زیادہ تھی اور مطلب کم جس طرح کہ عام طور پر سربراہانِ مملکت لوگوں کو خوش کرنے کے لیے تقریریں کیا کرتے ہیں۔ یہ کام میں پانچ سالوں سے مسلسل بڑی خوش اسلوبی سے کرتا آ رہا تھا۔ مگر اس مرتبہ میرے سامنے ایک مختلف قسم کا سربراہ تھا۔ ایوب خاں نے متن پڑھنے کے بعد سر کی جنبش سے مجھے دادِ تحسین دی اور پھر بڑے دھیمے لہجے میں کہا کر دو ایک باتوں کا مزید اضافہ فرما دیں۔ میں نے کاغذ کا ٹکڑا لیا مگر جسے اُنھوں نے دو ایک باتیں کہا تھا وُہ ختم ہونے میں نہ آئیں اور پوری تقریر کو از سرِ نو لکھ کر دم لیا۔ اُن کے مُنہ سے الفاظ اور فقرے نہایت عمدگی اور روانی سے یوں نکل رہے تھے جیسے چشمہ سے اُبلتا ہوا صاف اور شفّاف پانی۔"

"اپنے الفاظ کو خوبصورت الفاظ کے قالب میں ڈھالنا بے شک قدرت کی طرف سے ایک عطیہ ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا مگر جو چیز بہُت کمیاب ہے وُہ صاف سُتھری سوچ، حالات کا صحیح ادراک اور صحیح لائحہ عمل کا تعین کرنا ہے جو صرف اسے عطا ہوتا ہے جس کا دل ایمان کی روشنی سے منوّر ہو۔"

فروری ۱۹۶۱ء میں قدرت اللہ شہاب نے ایوب خاں کے نام جس خط میں سول سروس چھوڑنے کی اجازت طلب کی تھی اُس کا تھوڑا سا حوالہ گزشتہ باب میں سکندر مرزا

کے تذکرے کے ساتھ دیا جا چکا ہے جہاں اُنھوں نے ایوب خاں کے ماتحت سروس کو اپنے کیریر کا حسین ترین عرصہ قرار دیا ہے۔ اس خط کے پیراگراف نمبر ۱۲ کا اُردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

"میں سول سروس سے جناب پریزیڈنٹ صاحب کی مکمل خوشنودی Full Blessings کے ساتھ علیحدہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ گزشتہ ڈیڑھ برس جو میں نے آپ کی خدمت میں گزارے ہیں یہ میری ساری سروس کا حاصل ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ نے مُلک میں ایک نئے دَور کا آغاز کیا ہے اور ہم سب کے لیے لازم ہے کہ اپنا کردار بہترین طور پر ادا کرنے کی کوشش کریں یہی سوچ کر میں سروس سے علیحدہ ہو کر اپنا اصلی فریضہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا کام آپ کے فلسفہ کی، جس طرح کہ میں سمجھ سکا ہوں، مزید تشریح اور وضاحت کرنا ہوگا۔ سول سروس میں رہتے ہوئے میں صرف دفتری فائل شروع کر سکتا ہوں، باہر جا کر میں آپ کے فلسفہ اور خیالات کو بنیاد بنا کر کتابیں لکھنا اور لیکچر دینا شروع کر سکوں گا۔ ۔ ۔ ۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ آپ مجھے فوری طور پر فارغ کر دیں بلکہ سروس سے فارغ ہونے کے وقت کو آپ کے فیصلہ پر چھوڑتا ہوں۔"

"ایوانِ صدر میں میرا آخری دن" کے مضمون کا مسوّدہ آٹھ فل سکیپ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع کے صفحات غلام محمد اور سکندر مرزا سے متعلق ہیں جن کا ذکر پہلے ابواب میں آچکا ہے۔ ایوب خاں کے بارے میں بیشتر باتیں وہی ہیں جو بغیر عنوان کے مضمون میں آچکی ہیں اور جن کا ترجمہ ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ البتہ آخیر میں شہاب صاحب رقم طراز ہیں:

"ایوب خاں جیسے سربراہِ مملکت کے ساتھ کام کرنا میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا اور میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ عرصہ میری اپنی تعلیم کی تجدید کے لیے بہت مفید ذریعہ ثابت ہوا۔ میں نے صدر ایوب سے بے شمار سبق سیکھے مثلاً:

نمبر۱: دماغ کو کبھی کبھی استعمال کرنے کی بجائے مسلسل کرتے رہنا چاہیے۔ اللہ کی طرف سے عطا کردہ انسانی جسم کا اہم ترین عضو دماغ ہی تو ہے جسے استعمال کرنے میں لوگ اکثر کنجوسی کر جاتے ہیں۔

نمبر۲: دُوسرے شخص کی پیٹھ پیچھے ایسی کوئی بات نہ کہی جائے جو اُس کی موجودگی میں نہ کہی جا سکتی ہو۔

نمبر۳: خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں نہ رہو اگر اس دوران خوب سے بھی محروم ہو جانے کا امکان ہو۔ تصوّراتی دُنیا کو حقیقی دُنیا سے علیحدہ نہ سمجھنا چاہیئے۔

نمبر۴: سفارش کا دُوسرا نام اقربا پروری ہے اور یہ جرم ہے بالخصوص اگر کسی دُوسرے حق دار کو اُس کے جائز حق سے محروم رکھنے کا باعث بنے۔

نمبر۵: پسند اور ناپسند انسانی فطرت کا خاصہ ہیں۔ پسند کی بنیاد دانشمندی اور خلوص پر ہو مگر ناپسند کو بھی ناقابلِ اصلاح نہ سمجھنا چاہیئے۔

نمبر۶: تجزیہ بے خوف اور بے لاگ ہونا چاہیئے۔ ذاتی پسند یا ناپسند، دوستی یا ایسی کوئی دُوسری چیز درمیان میں حائل نہیں ہونی چاہیئے۔

نمبر۷: کام، کام، کام ——— اور کام۔

نمبر۸: حرکت میں برکت ہے۔ جمود انسان کی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیتا ہے۔

نمبر۹: خوفِ خدا اور ایمانِ کامل حکمت کا سرچشمہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان والے لوگ کسی حالت میں بھی ہمت نہیں ہارتے۔

قدرت اللہ شہاب مضمون کو ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ صداقتیں میں صرف کتابوں میں پڑھا کرتا تھا۔ میرے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ حکومتی سطح پر بھی ایک ایسے شخص کو بھی ان پر عمل پیرا دیکھا جو ہمہ مقتدر ہونے کے سبب ان اقدار سے صرفِ نظر بھی کر سکتا تھا۔"

"اب جب کہ میں آٹھ برس کے بعد ایوانِ صدر سے رُخصت ہونے والا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ایسی دانش گاہ سے جا رہا ہوں جہاں میں نے پہلے چار برسوں میں یہ سیکھا کہ حکومت کرنے کا غلط طریقہ کیا ہے اور بعد کے چار برسوں میں یہ سیکھا کہ حکومت کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔"
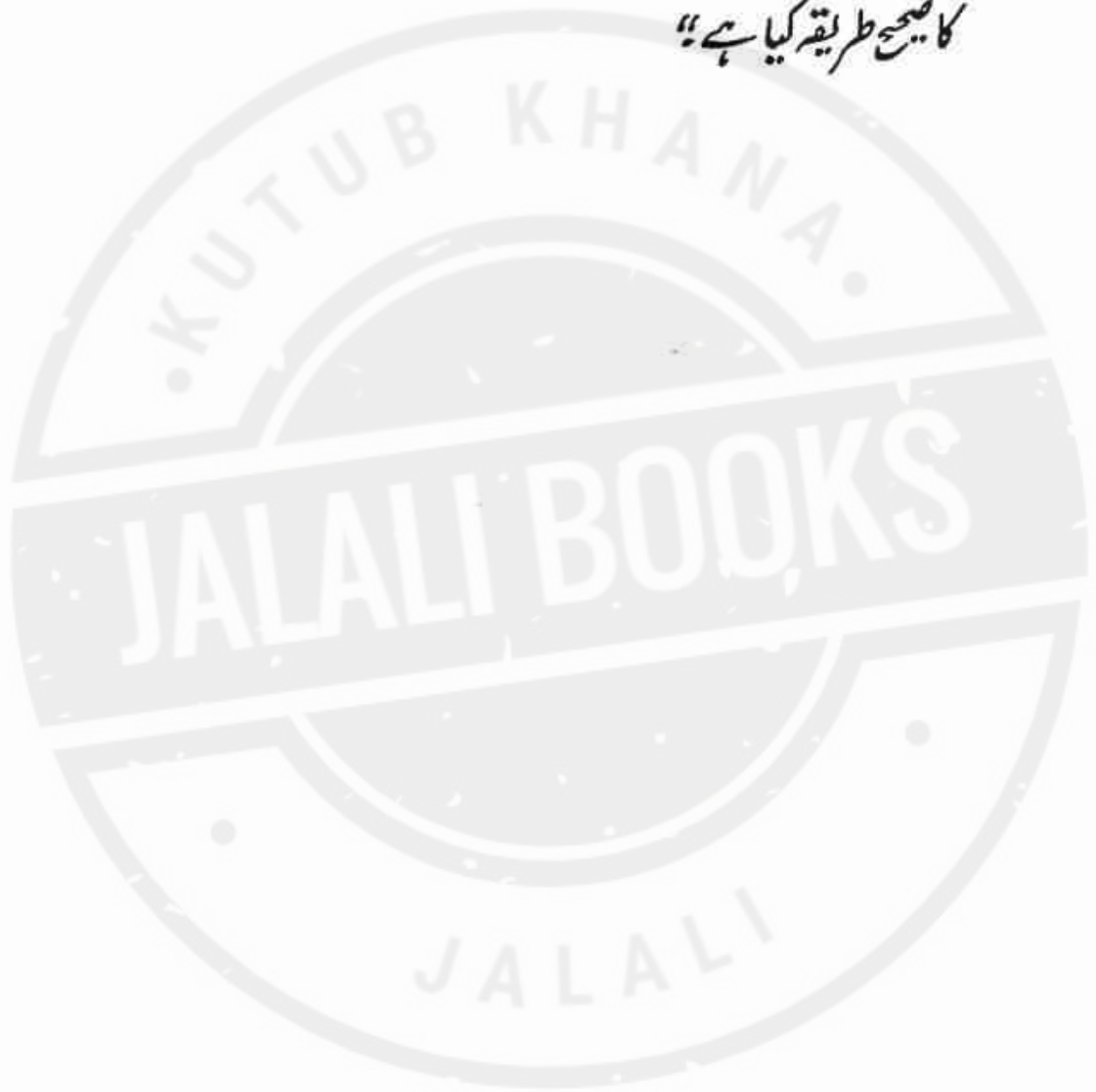
suicide; but do not let dislikes become irrevocable

Sixthly, objectivity should be fearless and unsparing. Let no personal feelings, friendships, hopes or frustrations cloud it.

Seventhly, work, work, work — always work.

Eighthly, Move, move, move — always move. ~~Movement is the essence of life~~ Static minds and bodies start vegetating.

Ninthly, fear God. Have Faith. Islam is a religion which goes into ones bones. That is why men of real faith remained steadfast even when they were flayed alive.

And so on and so forth.

These are simple truths of life. But I knew them only vaguely from books and scholars. It was indeed a rare privilege to watch them in practical operation at a level of statecraft where the man at the helm of affairs can always afford not to abide by them particularly when his powers are ~~undisputed and~~ absolute and undisputed.

So when, after about eight years, I left the President's House yesterday, it felt like leaving the portals of a ~~University of life laboratory of experience which makes life straight and~~ ~~college~~ University in which the first half of the term was spent in watching how a country should not be run and the second half in observing how it should be.

PRESIDENT'S HOUSE

analysing the political maladies and remedies of Pakistan. I still recall that he had gone to the Radio the same evening and read it out to the nation. Most of what has been achieved directly or indirectly in the last 3 years flows from the principles and philosophies enunciated in that document.

This type of a working head of the State was quite a novelty for me — and I must say that it has proved to be a valuable means of my own re-education.

One lesson I have learnt is that one must use one's head constantly and ceaselessly, and not spasmodically. As the President often puts it, human head is the most important equipment provided by God but man assiduously shirks to make full use of it.

Secondly, you must not say anything about anybody in his absence if you cannot repeat it in his presence.

Thirdly, do not run too much after the best if you are likely to lose the good in the process. Idealism should be progressed alongside realism.

Fourthly, patronage becomes nepotism if it is undeserved and a crime if it is at the cost of others.

Fifthly, likes and dislikes are a part of human nature. Let likes be ... and

قدرت اللہ شہاب کے مضمون
Last Day in President's House
کے آخری دو صفحات جن میں
انہوں نے فیلڈ مارشل ایوب خان
کے بارے میں اپنے تاثرات
رقم کئے ہیں

مشرقی پاکستان پر ایک رپورٹ

قدرت اللہ شہاب تک ہر اُس شخص کی رسائی ممکن تھی جو اُن سے ملنے کا خواہشمند ہوتا تھا۔ صدر کے سیکرٹری ہونے کے علاوہ وُہ ایک ادیب بھی تھے اور اپنی ادبی تخلیقات کے لیے خام مال کی دستیابی کے منتظر رہا کرتے۔ رائٹرز گلڈ کی وجہ سے ملک بھر کے ادیبوں اور دانشوروں سے اُن کا رابطہ رہتا تھا۔ اپنے دُوسرے ہم عصر افسروں کی طرح وُہ بول چال کے دھنی Conversationalist نہ بن سکے البتہ دُوسروں کی سُننے میں لُطف اُٹھاتے۔ اپنے اندر کا اُبال صرف قلم کے ذریعے خارج کر سکتے تھے۔ زبان کے استعمال میں اناڑی تھے۔

صدر ایوب خاں نے جنوری ۱۹۵۹ء میں مشرقی پاکستان کا تفصیلی دَورہ کیا۔ قدرت اللہ شہاب ہمراہ تھے۔ کراچی واپس آکر اُنھوں نے وہاں کے حالات پر ایک رپورٹ لکھی۔ اُس وقت مشرقی پاکستان میں چیف سیکرٹری کا عہدہ ایم اظفر کے پاس تھا جو بہاری تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند اور شہاب صاحب کے دوستوں میں سے تھے۔ یہ گویا اِن دونوں کی مشترکہ رپورٹ تھی کیونکہ اظفر یہ باتیں خود نہ لکھ سکتے تھے اس لیے رپورٹ شہاب صاحب سے لکھوائی۔ اتمام حجت کے طور پر شہاب صاحب نے اسی رپورٹ کے ساتھ مغربی پاکستان پر بھی مختصراً لکھا اور آخر میں صدر صاحب کی خدمت میں نئے آئین کے بارے میں چند تجاویز پیش کیں۔

اگلے سال یعنی ۱۹۶۰ء میں ایک بار پھر مشرقی پاکستان پر شہاب صاحب نے رپورٹ تحریر کی۔ اس رپورٹ میں گورنر ذاکر حسین اور جنرل آفیسر کمانڈنگ جنرل امراؤ خاں کے درمیان عدم اعتماد اور عدم تعاون کا ذکر تھا۔ چونکہ اس رپورٹ

ہیں گورنر ذاکر حسین کی بدعنوانیوں کے حوالے بھی تھے اس لیے رپورٹ پر لکھ دیا گیا تھا کہ یہ صرف صدر صاحب کے مطالعہ کے لیے ہے۔

اگرچہ پہلی رپورٹ پڑھنے کے بعد صدر ایوب خاں نے حاشیے میں تحریر فرمایا تھا

This is a correct situation report
Thank you for producing it

تاہم دُوسری رپورٹ پڑھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ صدر صاحب نے پہلی رپورٹ پر کوئی کارروائی نہیں کی اور حالات جوں کے توں بلکہ پہلے سے خراب تر ہو چکے ہیں۔

۱۹۵۹ء میں لکھی گئی رپورٹ کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے :

"حضرت قائداعظمؒ کی وفات کے بعد پہلی بار مشرقی پاکستان میں ایک عام آدمی اپنی مرضی سے سانس لینے لگا ہے۔ وُہ زہر جو سیاست دان ایک عرصہ تک اُس کے کانوں میں گھولتے رہے تھے اپنا اثر کھو رہا ہے۔ اگر اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وُہ حبُ الوطنی کے اُسی جذبے سے سرشار ہو گا جو ایک سچے پاکستانی میں ہونا چاہیئے۔

دس برسوں میں یہ پہلا موقع ہے کہ ڈھاکہ اور دُوسرے شہروں میں یومِ قائداعظمؒ پورے جوش و جذبہ سے منایا گیا۔

اس دفعہ ۲۵ دسمبر کو صدر کی ریڈیو پر تقریر سُننے کے لیے ڈھاکہ کے گلی کوچوں میں مجمع نظر آیا۔ جو انتظامیہ کا پیدا کردہ نہیں تھا بلکہ خود بخود اُبھرا تھا۔ لوگوں نے بے خود ہو کر جذباتی نعرے لگائے اور اُس وقت بے قابو ہو کر آب دیدہ ہو گئے جب صدر صاحب نے مسئلہ کشمیر اور نہری پانی کے تنازعہ کا ذکر کیا۔ یہ منظر اس وجہ سے اور بھی قابلِ دید تھا کیونکہ ایک عام مشرقی پاکستانی براہِ راست اِن دو مسائل کی زد میں نہیں آتا۔ اسی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان سے اُس کی وابستگی گہری اور جذباتی ہے بشرطیکہ اُسے منفی پراپیگنڈے سے آلودہ نہ ہونے دیا جائے۔

مارشل لاء کے آغاز میں مشرقی پاکستان کے باشندوں کو وسواس تھا کہ مارشل لاء کے پردے میں مغربی پاکستان پر مشتمل فوج کی اکثریت ایک فاتح فوج کا کردار ادا

کرے گی۔ تاہم فوج کے رویے نے اُن کے خدشات کو باطل[1] اور بے بنیاد کر دکھایا ہے بلکہ اب مشرقی پاکستان میں عام شکایت ہے کہ فوجی دستوں نے بیرکوں میں واپس جانے میں جلدی کیوں کی۔ جنرل امراؤ خاں ایک دل کش اور خوش طبع رہنما Genile Patriarch کے رُوپ میں اُبھرے ہیں۔ بنگالیوں میں آج کل مزاح کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان پر تین اشخاص حکومت کر رہے ہیں۔ ایک اُمراؤ خاں، دُوسرا اظفر[2] اور تیسرا[3] ذاکر حسین جن میں صرف امراؤ خاں بنگالی ہے۔

بدقسمتی سے گورنر کی شہرت خراب ہے۔ بنگالی ہوتے ہوئے اُن کے دروازے سب کے لیے یکساں کھلے ہوتے چاہئیں بالخصوص مقامی صحافیوں کے لیے۔ اُن کے متعلق سنگین نوعیت کے الزامات سُننے میں آئے۔ مثال کے طور پر چٹاگانگ میں اِس قسم کی گفتگو عام ہے:

"ذاکر حسین کے اپنے ذاتی مکان کے لیے نہ کوئی اپروچ روڈ تھی اور نہ بجلی مہیا تھی۔ چٹاگانگ میں صدر ایوب کو اپنے مکان میں ٹھہرانے کے بہانے اُس نے پی ڈبلیو ڈی سے سرکاری خرچ پر سڑک بنوائی، ریلوے حکام کو مجبور کیا کہ بجلی مہیا کریں، سرکاری اداروں سے آس پاس کا جنگل صاف کروایا، گھر میں رنگ در وغن اور کئی قسم کے قیمتی الیکٹرک آلات نصب کروا لیے۔ صدر ایوب کو سرکٹ ہاؤس میں قیام کرنا چاہیے تھا نہ کہ ذاکر حسین کے ذاتی مکان میں۔"

میں نے چند ایک مقامی افسروں سے کہا کہ اِن افواہوں کا سدِباب کریں مگر وُہ کندھے جھٹک کر کہتے کہ کونسا جھوٹ ہے۔ اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو بدعنوانی کا ہدف ذاکر حسین کی بجائے صدر صاحب کی اپنی ذات بھی ہو سکتی ہے۔ ایک معمولی دکاندار نے جو چٹائیاں بیچتا ہے مجھے بلا جھجک بتایا:

---

[1] جنرل افیسر کمانڈنگ — مغربی پاکستانی
[2] چیف سیکرٹری — بہاری
[3] گورنر — بنگالی، سابق آئی جی پولیس

"ہمارے نزدیک پینورا[1] ما ایک غلیظ اور ناپاک مکان ہے آپ مہربانی کر کے صدر ایوب کو بتا دیں کہ اُن کے قیام کرنے سے اُس مکان کی نوعیت بدل نہ جائے گی بلکہ صدر صاحب خود ناپاک ہو گئے ہیں۔ یہاں ٹھہرنے کے لیے خوب صورت سرکٹ ہاؤس موجود ہے۔"

اِس ناخوشگوار موضوع کو میں نے اِس لیے ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے کہ یہ ہر سطح کے لوگوں کی زبان پر ہے۔

ہندو:

سمگلنگ اور ذخیرہ اندوزی کا دھندہ چونکہ تیزی سے ختم ہوتا دکھائی دینے لگا ہے اس لیے ہندو کاروباری طبقے پر مردنی چھانے لگی ہے۔ اگرچہ وُہ تذبذب کا شکار ہے تاہم وُہ سمجھتا ہے کہ اب یہ فیصلہ کرنے کا وقت آگیا ہے کہ باڑ کی کس طرف چھلانگ لگانی ہو گی۔ چٹاگانگ میں ہندوؤں کی خاصی تعداد ہے پھر بھی صدر پاکستان کے پبلک جلسے میں اُن کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ مقامی انتظامیہ کے مطابق یہ بلا وجہ نہیں تھا۔

سیاسی لیڈر: سیاستدان سو نہیں گئے اور نہ ہی غافل ہوئے ہیں۔ اُن کی خاموشی نفرت آمیز تمسخر کی آئینہ دار ہے۔ وُہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ شاید کوئی "اچھی" صورت پیدا ہو جائے۔ اقتدار کے خاتمے اور محاسبے کے خوف نے اُنھیں وقتی طور پر مبہوت کر دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اُنھیں محاسبے کے عمل میں مصروف رکھا جائے ورنہ وُہ منفی رجحانات پیدا کرنے کی پھر سے ہر ممکن کوشش کرنا شروع کر دیں گے۔ چشم پوشی یا درگزر کی پالیسی اُن کے عزائم کے لیے تقویت کا باعث ہو گی۔ عوام منتظر ہیں کہ سیاسی جرائم کے مرتکب افراد قرار واقعی سزا پائیں۔ اگر پرانے لیڈروں میں سے دو چار کو تختۂ دار پر لٹکا بھی دیا جائے تو کہیں بھی کوئی کتا نہ بھونکے گا۔ اگر خاموشی سے وقت گزر گیا تو یقیناً پرانے پاپی شرارتی عنصر کو اپنے گرد جمع کر لیں گے۔

---

[1] پینوراما۔ گورنر ذاکر حسین کا ذاتی مکان۔

عام تاثر یہی ہے کہ اُن کے خلاف تادیبی کارروائی انتہائی ناکافی ہے اور سیاستدانوں کے کردار کی گھناؤنی تصویر محض انقلاب کے جواز کی خاطر پیش کی جا رہی ہے۔

طلباء ڈھاکہ طلباء میں ابھی سخت جان کیمونسٹ عنصر موجود ہے۔ وہ اور اُن کے ساتھ مل کر کچھ اساتذہ بھارت کی دی ہوئی ڈفلی بجا رہے ہیں کہ پاکستان میں کھلی فوجی ڈکٹیٹر شپ قائم ہو گئی ہے۔ خوش قسمتی سے موجودہ وائس چانسلر مسٹر جسٹس حمود الرحمٰن ایک محب وطن دانش ور ہیں اور اُنھیں عزت و احترام حاصل ہے۔ انھوں نے یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں یونین کے انتخابات کے دوران مثبت حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے کیمونسٹ عنصر کے لیے ہزیمت کا سامان پیدا کیا ہے۔ اسی لیے اب اُس عناصر نے یہ خفیہ مہم شروع کر دی ہے کہ جسٹس حمود الرحمٰن چونکہ شستہ اُردو بول سکتے ہیں اس لیے وہ بنگالی نہیں ہیں۔ ڈھاکہ میں ہر وہ شخص جو تخریبی عناصر کا ساتھ نہ دے اُس پر غیر بنگالی یعنی مغربی پاکستانی کا لیبل چپاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم وائس چانسلر اسی طرح دانش مندی سے کام لیتے رہے تو یقیناً وہ یونیورسٹی کو صحیح سمت کی طرف لے جانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

پریس: ڈھاکہ پریس نے بلاشبہ اپنی وہی پرانی روش اختیار کر لی ہے۔ کچھ اخبارات مثال کے طور پر روزنامہ اتفاق نے وسائل و مراعات کی تقسیم میں مشرقی پاکستان کے ساتھ فرضی ناانصافیوں کا ڈھول پیٹنا شروع کر دیا ہے۔ صوبائی حکومت پریس کے معاملے میں چشم پوشی کی پالیسی پر گامزن نظر آتی ہے۔ اگر پریس کی آزادی کے سلوگن کے پس پردہ تخریبی عناصر کو کھلی چھٹی ملی رہی تو بعد میں تعمیری یا تادیبی کارروائی دشوار ہو سکتی ہے۔ کرنل مجید[1] ملک نے جی او سی اور چیف سیکرٹری سے اس سلسلے میں بات چیت کی ہے اور معاملہ اب اُن کے زیر غور ہے۔

اگر سیاستدانوں یا طلباء نے کسی وقت دوبارہ سر اُٹھایا تو مقامی پریس اُن کیلئے

---

[1] کرنل مجید ملک۔ پرنسپل انفارمیشن آفیسر حکومت پاکستان۔

پہلے سے زمین ہموار کر چکا ہو گا۔ پریس کو نئے حالات میں اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے احساس دلانے کا شاید پھر موقع نہ مل سکے۔

سول ملازمین: بنگالی ملازمین کو خدشہ ہے کہ نئی حکومت ترقی کے اُن مواقع سے محروم کر دے گی جو .parity یا کوٹہ سسٹم کے تحت اُنھیں حاصل ہیں اور مغربی پاکستان کے افسران کو اُن پر مسلط کر دیا جائے گا۔

اُن بنگالی ملازمین کی اکثریت پر گھبراہٹ طاری ہے جنھوں کے سیاستدانوں کے دَور میں ناجائز فائدے اُٹھائے تھے اُنھیں کوئی ایسا سینئر بنگالی افسر دکھائی نہیں آتا کہ جس کے ساتھ کھل کر اپنے دل کا حال بیان کر سکیں۔ وُہ جی او سی اور چیف سیکرٹری کو پسند تو ضرور کرتے ہیں مگر اُن کے ساتھ کھل نہیں سکتے جس طرح کہ کسی بنگالی کے ساتھ بغیر جھجک کے بات کر لیتے ہیں۔

گورنر کو البتہ بنگالی یا غیر بنگالی کوئی پسند نہیں کرتا۔ عام شکایت یہ ہے کہ اُن تک رسائی صرف پولیس افسر یا اہلکاروں کی ہے اور وُہ اُنھی کے زیرِ اثر ہے۔ ضلع اور سب ڈویژن کی سطح پر نچلے درجے کے پولیس افسر بڑ ہانکنے اور رلاف زنی میں مصروف ہیں اور گورنر سے براہِ راست راہ و ربط کا دعویٰ کر کے مجسٹریٹوں ڈپٹی کلکٹروں اور دوسرے سول افسروں کو ہراساں اور اُن کی توہین و تذلیل کرتے ہیں۔ مختلف درجوں کے بنگالی افسروں نے مجھے بتایا:

> اگر یہی مارشل لاء ہے تو ہمیں منظور ہے لیکن فوج کے واپس جانے سے پہلے ہمارا اعتماد اور وقار بحال کیا جائے۔ آپ نے ہم پر پولیس راج قائم کر رکھا ہے جو ہمیں بالکل پسند نہیں۔

جہاں تک بنگالی کلرکوں اور دوسرے عملے کا تعلق ہے تو اُن کا رویہ سیاستدانوں، پریس اور طلباء کے رویّے کے مطابق ہو گا۔

ادیب: افسوس کا مقام ہے کہ سیاسی اعتبار سے ترقی یافتہ بنگال میں ادیب سیم و زر کے لالچ میں مبتلا ہیں۔ ہاں اگر ہم اُنھیں وہی کچھ مہیا کر دیں جو اُنھیں کلکتہ یا

کیمونسٹ عناصر سے مل رہا ہے تو اُن کے رویّے میں یقیناً تبدیلی آسکتی ہے۔ ذاتی طور پر مجھے یہ محسوس کر کے صدمہ ہوا کہ وہاں کثیر تعداد میں ادیب تو ہیں مگر اُن کا کوئی نصب العین نہیں ہے۔ تاہم انھوں نے من حیث الجماعت کراچی میں ہونے والی پاکستان رائٹرز گلڈ کی مجوزہ کنونشن کی حمایت کی ہے۔

مغربی پاکستان

اکتوبر ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بارے میں پبلک کا جوش و خروش ابھی کافی حد تک موجود ہے البتہ لوگوں میں اس قسم کے اقدام پر ناخوشی کا اظہار ہوتا ہے۔

- فوج کو بیرکوں میں واپس بھیج دینے میں عجلت سے کام کیوں لیا گیا ہے۔
- بدعنوان سیاستدانوں، تاجروں اور افسروں کو کوئی سزا نہیں دی گئی۔ کیوں؟
- مارشل لا قوانین کے تحت ایک کو بھی پھانسی کی سزا نہیں دی گئی۔

اس قسم کے مطالبات بے معنی نہیں ہیں۔ دراصل عوام اپنے اس یقین کو پختہ کرنا چاہتے ہیں کہ ملک میں نئے دَور کا آغاز ہو چکا ہے۔

دکاندار طبقہ: قیمتوں پر کنٹرول کے نفاذ کا پہلا ہدف صرف اور صرف چھوٹے یا درمیانہ درجے کے تاجر بنے ہیں اور انھیں ہی نقصان ہوا ہے۔ انھیں تب تسلی ہو گی جب بڑے بڑے تاجر اور صنعت کار بھی نقصان میں برابر کے شریک ہوں۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا وہ محسوس کرتے رہیں گے کہ مارشل لاء ادھورا رہا۔ اُن کی دوسری پریشانی یہ ہے کہ فوری طور پر اور سستے داموں بک جانے والی اشیا کی جگہ نیا مال کس طرح اور کہاں سے حاصل کریں۔

بڑے تاجر: بڑے بڑے تاجر اپنے اپنے گوشواروں کی تیاری میں مصروف ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں کہ نئی حکومت اُن کے یومِ حساب سے پہلے ہی ختم ہو جائے۔ روحانی پنڈت، جوتشی اور پیش گوئیاں کرنے والوں کا کاروبار زوروں پر ہے بالخصوص کراچی اور لاہور میں بڑے تاجر اور صنعت کار ہی ان لوگوں کے سرپرست اور

پرورش کا ذریعہ ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ہاں کا دولت مند طبقہ کس قدر شاطر ہے اور انھیں اپنی ذات اور خدا پر کتنا ایمان ہے۔

بڑے زمیندار: یہ لوگ بھی کسی معجزے کے منتظر ہیں۔ اِن میں خود مزاحمت کی قوت تو نہیں لیکن دُوسروں کو آگے کرنے اور اُن کی مالی مدد کرنے کو ہر وقت تیار ہیں۔ اس وقت زرعی اصلاحات پر سب کی نظر ہے اور نئی حکومت کی یہی سب سے بڑی آزمائش ہوگی۔

سیاستدان: "انتظار کرو اور دیکھتے رہو" کی حالت میں ہیں۔

سول سرونٹس: توقع کے خلاف، کراچی اور مغربی پاکستان کے سول سرونٹس نے اپنی صفوں میں موجود انتشار پس پشت ڈال کر باہمی اتحاد کی فضا پیدا کر لی ہے جو بلا شبہ غیر طبعی ہے۔ جس طرح مشرقی پاکستان میں بنگالی افسروں کو یہ خدشہ ہے کہ اُن پر مغربی پاکستانی مسلّط ہو جائیں گے اُسی طرح مغربی پاکستانی افسروں کو یہ خوف دامن گیر ہو گیا ہے کہ اُن پر فوجی افسروں کو لا بٹھایا جائے گا۔ اسی کے سدِ باب کیلئے وُہ اپنی "ٹریڈ یونین" بنانے کے فکر میں ہیں۔ کئی سول سرونٹس (خاص طور پر لاہور میں) شیخی مارتے ہیں کہ فوجیوں کو واپس بیرکوں میں بھیج کر انھوں نے فوج کو اپنے اصل مقام پر دھکیل دیا ہے۔ سکریننگ کمیٹیوں کے قیام سے اُن کے خوف و ہراس میں اِس وجہ سے اضافہ ہوا ہے کہ وُہ ماضی میں بڑے بڑے زمینداروں، صنعت کاروں کا آلہ کار بنے رہے ہیں جب کہ وُہ طبقے بھی اپنی جگہ سہمے ہوئے ہیں کیونکہ اُن کی اپنی بقا کو خطرہ لاحق ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر کوئی کسی نہ کسی ذہنی اُلجھن میں مبتلا ہے۔ اُونچے درجے کے افسروں میں بالخصوص ایک ایسا رویہ پروان چڑھ رہا ہے جسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

> "وقت گزارو۔ جو بھی حکم ملے اُسے پوری سرعت سے بجا لاؤ۔ نئی حکومت کے ساتھ صرف اِس حد تک تعاون کرو جس قدر کہ تمھاری اپنی بقا کے لیے کافی ہو۔ اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔"

فوجی افسر: سول افسروں کا رویہ فوجی افسروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا ہے کیونکہ جس فوجی افسر کو بھی اُن سے واسطہ پڑا اُس نے محسوس کر لیا۔ قدرتی طور پر فوجی افسر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ تمام کے تمام سول افسر بے کار اور بددیانت ہیں اور اِن کی چھان پھٹک میں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ درمیانے درجے کے فوجی افسروں کا خیال ہے کہ گھٹیا اور راز کار رفتہ قسم کے سویلین افسروں نے ہمارے صاف ستھرے پریزیڈنٹ کا گھیراؤ کر رکھا ہے اور ہر پریزیڈنٹ کو چاہیئے کہ انھیں یک بینی و دو گوش دھکے دے کر باہر نکال دے۔

ادیب: مغربی پاکستان میں تقریباً ہر قسم کے ادیب و قلم کار نے رائٹرز گلڈ کے مجوزہ کنونشن کا خیر مقدم کیا ہے۔ فیض احمد فیض کی گرفتاری سے کچھ دھچکا Setback ضرور لگا ہے تاہم مجموعی طور پر کنونشن کے پُوری طرح نمائندہ ہونے کی توقع ہے۔

آئینی مستقبل

مشرقی اور مغربی پاکستان میں تقریباً سبھی دانشور ملک کے آیندہ آنے والے آئین کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ اِن میں سے اکثر اپنے اپنے طبقاتی مفاد کے پیشِ نظر مختلف نوعیت کے دلائل پیش کرتے ہیں۔ تاہم پاکستان کے دونوں بازؤں میں محبِ وطن اور مثبت سوچ رکھنے والا طبقہ اِس خیال کا حامی ہے کہ،

۱۔ ملک میں Rough and Ready Unitary قسم کا آئین ہونا چاہیئے یعنی کچھ امریکی اور مصری آئین سے ملتا جُلتا۔

۲۔ جنرل ایوب خاں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر خود کو پانچ سال کیلئے منتخب کروالیں۔

۳۔ منتخب ہونے پر وُہ پانچ سال تک فرانس کے صدر جنرل ڈیگال کی طرح مختارِ کُل ہوں۔

اہلِ نظر لوگوں کو یقین ہے کہ اگر جنرل ایوب خاں فوری طور اپنا انتخاب کروا لیں تو صد در صد ووٹ حاصل کر لیں گے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ یہ شرح متاثر ہو سکتی ہے۔

آئین کے لیے کئی فارمولے زیرِ بحث آئے ہیں مگر مندرجہ بالا فارمولہ اس وقت سب سے زیادہ قابلِ قبول سمجھا جاتا ہے۔
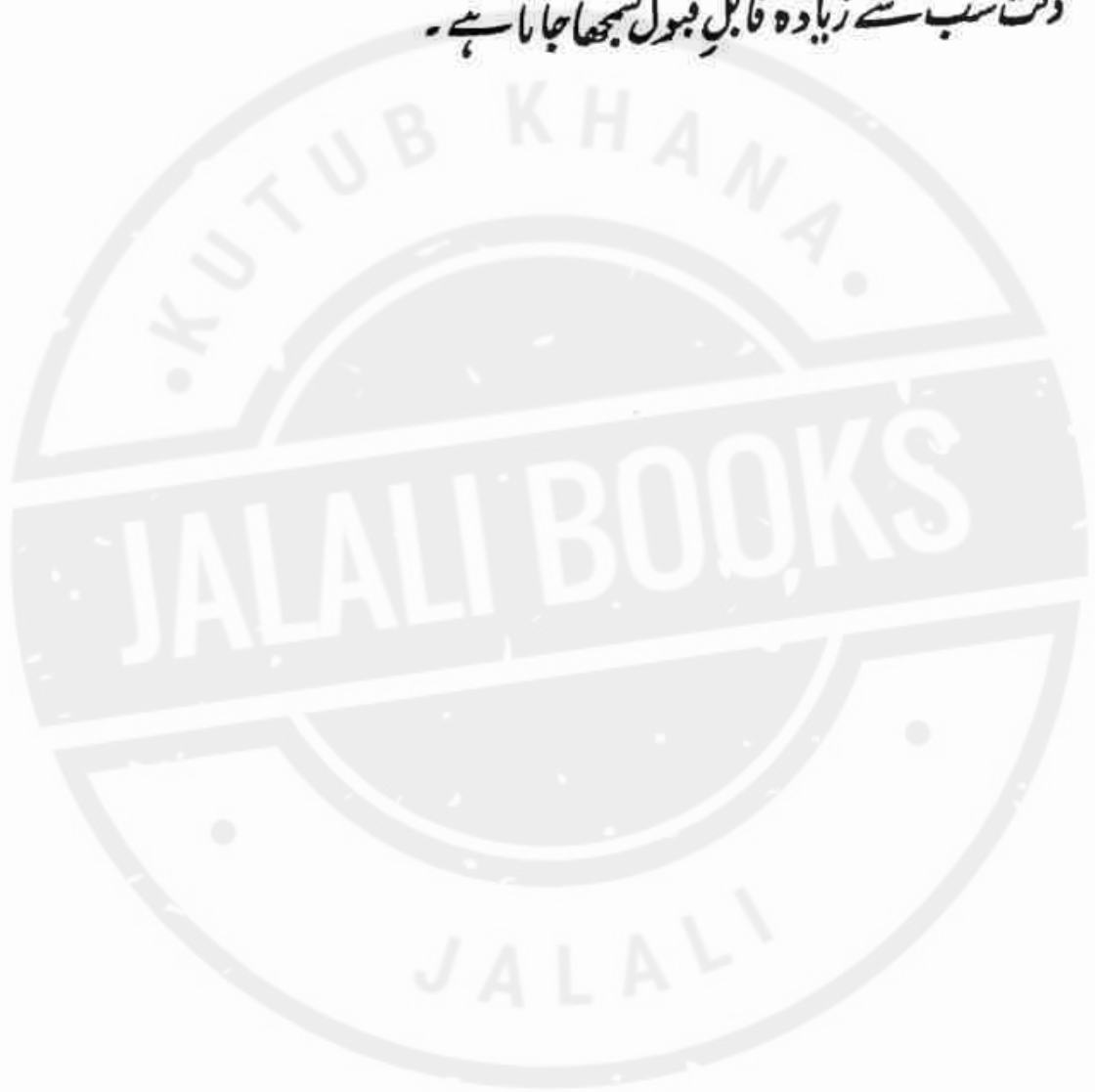
قدرت اللہ شہاب کا استعفیٰ

قدرت اللہ شہاب نے ۱۹۴۱ء میں انڈین سول سروس کی ابتدا کی اور ۱۹۷۶ء میں ساٹھ برس کی عمر کو پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ ان چھتیس برس پر محیط سروس کے دوران اُنھوں نے چار مرتبہ سول سروس سے علیحدہ ہونے کی ناکام کوشش کی۔ اُن کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ چار کے علاوہ بھی اُنھوں نے ایک آدھ بار استیعفیٰ لکھ کر جیب میں تیار رکھا مگر پیش کرنے کی نوبت نہ آئی۔ سول سروس کی تاریخ میں قدرت اللہ شہاب واحد فرد ہیں جنھوں نے استعفے پر استعفیٰ دیا مگر بقول اُن کے "سول سروس کے چوہے دان سے رہائی نہ مل سکی" اور ساٹھ سال کی طبعی عمر تک گلے میں پڑا ڈھول اُنھیں بجانا ہی پڑا۔

پہلا استعفیٰ اُنھوں نے ۱۹۴۱ء میں اُس وقت دیا جب کہ اُن کو انڈین سول سروس میں داخل ہوئے صرف آٹھ ماہ ہوئے تھے۔ دوسرا استیعفیٰ پاکستان میں سکندر مرزا کی صدارت کے دوران دیا اور تیسرا ایوب خاں کے دورِ حکومت میں۔ دوسرا اور تیسرا استیعفیٰ اِس لیے منظور نہ ہوا کہ صدرِ پاکستان اُنھیں بہت پسند کرتے تھے۔ چوتھا استیعفیٰ اُنھوں نے یحییٰ خاں کے عہد میں دیا۔ یہ اس وجہ سے نامنظور ہوا کہ صدرِ پاکستان اُنھیں بہت ناپسند کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ "بچُو بچ کے نہ جائے"۔

میرے پرانے کاغذات میں اُن کے اُس استیعفیٰ کا قلمی نسخہ موجود ہے جو اُنھوں نے صدر ایوب خان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ پریزیڈنٹ ہاؤس کے لیٹر ہیڈ پیڈ کے چھ صفحات پر مشتمل اِس استیعفے سے اُن کی شخصیت اور اُن کے عزائم کی خوب عکاسی ہوتی ہے۔ ترجمہ پیش کرتا ہوں:

"میں جناب صدر کی خدمت میں ایک ذاتی درخواست پیش کرتا ہوں۔

۲۔ پورے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سول سروس سے ریٹائرمنٹ لے لوں۔ اس کی وجہ کسی قسم کی مایوسی یا احساس محرومی نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس میں محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ بدلے ہوئے حالات میں میرے لیے اپنے من پسند کی زندگی بسر کرنا اب ممکن ہو سکے گا۔

۳۔ ۱۹۴۱ء میں جب میں نے انڈین سول سروس میں شمولیت اختیار کی تو میرا ارادہ محض بیوروکریسی کا تجربہ حاصل کرنا تھا اور اس کے لیے میں نے اپنے ذہن میں پانچ سال کا عرصہ کافی سمجھ رکھا تھا مگر پاکستان کے قیام سے میرے لیے نئے دَور کا آغاز ہُوا اور میں نے سول سروس چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں مجھے اُس وقت کے صدر کی خدمت میں اپنا استیعفیٰ پیش کرنا پڑا کیونکہ میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ میرے لیے اُن حالات میں ملازمت جاری رکھنا تو درکنار زندہ رہنا بھی ممکن نہیں۔ میں مُلک چھوڑ کر جلاوطنی کی زندگی گزارنا چاہتا تھا خواہ مجھے اپنی پنشن سے بھی محروم ہونا پڑے۔ لیکن افسوس کہ ایسا کرنے کی اجازت نہ مل سکی۔ اس کے بعد انقلاب آگیا اور یوں میرے سروس کیرئیر کا خوشگوار ترین دور شروع ہُوا جو تا حال جاری ہے۔

۴۔ مجموعی اعتبار سے سول سروس کے دوران میرے ساتھ انتہائی مہربانی کا سلوک روا رکھا گیا ہے۔ ہر قسم کی معاشرتی، سیاسی یا حسب نسب کی قوت نہ ہونے کے باوجود میں اکثر قابلِ رشک عہدوں پر فائز رہا ہوں۔ ابھی حال ہی میں میرے درجے Status اور تنخواہ میں اضافہ کیا گیا ہے۔ محض حسد کی بنا پر اکا دُکا تلخ واقعات کے سوا سول سروس کے اندر یا باہر میرے خلاف کسی کے دل میں مخاصمت پیدا نہ ہوئی۔ میرے سامنے مزید ترقی کا راستہ کھُلا ہے اور کسی بھی سول سرونٹ کے لیے اس سے بہتر سازگار حالات نہ ہوں گے جس کے لیے میں اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا ہوں لیکن اس کے باوجود ذاتی وقار اور تحفظ کی اس کیفیت سے دستبردار ہونا چاہتا ہوں کیونکہ میرے

نزدیک اچھی اور آرام دہ زندگی کے علاوہ بھی انسان کے مقاصد ہو سکتے ہیں۔

۵۔ میں اپنے طبعی رجحان کے مطابق آزاد، گمنام اور ایک عام آدمی کی مانند زندگی گزارنے کا خواہش مند ہوں۔ میری اس خواہش کے پس پردہ کوئی سیاسی معاشرتی یا مالی عنصر نہیں ہے۔

۶۔ کسی زمانے میں میری اولین تمنا یہ تھی کہ نوجوانوں میں اخلاقی اور روحانی اقدار پیدا کردوں لیکن میں نے اب محسوس کیا ہے کہ مجھ میں ایسا کرنے کی پوری صلاحیت موجود نہیں کیونکہ میں نے اپنی جوانی کے ایام نوجوانوں کے تجربات حاصل کرنے اور سمجھنے کی بجائے بے مقصد گزار دیے ہیں۔ اس کے علاوہ میں خود میں ایسی اخلاقی اور روحانی توانائی محسوس نہیں کرتا کہ دوسروں کے لیے مشعل راہ بن سکوں۔ مجھے اپنی اس کمی کا اعتراف بھی ہے اور افسوس بھی۔

۷۔ لامحالہ مجھے اپنے ثانوی مقاصد کی طرف لوٹنا پڑا ہے اور وُہ یہ ہے کہ ادبی اور کلچرل فیلڈ میں کام کروں۔ ایک اعلیٰ افسر کے رُوپ میں نہیں بلکہ ایک عام شہری کی حیثیت سے میرا سول سرونٹ ہونا ہی میرے پاؤں کی زنجیر ہے۔ تعمیری اور قومی موضوعات پر بھی میں وُہ کچھ نہیں لکھ سکتا جس کے لکھنے کی میں صلاحیت رکھتا ہوں جو کچھ بھی لکھوں گا یا کہوں گا اُس پر میرے سول سرونٹ کی چھاپ لگ سکتی ہے اور اُسے سرکاری یا اُجرت کا پراپیگنڈا کہا جائے گا۔ یہ صورت حال میرے اور میرے مشن کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ میں ثقافت اور ادب کو محض وقتی Hobby کے طور پر نہیں بلکہ پیشے کے طور پر اختیار کرنا چاہتا ہوں۔

۸۔ میرے مدِنظر ایک دُوسرا پہلو بھی ہے۔ ہمارے ملک میں رائے عامہ۔ اور جو صرف دانشور طبقے کی رائے کو سمجھا جاتا ہے۔ لکھے گئے لفظ سے بنتی یا بگڑتی ہے۔ اس ذریعہ ابلاغ کا بے دریغ غلط استعمال ہوتا رہا ہے جس کے سبب منفی روایات نے جنم لے لیا ہے۔ اگر کوئی تنقید کی غرض سے لکھنے بیٹھتا ہے تو اُس کی تحریر میں تلخی اور بعض اوقات دشنام طرازی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس کے برعکس

جب کوئی تعریف کے دو حرف لکھتا ہے تو اُس پر خوشامدی ہونے کا لیبل چسپاں ہو جاتا ہے۔ لکھنے لکھانے کا یہ فیشن جاری رہے گا کیونکہ لکھنے والے کے مزاج میں تلخی ہے یا وُہ احساسِ محرومی کا شکار ہے یا اس کی تحریر کے پسِ پردہ ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ اگر کوئی ادیب ان تین کمزوریوں سے پاک ہو تو کم از کم وُہ ابتدا تو کر سکتا ہے چاہے یہ ابتدا کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ اس وقت تعمیری اور مضبوط رائے عامہ ملک کی اہم ترین ضرورت ہے اور یہ وہ ضرورت ہے جسے کوئی حکومتی ادارہ پورا نہیں کر سکتا۔ یہ کام صرف کھلی فضا میں ہو سکتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ میں اس کام کا بیڑا اُٹھاؤں۔

۹۔ میری دیرینہ خواہش ایک اور بھی ہے۔ میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر کل وقتی کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ سیرت پر ایسی کتاب جو دلچسپ ہو، مکمل ہو اور دَورِ جدید کے اذہان کو متاثر کر سکے۔ غیر مسلم سوانح نگاروں نے اس موضوع کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے جب کہ مسلمان سوانح نگاروں کا قلم جذبات اور عقیدت کی نذر ہو گیا۔ جدید دَور کا ذہن، مسلم یا غیر مسلم، مختلف اپروچ کا متقاضی ہے۔ میں اس موضوع پر قلم اٹھانا چاہتا ہوں۔ اس کام کے لیے بہت دقیق مطالعہ اور تحقیق درکار ہے اور میں اسے اپنی زندگی کا آخری مشن بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

۱۰۔ میں نے یہ لمبا مضمون محض اِس خیال سے تحریر کیا ہے کہ یہ واضح کر سکوں کہ سول سروس سے ریٹائر ہونے کی غرض وغایت صرف وہی ہے جو میں نے اُوپر بیان کر دی۔ ایک چالیس سالہ شخص عزت اور خوش حالی کی نوکری چھوڑ کر کسی نئے کیریئر کا آغاز کرنے سے گھبراتا ہے جس میں نئے سرے سے جدوجہد اور کشمکش کا امکان ہو لیکن میرے ضمیر میں جو خلفشار برپا ہے اُس کی وجہ سے یہ تجربہ اپنی ذات پر کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اس مشن میں پوری طرح کامیاب نہ بھی ہو سکا تو بھی مجھے افسوس نہ ہوگا کیونکہ میری یہ کوشش دیانتداری پر مبنی ہوگی کہ میں اپنے لیے اور اپنے ملک کے لیے کچھ کر لوں۔

۱۱۔ اگر میں اپنے انتخاب کردہ پیشے میں خاطر خواہ انکم نہ بھی پیدا کر سکا۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ کر سکوں گا۔ میری پنشن ہمارے لیے کافی ہوگی۔ کیونکہ ہم میاں بیوی سادہ سے سادہ زندگی بھی گزار سکتے ہیں۔ میری بیوی جو ڈاکٹر ہے کام کرنے پر آمادہ ہے۔ میں نے اپنی شریکِ حیات کی مکمل رضامندی بلکہ حوصلہ افزائی پر ہی یہ انتہائی قدم اُٹھانے کا عزم کیا ہے۔

۱۲۔ اپنے اس فیصلے میں جناب صدر کی خوشنودی بھی شامل کرنا چاہتا ہوں۔ گزشتہ ڈیڑھ سال جو میں نے جناب صدر کی خدمت میں گزارا ہے وہ میرے کیرئیر کا بہترین اور خوشگوار ترین عرصہ ہے۔ جناب صدر نے ملک میں نئی زندگی کا احساس پیدا کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں الگ ہو کر اپنا اصل کام شروع کرنا چاہتا ہوں۔ اصل میں میرا مشن ہی جناب صدر کے افکار اور فلسفے کی تشریح ہوگا۔ سول سرونٹ کی حیثیت سے میں صرف عام قسم کا Routine فائل ورک کر سکتا ہوں الگ ہو کر میں اُن کے افکار کو پھیلانے اور عام کرنے کے لیے کتابیں لکھ سکوں گا، لیکچر دے سکوں گا۔

۱۳۔ فی الحال میری درخواست پر کسی کارروائی کی ضرورت نہیں البتہ اگر جنابِ صدر میری تجویز کو اصولی طور پر تسلیم کر لیں تو میں تیاری شروع کر دوں گا اور جب جنابِ صدر خود مناسب سمجھیں گے علیٰحدہ ہو جاؤں گا۔

شہاب اور شہاب نامہ

قدرت اللہ شہاب سے میرا تعارف اکتوبر ۱۹۵۴ء کی اُس صبح کو ہوا جب وُہ کراچی میں گورنر جنرل غلام محمد کے سیکرٹری کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ عہدے کے اعتبار سے گورنر جنرل کے پرسنل سٹاف میں وُہ سب سے سینیئر افسر تھے اور میں۔ پی اے ٹو گورنر جنرل۔ پرسنل سٹاف میں سب سے جونیئر۔ وُہ گورنر جنرل سیکرٹریٹ کے سربراہ بھی تھے اور اس طرح ہم دونوں میں افسر و ماتحت کا رشتہ تھا جو وقت کے ساتھ سرکاری حدود پھلانگ کر دوستی کی شکل اختیار کر گیا اور ۳۲ برس تک قائم رہا حتیٰ کہ شہاب صاحب دُنیاوی رشتے ناطے توڑ کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

شہاب صاحب چھ برس تک گورنر جنرل اور بعد ازاں صدرِ پاکستان کے سیکرٹری رہے۔ انھوں نے ۱۹۶۲ء میں ایوانِ صدر کو خیر باد کہا اور میں نے ۱۹۶۸ء میں اُن کی جلا وطنی کے دوران بھی ہماری خط و کتابت رہی اور ایک مرتبہ ملاقات بھی ہوئی۔ وطن واپس تشریف لانے کے بعد وُہ وزارتِ تعلیم سے منسلک تھے کہ ۱۹۷۵ء میں میری پوسٹنگ بھی وہیں ہو گئی اور ایک بار پھر مجھے اُنکی قربت میں کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

قدرت اللہ شہاب گورنر جنرل ہاؤس میں آنے سے پہلے ہی افسانہ نگار کی

یہ مقالہ قدرت اللہ شہاب کی خود نوشت سوانح حیات "شہاب نامہ" کی تعارفی تقریب کے موقع پر پڑھا گیا۔

حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ نئے عہدے کو اُنھوں نے مزید عزت دی اور عہدے نے اُن کی شہرت میں مزید اضافہ کیا۔ وہ اُردو کے ادیب تھے مگر ان کی انگریزی بھی اُن کی اُردو سے کم نہ تھی۔ میری درخواست پر وُہ انگریزی کے سرکاری اور غیر سرکاری مضامین مجھے دیتے اور میں دفتری اوقات کے بعد یا گھر پر ٹائپ کر دیتا۔ حقِ خدمت کے طور پر مضمون کی ایک کاپی یا قلمی نسخہ اُن کی اجازت سے اپنے پاس رکھ لیتا۔ جب وُہ ایوان صدر سے رُخصت ہو رہے تھے تو متعدد کاغذات جنھیں وہ تلف کرنا چاہتے تھے میں نے اُن سے لے لیے اور یہ سارا سرمایہ میرے پاس محفوظ ہے۔

اُنھوں نے ایوانِ صدر میں ہر بڑی تبدیلی پر مضمون لکھا جو عموماً نئے صدر کی ضیافتِ طبع کے لیے ہوتا۔ غلام محمد کی ریٹائرمنٹ پر سکندر مرزا گورنر جنرل بنے اور چند ماہ بعد نئے آئین کے نفاذ پر ملک کے پہلے صدر منتخب ہوئے تو شہاب صاحب نے غلام محمد پر مضمون لکھا جس کا عنوان تھا۔

The most unforgetable character I have met.

غلام محمد ہی پر ایک اور مضمون انھوں نے ایوب خاں کے آنے کے بعد لکھا۔ اس کا عنوان تھا۔

The Slave of Muhammad as Governor General

دونوں مضامین میں نے ٹائپ کیے۔ پہلے مضمون میں غلام محمد کا اپنے سٹاف کے ساتھ برتاؤ کے دلچسپ واقعات تھے جن سے غلام محمد کی جلد بازی اور بے صبری ظاہر ہوتی تھی اور ساتھ ہی اُن کے کردار کی بلندی اور خلوصِ نیت کی جھلکیاں بھی تھیں۔ دُوسرا مضمون غلام محمد کی شخصیت کے کچھ نہاں گوشے اُجاگر کرنے کے علاوہ اُن کی مثبت سوچ بے لوث جذبہ خوشامدیوں سے نفرت اشد یہ حبُ الوطنی اور اسلام سے دلی وابستگی کا مظہر تھا۔ حیرت ہے کہ غلام محمد کی وُہ تصویر جو اُنھوں نے شہاب نامہ میں پیش کی ہے اُن دو مضامین سے بالکل مختلف ہے۔

میری حیرت اِس وجہ سے بھی دو چند ہے کہ میں اُس دَور کا عینی شاہد تھا اور شہاب صاحب کی عظمت کا دل سے قائل ہُوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قدرت اللہ شہاب کے اندر کا ادیب اور افسانہ نویس اُن کی تاریخ نویسی پر غالب رہا۔ کم و بیش یہی صورت سکندر مرزا اور فیلڈ مارشل ایوب خاں کے تذکرے کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ شہاب صاحب کی اِس ادب نوازی نے اُن کے اشرف المخلوقات ہوتے کا بھرم رکھ لیا ورنہ اندیشہ تھا کہ مُجھ جیسے عقیدت مند اُنھیں فرشتہ سمجھ لیتے۔

قدرت اللہ شہاب نے آئی سی ایس اور سی ایس پی کی تہمت خود لگوائی ورنہ سول سروس کے وُہ اہل نہ تھے۔ اُن کے ایک بیئیر کولیگ جناب ایم بی احمد نے ایک دفعہ I.C.S کی اصل نوعیت سمجھائی۔ اُنھوں نے بتایا کہ I.C.S کی تربیت لے کر اپنی پہلی پوسٹنگ پر جو C-A-O کی اسامی پر تھی پروٹوکول کے مطابق کمشنر صاحب بہادر پر کال کرنے چلے گئے۔ جا کر دیکھا کہ کوٹھی کے برآمدے میں ملاقاتیوں کی لمبی قطار کرسیوں پر بیٹھی ہے جن میں کچھ خان بہادر اور رائے بہادر قسم کی چیزیں بھی تھیں۔ ایم بی احمد چپڑاسی کو اپنا کارڈ دے کر قطار کی آخری خالی کرسی پر بیٹھ گئے کہ باری پر بلائے جائیں گے۔ تھوڑی دیر بعد چپڑاسی نے دروازے کی چِک اُٹھائی کمشنر صاحب بہادر نمودار ہوئے اور ایم بی احمد سے ہاتھ ملا کر اُنھیں کمرے میں لے گئے۔ سامنے بٹھا کر خوب مرمت کی کہ تم کیسے I.C.S ہو تمھیں چاہیئے تھا کہ ملاقاتیوں کو نظر انداز کر کے چِک اُٹھا کر اندر آجاتے اور تعارف کراتے۔ تم اُنھی لوگوں کے درمیان آ کر بیٹھ گئے جن پر تم نے حکومت کرنی ہے۔ اس تنبیہہ کے بعد میم صاحبہ کو بلوایا، تینوں نے کافی پی اور پھر نئے I.C.S افسر کو کمشنر اور لیڈی کمشنر باہر گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ یہ تھی وُہ سول سروس اور یہ تھا وُہ عذاب جس میں قدرت اللہ شہاب نے اپنے آپ کو خود مبتلا کیا۔ چونکہ خود کردہ را علاجے نیست اِس لیے وُہ سعی پیہم اور کوشش بسیار کے باوجود اِس عذاب سے نجات نہ پا سکے اور ساٹھ سال کی طبعی عمر کو پہنچ کر ہی رہائی نصیب

ہو سکی۔ وُہ پورے سروس کیریئر میں افسر نہ بن سکے۔ اگر ایسا ہوتا تو میری اُن کی شناسائی ۱۹۶۲ء میں اُن کے ایوانِ صدر سے رخصت ہونے کے ساتھ ختم ہو جاتی۔

جس طرح قدرت اللہ شہاب اور جمیل الدین عالی ایوب خاں کو بادشاہ کہا کرتے تھے اسی طرح میں اور ایوب خاں کے اسسٹنٹ پی آر او نثار حسین شہاب صاحب کو مولوی صاحب کہا کرتے حالانکہ نہ وہ بادشاہ تھے اور نہ یہ مولوی۔ شہاب صاحب اپنے چپڑاسی عرفان سے جو شام کو پان سگریٹ کا ٹھیلہ لگایا کرتا تھا روزانہ پان لے کر کھاتے۔ ممتاز مفتی نے موقع پاکر انھیں تمباکو والے پان پر لگا دیا۔ اتنے بھلے تھے کہ فٹ کہنا مان لیتے۔ دوست تو دوست وہ دشمنوں کا دل توڑنا بھی پسند نہ کرتے۔ اُن کا وطیرہ ہمیشہ با دوستاں مروت با دُشمناں مدارا رہا۔ ایک صاحب تھے ایم شفقت جو کسی یورپی ملک میں ہمارے ہم سفر ہوتے تھے۔ ایک دن بتایا رات کھانے پر شفقت آیا تھا۔ اپنی بوتل اوورکوٹ کی جیب میں لیتا آیا۔ شکایت کر رہا تھا کہ جب سے پاکستان آیا ہوں اِدھر اُدھر چُھپ چھپا کر پینی پڑتی ہے۔ میں نے دلاسہ دیا کہ چلو میرے ہاں لا کر پی لینا۔

جس شام ثاقب شہاب مجھے شہاب نامہ کی کاپی یہ کہہ کر دے گئے کہ "والد صاحب کی خواہش تھی ایک کاپی آپ کو دی جائے" میں نے فوراً ورق گردانی شروع کی۔ اتفاق سے جو صفحہ سب سے پہلے نکلا اس نے مجھے بریکیں لگا دیں۔ لکھا تھا "میں نے دیکھا کہ میرا ڈپٹی سیکرٹری فرخ امین ہر دوسرے تیسرے روز مجھے بتائے بغیر لاہور آجا رہا ہے۔ ایک روز میں نے اُسے ڈانٹا کہ میری اجازت کے بغیر وُہ اتنی بار لاہور کیوں آتا جاتا ہے"

ایوانِ صدر میں اُن کے چھ برسوں کے دوران ہمیں یہ حسرت رہی کہ شہاب صاحب کسی ماتحت کی غلطی، کوتاہی یا گستاخی پر کبھی تو سرزنش کریں یا ہلکی سی ڈانٹ ڈپٹ ہی کر لیں۔ درانی، ممتاز مفتی اور میں آہیں بھرا کرتے کہ اللہ نے ہمارے

مولوی صاحب کو پتہ نہیں کس مٹی سے بنایا ہے۔ آخر تھک ہار اور مایوس ہو کر صبر کر کے بیٹھ گئے کہ قسمت میں یہی لکھا ہے البتہ یہ طے نہ کر سکے کہ ہماری قسمت میں، شہاب صاحب کی قسمت میں یا فرخ امین کے بعد آنے والے ڈپٹی سیکرٹری عبدالوحید کی قسمت میں جو سکندر مرزا اور ایوب خاں کے دورِ حکومت میں شہاب صاحب کی آنکھوں کے سامنے ایوانِ صدر میں سنگین بدعنوانیوں کے ریکارڈ قائم کر گیا۔ بے شک عبدالوحید چوہدری ظفراللہ خاں کا پروردہ، ایم ایم کا چہیتا، وفاقی سیکرٹری دفاع احمد کا ماموں تھا اور اُسے مرزا ناصر احمد قادیانی میزبانی کا شرف بخشا کرتے تھے۔ مگر فرخ امین قائدِ اعظمؒ کا پی اے رہ چکا تھا۔ اُن دنوں گورنر جنرل کا اسسٹنٹ سیکرٹری، ایک فرض شناس اور معتمد ترین سٹاف ممبر تھا۔ لاہور کا سفر گورنر جنرل کی ہدایت پر کرتا تھا۔ میرے خیال میں "ڈانٹا" والا فقرا قدرت اللہ شہاب کا اشہبِ قلم بے قابو ہو کر لکھ گیا جسے وُہ بعد میں قلم زد کرنا بھُول گئے ورنہ قدرت اللہ شہاب جیسا نرم رو شخص ڈانٹنے کا اہل نہ تھا اور نہ فرخ امین جیسا محتاط شخص اس کا سزاوار تھا۔ شہاب نامہ کے مطالعہ کے دوران مجھ جیسے واقفِ حال اور عینی شاہد کے لیے مقامات آہ وفغاں اور بھی ہیں جہاں شہاب صاحب نے واقعات کو بڑھا دیا ہے۔ فقط زیبِ داستاں کے لیے۔"

ریٹائرمنٹ کے بعد شہاب صاحب نے سرکاری تقریبات سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی تاہم اُن نیم سرکاری یا غیر سرکاری تقریبات میں شرکت سے گریز نہ کیا جو اُن کی اُفتادِ طبع یا مزاج کے مطابق ہوں۔ قائدِ اعظم اور علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں مختلف کمیٹیوں کی رکنیت برقرار رکھی اور اسلام آباد، لاہور یا کراچی میں میٹنگ میں شریک ہوتے۔ متعلقہ ڈپٹی سیکرٹری ہونے کی وجہ سے میں صد سالہ تقریبات سے منسلک تھا اور اُنھیں باخبر رکھا کرتا۔ وُہ ڈیلی الاؤنس قبول کرنے سے انکار کر دیتے کہ فلاں عزیز کے ہاں ٹھہرے ہیں یا اُن کا کچھ خرچ نہیں ہوا ہے۔ اسلام آباد سے لاہور تک کا کرایہ تک واپس کر دیا کہ وُہ فلاں عزیز کی کار میں آئے گئے۔ میں نے

اپنی پوری سروس میں مالی معاملات میں اس قسم کی احتیاط غلام محمد میں دیکھی یا اُن کے بعد قدرت اللہ شہاب میں. غلام محمد اپنے جائز حق سے دستبردار نہیں ہوتے تھے مگر شہاب صاحب کو جائز حق سے محرومی بھی احساس محرومی میں مبتلا نہ کر سکتی۔ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۱ء میں ۳۰ جون کلیم منظور کروانے کی آخری تاریخ تھی۔ اُس دن شہاب صاحب کے چھوٹے بھائی حبیب اللہ شہاب نے کراچی سے ٹیلیفون پر مجھے بتایا کہ فیملی کا کلیم فارم بھائی جان کی میز کی فلاں دراز میں کئی مہینوں سے رکھا پڑا ہے۔ آپ وہاں سے نکال کر بھائی جان کے دستخط کر وا لیں اور وقت ختم ہونے سے پہلے داخل کردا دیں۔ شہاب صاحب نے میرے اصرار پر دستخط تو کر دیے مگر اس انداز سے جیسے کوئی مکروہ فعل سرزد ہو رہا ہو۔

شہاب نامہ میں فرماتے ہیں کہ صدر ایوب کی خواہش پر میں نے انھیں دو تین سادہ سادہ سے آسان مترجم قرآن شریف فراہم کر دیے جن کو اُنھوں نے بڑی محنت اور غور سے پڑھا۔ وُہ محض نمبر بنانے کی خاطر صدر صاحب کے آگے پیچھے نہیں پھرا کرتے تھے اور کوئی چیز صدر صاحب کو پہنچانی ہوتی تو عموماً مجھے یاد فرماتے۔ مارشل لا سے آٹھ دس مہینے بعد کی بات ہے کہ اُنھوں نے تاج کمپنی سے انگریز نومسلم مرمیڈیوک پکتھال کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ دو جلدوں پر مشتمل قرآن حکیم منگوا کر مجھے کہا کہ پہنچا دوں۔ اس کے چند ہفتہ بعد پکتھال کے مدراس میں دیے گئے چھ لیکچرز The Cultural side of Islam منگوا کر دیے۔ لگتا تھا جیسے ایوب خاں نے قدرت اللہ شہاب کی شاگردی اختیار کر لی ہو اور قرآن حکیم کے بعد اقبالیات کی درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا ہو کیونکہ کچھ دنوں بعد اُنھوں نے اپنے قلم سے لکھا ہوا ایک پرچہ دیا کہ صدر صاحب کو پہنچا دُوں اِس پرچے پر خودی کی تشریح تھی۔ صدر صاحب کے حوالے کرنے سے پہلے میں نے ایک کاپی اپنے لیے کر لی۔

خودی کا عنوان دے کر نیچے لکھا تھا۔

Khudi In Individuals Self-respect, Feel Humbler before the Humble, Prouder before the Proud. In Nations : Independence Sovereigenty In Economics Self-sufficiency In Social and Political Order Emergence of a Super man, An Ameer who is Silky soft in peace and steely hard in war. In Prophethood Mohammad a Leader who is benign and Ruthless According to need, Reflection of Prophet's own attributes.

شہاب صاحب کے جاتے وقت جو کاغذات مجھے ملے اُن میں یہ دستاویز بھی موجود تھی اور میرے پاس محفوظ ہے۔

تعجب ہے کہ ایک ہمہ مقتدر اولولامر نے اپنے ہی عملے میں سے ایک درویش کے سامنے زانوے تلمذ طے کرنا کیسے گوارا کر لیا۔ اِس کا کریڈٹ دونوں کو جاتا ہے۔ کیونکہ بزرگوں کا قول ہے۔ "مبارک ہے وُہ زبان جو اچھی بات کہے اور مبارک ہے وُہ دل جو اچھی بات کو قبول کرے۔"

ماسوائے پیغمبروں کے، انسان کتنا ہی عظیم ہو خطاؤں سے پاک نہیں ہوتا۔ قدرت اللہ شہاب ایسے ہی ایک عظیم انسان تھے اور علامہ اقبال کے اس شعر کی تصویر:

امیرے در لباسِ خود فقیرے
فقیرے در صفاتِ خود امیرے

What is Najat? Liberation from what? not from the limitation of individuality (Wajenakum farada). Not liberation from the tension of consciousness. It is relief of Ego in the Universe. The conception of God (Comrade) : Alarrafiq-ul-ala).

(a) Sleep liberates (la takhuzu hu sinatan wa la naum.)

(b) Wine liberates and breaks the vigour of consciousness.

(c) Dancing also liberates (Amaroo (Amaroo bil afw wa karama).

All these means of escape from space and time are discouraged. You should overcome space and time (Ala Sultan)..) by i.e. mastering actuality by understanding (Taffakkar-oo-fil Khalq-was-sammawat).

Fear of the visible actuality i.e. space and time is removed when we begin to understand things as casual relations (La khaufun alehim wa la hum yahzanun.) Fear overcome not by charms but by knowledge of world as nature actuality formula.

(d) Knowledge of world as movement:-

History-Sufism.

(iii) Imam, Security.

Reform movements in Islam
Ibn Tamyya.

Abdul Wahab) prophecies) All more or less magian.
Babi))
Ahmadyya)
Syed Ahmad -)
rationalism)

The new movement.
The coming of the Expected one.

(i) No return.

(ii) Traditions (Bokhari).

Checked and found correct according to the original.

(SYED BASHIR AHMED)
ADMINISTRATIVE OFFICER
IQBAL ACADEMY.

ایوب خاں نے یہ دستاویز شہاب صاحب کو اس نوٹ کے ساتھ واپس کر دی:

These notes are fascinating! Why not pass them on to someone who could make use of them and complete Iqbal's resolve.

A. Religion. Is it belief in a God or gods with some kind of worship? In cases, monasticism.

(i) It is wholly other-worldliness (la ruhbania fil Islam).

(ii) Is it fear of the invisible (la khaufun alehim wa la hum yahzanun).

(iii) Is it intimacy with the supersensible?
Partly yes, but the supersensible opened to be approached in a scientific spirit-Ibn Khaldun, idea of finality.

(iv) Is it some secret teaching to be handed orally (mystery)?
All early magian religions - with (Spengler p. 246 Vol. II Islam No.: II (Qad baiyan-ur-rushd min-al-ghai-)

(v) Religion-origin of the word Mazhab not used in the Quran. Words in the Quran. Din, Minhaj, Milat.
What is the meaning of Millat and Din.

(vi) Matinean Vol, I.

B. Islam a protest against all religions in the old sense of the word.

(i) Abolition of prophethood, Islam and Time. (Hal Ata)

(ii) The idea of salvation in Islam. It is a salvation-religion Najat is used only once in the Quran. What is Najat.

(iii) No secret teaching.

(iv) Belief in God (Ghalib) deracialisation of man-kind and Economic equality (Qul-al-afu).

C. Church and State?
In Islam is community a juristic person?
Is Islamic State a juristic person?
Relation of Church and State.
What is State? Like marriage a contract.
The Amir is the Sheikh-ul-Islam etc.
Hereditary monarchy. History of Islam priesthood.
Karbala? Effect of it.

D. Islam and the Woman.

E. Islam and Capitalism.

II. To the Magian culture Revelation is a mystical process in which some spirit enters the body of a person who speaks it. In Islam 'Wahy' (Quote verses) is universal property of life which a man comes into contact with the ultimate, springs of life. It manifests itself in three ways. It is abolished as a source of knowledge. In Islam contemplation-spreads into thought and action. It realises the-world in which old conceptions of race, community and creed dwindle into nothing. It is light : (Allah-o-sirussamawat wal arz)
It - the world from - to the open daylight (Wallah-o-yukhrijekum minazzulomate ilannur.)

III. The word salvation (Najat).

He must wade through a tremendous literature and read the Quran. I have done so and try to give ou what I honestly believe to be real Islam.

D. What is Islam?
Is it religion? Etymology of religion. Cf. Din as used in the Quran. Obedience to the Law (read 5:18 Quran).

Characteristics of early Asiatic religion.

(i) Revelation in early religion-a mystic process. Islam laid the foundations of understanding it scientifically-Quran, Ibn Khaldun. Sufism.

(ii) Salvation (Najat).

(iii) Wholly unwordliness (la ruhbania) caves, catacombes Cf. Christianity and Islam (Wallah-o-yukhrijckum minazzulmati ilannur).

<u>Jesus -- Saint.</u>

(iv) Fear of the invisible (la khauf alehim w la hum yahzanun).

(v) Some secret teaching of Spengler Vol. II page 246 Read also Martman Vol. I.

(vi) Belief in the unreality of the world and time. (Enama ma khalqata haza batala. Hal ata al-al-insani..)

(vii) Fatalism.

(viii) Theocracy.
Islam was a protest against all pre-Islamic religions in the world as it was found at the time Islam appeared.
The world is real. Time is real.
(No more prophets (Expected one)
No freedom from limitation. No mediation. No Qismat (fatalism). Is Islam a Theocracy?
Relation of Church and State.
What is State? A contract like marriage.

E. But Islam is much more than religion. Peace internal and external (Cf. 5.18).

(i) It is deracialisation of man (external peace).

(ii) It aims at economic equality (internal security).

F. This lecture to close.

Two closing observations:-

(i) The message of Islam.

(ii) Islam is not the foe or even rival of christianity. In the work of civilisation it is co-worker.
Second Lecture: The Law of Islam.
See book of Dickinson "After Two thousand Years".
In Magian culture 'revelation' a mystical process. In Islamic 'sufism' this mystical process understood scientifically.
Is it morality touched with emotion?

"THE BOOK THAT IQBAL PLANNED TO WRITE"

In 1933 when I was privileged to act as his scribe, Allama Iqbal handed over to me a few sheets of paper being synopsis in his own hand of what he contemplated to be an "Introduction to the study of Islam" with special reference to its jurisprudence. With the eye-sight failing quickly his intention was to dictate to me what would have been an epoch-making and an authoritative book in English on Muslim polity and Muslim jurisprudence. But, alas, his plans (originally entrusted to him by the Ruler of Bhopal) remained unexecuted as his health began progressively to deteriorate and on April 21, 1938 the flame of his life extinguished.

Since then I have treasured these notes as a national trust and at one time brought their existence to the notice of Quaid-i-Azam He wrote to me on March 24, 1943: "With regard to the synopsis of a book which Iqbal wanted to write regarding the reconstruction of Islamic jurisprudence I would like to see it and then consider the name of a competent person who could pursue the matter further. As it is a subject of jurisprudence, a lawyer only will be able to do justice to it".

Being written in pencil these notes were quickly fading out. It was during my detention at the new Central Jail Multan in 1947, that I carefully transcribed them. I present these, unedited to the people in the hope that the competent among them may be able to fulfil the poet's desire to present to the world an authoritative book on Islam as a living factor in our lives

Sd/- M. Shafie

A. It is necessary to study Islam.

   (i) It has power and vitality.
   At times it has shown its power of getting rid of accretion
   New movements. I pin no faith on them but they indicate confusion and inner unrest.

   (ii) Islam and modern world and British Empire.

B. Islam and Empire.
The effect of Arab Empire on Islam.
They destroyed Rome and Persia and ~~built~~ another Imperialism.
Causes of Empire building.

   (i) Religious zeal burning ardour to regenerate mankind.

   (ii) Hunger.
   Whatever may be the causes the effect was not good. Empire brought men belonging to earlier ascetic cultures which Spengler describes as Magian within the fold of Islam. The result was the coversion of Islam to a pre-Islamic creed with all the philosophical controversies of these creeds (Ruh, Nafs, Quran Hadis and Qadim etc.) Real Islam had very little chance.

C. Difficulties of modern student of Islam.

کتاب جو علامہ اقبالؒ لکھ نہ سکے

علامہ کی اس کتاب کا خاکہ بھی شہاب نے ایوب خاں کو پیش کیا تھا جو علامہ لکھنا چاہتے تھے مگر لکھ نہ سکے۔

PRESIDENT'S CAMP

I have come across an incomplete note of Iqbal on "Islamic Polity" and a copy is enclosed

This has some interesting outlines of points, and also shows the way his his speech-making.

Qushahab

29/6

President

These notes are fascinating! Why not pass them on to someone who could make use of them & complete Iqbal's resolve.

[signature]

30/6

Secy.

اختتامیہ
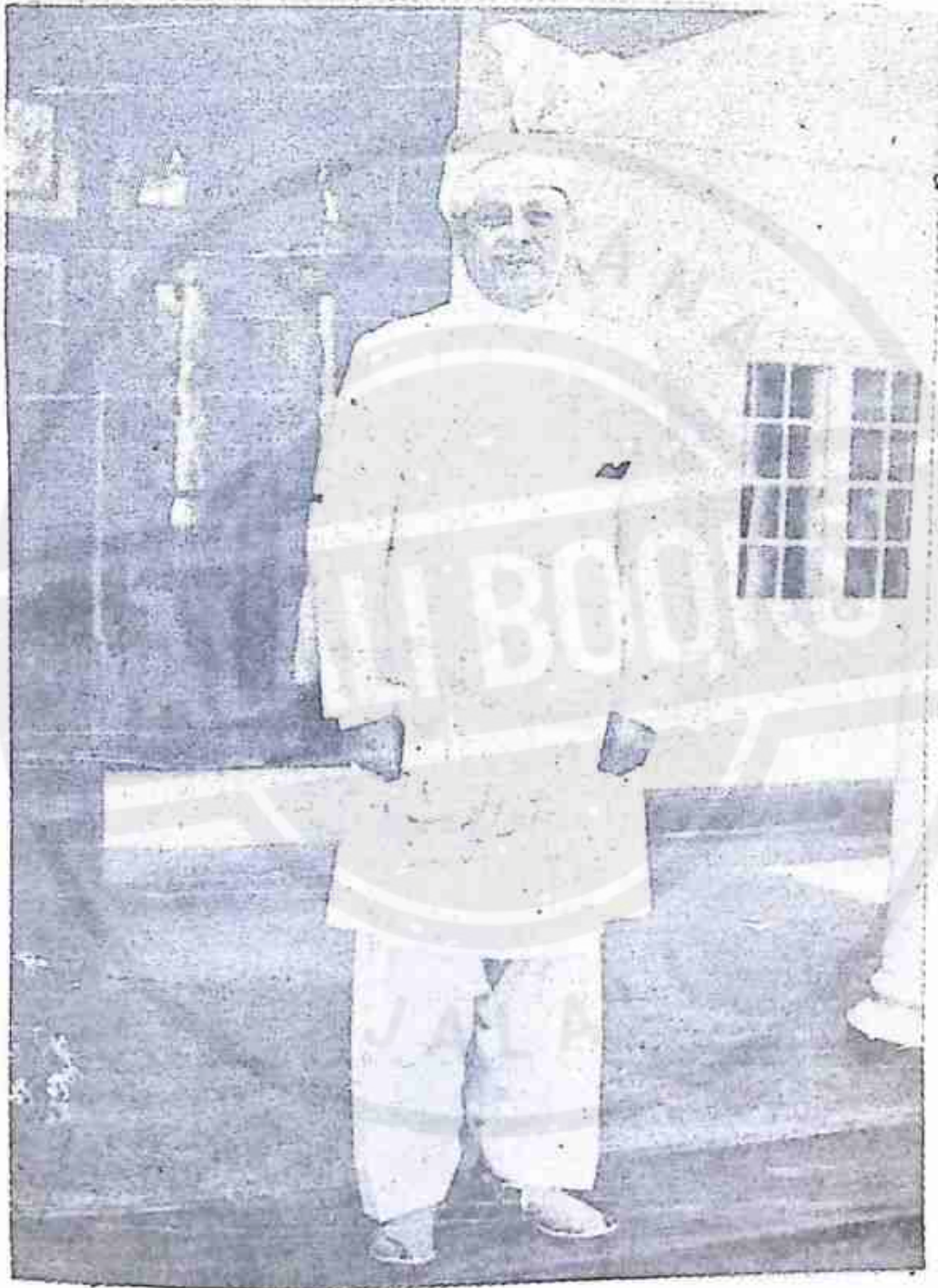
ایوانِ صدر سے فرار

پاکستان ترکی اور ایران پر مشتمل ایک بین الاقوامی ادارہ ریجنل کوآپریشن فار ڈیویلپمنٹ (R C D) کے نام سے ۱۹۶۴ء میں وجود میں آیا تھا جس کا صدر دفتر تہران میں تھا۔ اس دفتر میں میری سلیکشن بطورِ ڈپٹی ڈائریکٹر مارچ ۱۹۶۸ء میں ہوگئی۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں کے ساتھ منسلک ہونے کے باعث مجھے ایوانِ صدر سے تہران جانے کے لیے اُن کی اجازت ضرور تھی۔ دریں اثنا وہ علیل ہوگئے اور ڈاکٹروں نے اُنھیں کام کرنے یا ملاقات کرنے سے روک دیا۔ صحت یاب ہونے پر اُنھوں نے کام کرنا شروع کیا تو صدر کے پرسنل سیکرٹری سید فدا حسن نے میرے متعلق پوچھا۔

فیلڈ مارشل نے مجھے طلب فرما کر سمجھایا کہ اگلے برس صدارتی انتخابات تک رُک جاؤ۔ اِس کے بعد اگر جانا چاہو تو بے شک چلے جانا۔ دُوسرے دن سید فدا حسن نے بلا کر بتایا کہ پریزیڈنٹ صاحب نے میرے لیے دو سو ایکڑ اراضی اور نقد رقم کا حکم دیا ہے۔ اور پوچھا ہے کہ کتنی رقم درکار ہے۔ میں نے جواب دیا کہ زرعی اراضی لینے سے میں پہلے ہی معذوری ظاہر کرچکا ہوں۔ باقی رہی مالی امداد تو میں خود کو اس کا مستحق نہیں سمجھتا کیونکہ ملازمت کو مزدوری سمجھ کر کرتا رہا ہوں اور اُجرت تنخواہ کی صورت میں وصول کی ہے۔ تاہم میں بے حد شکر گزار ہوں اور پریزیڈنٹ صاحب کے لیے دُعا گو رہوں گا۔ آپ فقط اُن سے میری ٹرانسفر کی اجازت لے دیں۔ میں نے مُلک کی خدمت کرنی ہے جہاں بھی ہوں گا کرتا رہوں گا۔ سید فدا حسن بہت سینیئر اور پرانے سول سرونٹ تھے، میرے جواب پر حیران بھی ہوئے اور برہم بھی۔

پریزیڈنٹ کے ملٹری سیکرٹری میجر جنرل محمد رفیع نے خدا اُنھیں سلامت رکھے اسلام آباد

میں ہی مقیم ہیں، بڑے شفیقانہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

دو تین روز بعد بیگم ایوب خاں صاحبہ نے میری بیوی کو بلایا۔ وہ ہمیشہ بڑی شفقت اور محبت سے پیش آیا کرتی تھیں۔ اُن کے علم میں تھا کہ دوسرے سٹاف ممبرز کے برعکس میں نے کوئی زمین مکان یا پلاٹ الاٹ نہیں کروایا۔ میری بیوی کو تسلی دی کہ فکر نہ کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو تمھاری لڑکیوں کی میں خود شادیاں کروں گی۔ میری بیوی اچھا کہہ کر واپس چلی آئیں۔

دوسرے دن میں بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کا شکریہ ادا کیا اور درخواست کی کہ وہ پریزیڈنٹ صاحب سے میری ٹرانسفر کی منظوری لے دیں۔ اُنھوں نے میرے اصرار کو بچگانہ ضد سمجھا۔

کافی دن گزر گئے۔ سید فدا حسن تبدیل ہو کر چلے گئے اُن کی جگہ عبدالقیوم صاحب تشریف لائے۔ میری ٹرانسفر والی فائل پریزیڈنٹ صاحب نے اپنے ہی پاس رکھ چھوڑی۔ دریں اثناء وزارتِ تعلیم کو آر سی ڈی کی طرف سے میرے متعلق خطوط آتے رہے۔ تنویر احمد خاں نے جو اُن دنوں ڈپٹی ایجوکیشنل ایڈوائزر تھے اور اب (۱۹۸۶ء میں) ایڈیشنل فارن سیکرٹری ہیں، عبدالقیوم صاحب کو ٹیلیفون کر کے میرے متعلق پریزیڈنٹ سیکرٹریٹ کا حتمی فیصلہ دریافت کیا تاکہ بصورتِ دیگر وہ کسی دوسرے افسر کا انتخاب کر سکیں۔ عبدالقیوم صاحب نے پریزیڈنٹ صاحب سے پوچھا تو اُنھوں نے جھنجھلا کر میری ٹرانسفر کی منظوری دے دی اور یوں میں اگست ۱۹۶۸ء میں ایوانِ صدر کو سولہ سال بعد خیرباد کہہ سکا۔

جاتے وقت پریزیڈنٹ صاحب کی خدمت میں الوداعی خدا حافظ کہنے کے لیے حاضر ہوا تو اُنھوں نے باوجود ناراضگی کے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ میں اُن کی سفید شیروانی اور لُنگی کلہ والی تصویر اپنے ساتھ لیتا گیا تھا اُس پر آٹوگراف کرنے کی درخواست کی۔ قلم اُٹھا کر حسبِ معمول انگریزی میں دستخط کرنے لگے تو میں نے عرض کیا کہ جناب انگریزی کی بجائے اُردو میں دستخط فرمائیں۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور پھر تصویر

پر انگریزی میں ایم اے خاں کی بجائے اُردو میں محمد ایوب خاں لکھ دیا۔ اس سے پہلے اُنھوں نے اُردو میں کبھی آٹوگراف نہیں دیا تھا۔

ذاتی نوعیت کی یہ باتیں میں ہرگز ضبطِ تحریر میں نہ لاتا مگر اِن واقعات کے ساتھ کچھ تجربات وابستہ ہیں جو میں بتانا چاہوں گا کہ شاید کوئی خیر کا پہلو ہو۔

جن دنوں میری ٹرانسفر کا معاملہ اٹکا ہوا تھا ایوانِ صدر راولپنڈی کے قریب ہی مری بردری کالونی کے ساتھ والی آبادی ڈھوک کشمیریاں میں ایک روحانی بزرگ کا بڑا چرچا تھا۔ ایوانِ صدر کے کچھ لوگ بھی اُسے ملنے گئے اور واپس آکر اُن کی روحانیت کا تذکرہ بڑی عقیدت سے کیا۔ مجھے بھی خیال آیا کہ اُن بزرگ کی زیارت کروں حالانکہ مجھے 'زبزم صوفی و ملا بسے غمناک می آیم' کا کچھ تجربہ تھا۔ عصر کے وقت گزشتہ راصلوٰت آئین۔ ہ را احتیاطاً کے طور پر اُن بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتّفاق سے اکیلے مِل گئے اور اچھی صحبت رہی۔ واپس اُٹھنے لگا تو نجانے کیوں درخواست کر بیٹھا کہ میرا ایک جائز کام معرضِ التوا میں ہے دُعا کریں کہ خُدا رکاوٹ دور کرے۔

اسی رات خواب میں دیکھا کہ میری ٹرانسفر والی فائل اُنہی بزرگ کے سامنے آئی اور اُنھوں نے اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ آنکھ کھُلی تو سمجھ لیا کہ فیصلہ ہو گیا ہے۔ صُبح اپنی بیگم سے ذکر کیا تو نسوانی ضعیف الاعتقادی نے میرے یقین کو عین الیقین میں بدل دیا اور ہم نے سچ مچ سامان باندھنا شروع کر دیا۔ ایک دو چیزیں بیچ دیں۔ گاڑی خریدنے کی پیشکش ایک خاتون نے کر رکھی تھی اُن سے بات پکّی کر کے بیعانہ لے لیا۔

قریباً ایک ماہ پھر ویسے ہی گزر گیا مگر اصلی فائل میں کوئی "ہلچل" نہ ہوئی اور اُمید درجا یاس و حزن میں تبدیل ہونا شروع ہو گئی۔ نماز کے دوران مجھے کبھی کبھی بھولی بسری پرانی یادیں آجایا کرتی ہیں۔ ایسے ہی نماز فجر کے دوران اچانک اقبالؒ کا وُہ شعر یاد آگیا جو میں کچھ عرصہ پہلے تک اکثر گنگنایا کرتا تھا:

بُتوں سے تجھ کو اُمیدیں خُدا سے نا امیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

فوراً خیال اُسی بزرگ کی طرف گیا اور قلب و نظر کے دریچے کھُل گئے۔ ایک کے بعد دُوسرا شعر:

بغیر اللہ کردم تکیہ یک بار
دو صد بار از مقام خود فتادم

دُوسرے کے بعد تیسرا شعر:

کار سازِ ما بفکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

یقیناً یہ نماز ہی کی برکت تھی۔ توبہ کی اور اللہ سے التجا کی کہ ٹرانسفر نہیں ہوتی تو نہ ہو میری کھوئی ہوئی ایمان کی دولت مجھے واپس مل جائے۔ حُسنِ اتفاق کہ دو چار دن بعد اُسی ہفتے عبدالقیوم صاحب نے بتایا کہ پریذیڈنٹ صاحب نے رضامندی دیدی ہے چارج دینے کی تیاری کرو۔

ایوانِ صدر سے میرے فرار میں قدرت اللہ شہاب کا بھی ہاتھ تھا۔ سب سے پہلے اُنھی نے مشورہ دیا تھا۔ ہالینڈ میں سفیر بن کر جاتے وقت سمجھاتے گئے کہ ایوانِ صدر میں بالعموم اور صدر کے سٹاف پر بالخصوص زیادہ لمبا قیام اچھا نہیں ہوتا۔ دو سال بعد چھُٹی پر وطن واپس آئے تو اُن کا قیام اسلام آباد میں میرا حسبِ سابق راولپنڈی کے ایوانِ صدر کی حدود میں تھا۔ مڈیر حسن (راولپنڈی) کے قریب ایک قبرستان ہے جہاں ایک بزرگ کی قبر پر شہاب صاحب، ممتاز مفتی اور میں جمعرات کو فاتحہ کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس راہ پر ہمیں ممتاز مفتی نے لگا رکھا تھا۔

ایک جمعرات فاتحہ کے بعد شہاب صاحب کہنے لگے کہ آر سی ڈی میں پاکستان کے لیے ڈپٹی ڈائریکٹر کی ایک اسامی پیدا ہوئی ہے۔ تمھاری فارسی اچھی ہے تاریخ اور ثقافت میں بھی دلچسپی رکھتے ہو درخواست دے دو۔ سیلیکشن بورڈ کے چیئرمین ایم ایچ صوفی ہوں گے اُنھیں بیگم ایوب خاں سے کہلوا دینا۔ میں نے درخواست تو گزار دی مگر بیگم صاحبہ سے ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا اور عادت کے مطابق معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔

توکلت علی اللہ تعالےٰ۔ مقابلے میں مجھ سے بہت بہتر اُمید وار موجود تھے مگر

قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زنند

پوری سروس میں جتنے بھی مراحل پیش آئے سب کے سب اللہ ہی کے لُطف و کرم سے طے ہوئے تھے۔ کسی ناخُدا کی خدائی کا سہارا نہ لیا تھا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا اور سعدیؒ کی بات سچی ہو گئی؛

بناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندر آں حیراں بماند

ایوانِ صدر میں مجھ سے کہیں زیادہ "دانا" موجود تھے جو صدر صاحب کی خوشنودی کی خاطر تن کے علاوہ من کی دولت کا نذرانہ پیش کرنے پر ہمہ وقت تلے رہتے تھے نہ معلوم مجھے وہاں اتنا عرصہ کیسے گوارا کیا گیا جب کہ مُجھ سے گستاخیاں بھی سرزد ہو جایا کرتی تھیں۔

ایوانِ صدر کے دروازے پر دور دراز علاقوں سے لوگ عرضیاں پرچے لیکر آتے اور صدر صاحب سے ملاقات کا تقاضا کیا کرتے تھے۔ قدرت اللہ شہاب نے فیلڈ مارشل صاحب سے ذکر کیا تو میری ڈیوٹی لگا دی گئی کہ ہر روز ایک ڈیڑھ گھنٹہ اُن سے ملاقات کر کے اُن کے مسائل سُن لیا کروں۔ مقصد صرف یہ تھا کہ لوگوں کو تسلی ہو جائے کہ صدر صاحب کی طرف سے کسی نے اُن کی بات ہمدردی سے سُنی ہے۔ بعد میں وُہ سب درخواستیں متعلقہ وزارتوں اور محکموں کو ضابطہ کی کارروائی کے لیے چلی جاتیں۔ کسی کسی درخواست پر اُن سے وضاحت بھی طلب کر لیتے۔ یوں لوگ مطمئن ہو کر واپس چلے جایا کرتے۔

ایک دفعہ دو خواتین کو بیگم ایوب خاں صاحبہ نے اپنے ذاتی ملازم محمد یونس کے ہمراہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے اُن خواتین کو بٹھا لیا اور باری آنے پر اُن کے مسائل سُنے۔ واپس جا کر اُنھوں نے بیگم صاحبہ سے میری شکایت کی کہ میں نے اُنھیں بہت دیر بٹھائے رکھا اور دُوسرے لوگوں کے مسائل سنتا رہا۔ جب دو تین ایسی شکایتیں بیگم صاحبہ تک پہنچیں تو اُنھوں نے یاد فرمایا اور کہا کہ جن لوگوں کو وُہ بھیجا کریں اُن سے پہلے مل لیا کروں۔ عرض کیا کہ جناب مجھے کسی قسم کے اختیارات تو ہیں نہیں کہ داد رسی کر سکوں میں

لوگوں کے مسائل توجہ سے سُنتا ہوں اور ضروری کارروائی کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ جو لوگ آپ تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اُنھیں تو آپ کا سہارا مل گیا مگر جن لوگوں کو سیکیورٹی والے آپ تک نہیں پہنچنے دیتے وُہ بے سہارا رہ جاتے ہیں۔ بس یہی سوچ کر اگر میں بھی اُنھیں مؤخر کر دُوں تو وُہ بددل ہو کر واپس جائیں گے کہ یہاں بھی سفارش اور دھاندلی چلتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ میرے جواب سے بیگم صاحبہ ضرور برہم ہوں گی مگر اُنھوں نے صرف مُسکرا دیا۔

اس سے قبل ایک اور واقعہ ہو چُکا تھا۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں کی ہمشیرہ صاحبہ کا نام اقبال بیگم تھا جنھیں بوبو جی کہہ کر پکارتے تھے۔ اُن کے شوہر جناب خواجہ خاں ہری پور میں ٹرانسپورٹر تھے اور اقبال بیگم صاحبہ خود بھی کاروبار میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ وُہ ہری پور سے بھائی کے ہاں ایوانِ صدر تشریف لائی ہوئی تھیں۔ مجھے طلب فرمایا کہنے لگیں سب لوگ تمھاری تعریف کرتے ہیں۔ پھر ہری پور بیوی بچّوں کے ساتھ آنے کی دعوت دی۔ آخیر میں فرمایا کہ اُنھوں نے نیشنل بنک سے قرضہ لینا ہے اُنھیں ٹیلیفون کر دُوں۔ نیز لاہور میں فوڈ ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری سے چاولوں کا پرمٹ لے دُوں۔ عرض کیا کہ اِن باتوں میں میرا یا ایوانِ صدر سے کسی کا بھی ملوث ہونا مناسب نہیں۔ اقبال بیگم صاحبہ کو میرے جواب سے مایوسی ہوئی۔ کھسیانی ہو کر فرمایا اچھّا ٹھیک ہے میں خاں جی سے بات کر دوں گی۔ خاں جی سے مراد فیلڈ مارشل تھے۔ اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا تو پیچھے محمد یونس آیا کہ بیگم صاحبہ نے یاد فرمایا ہے۔ حاضر ہوا تو پوچھا بوبو جی نے کیا کہا تھا۔ سب بات بتا دی فرمانے لگیں ٹھیک کیا۔

اللہ کی طرف سے کسی شخص کے لیے ہدایت مقصود ہو تو موقع فراہم ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ میں نے دو پولیس افیسروں کی آپس کی گفتگو سُنی۔ ایک کہہ رہا تھا کہ اگر آئی جی صاحب ناراض ہو گئے تو اللہ میاں مجھے اُن کے غضب سے بچا سکتا ہے لیکن اگر اللہ میاں ناراض ہو گئے تو آئی جی صاحب مجھے اللہ کے غضب سے نہیں بچا سکتے۔ اس لیے میں تو سچ بات کہہ کے رہوں گا چاہے آئی جی صاحب خفا ہو جائیں۔ میں نے اُس پولیس افیسر پر ہمیشہ رشک کیا ہے۔ اللہ کے کرم ہی سے تو یہ جذبہ بیدار رہتا ہے اور ماسوا اللہ کے کسی کا

خوف نہیں رہتا۔

وُہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

میں نے ستمبر ۱۹۶۸ء میں تہران جاکر آرسی ڈی میں شمولیت اختیار کی۔ اُدھر پاکستان میں اکتوبر ۱۹۶۸ء سے فیلڈ مارشل ایوب خاں کے خلاف تحریک شروع ہوگئی جو دِن بدن شدّت اختیار کرتی گئی اور مارچ ۱۹۶۹ء میں اُنھیں سبکدوش ہونا پڑا۔ یحییٰ خاں تشریف لائے اور اُن کے ہمراہ چیف آف سٹاف میجر جنرل ایس جی ایم ایم پیرزادہ۔

جنرل پیرزادہ ایوب خاں کے ملٹری سیکرٹری رہ چکے تھے اور ایوانِ صدر کے نشے سے آشنا تھے۔ میں نے پیرزادہ کا ایک غلط اور نامناسب حکم بجالانے سے انکار کیا تھا جس پر وہ دانت پیس کر رہ گئے تھے۔

ایوب خاں اپنی یادداشتیں روزانہ لکھنے کے عادی تھے۔ اس مقصد کے لیے وُہ اپنے تاثرات ایک نوٹ بک میں لکھتے جاتے۔ ایک نوٹ بک ختم ہوجاتی تو میرے حوالے کر دیتے اور نئی نوٹ بک شروع کر دیتے۔ ان نوٹ بُکس کے بارے میں وُہ بڑے محتاط تھے اور میرے کمرے میں صرف یہ دیکھنے کے لیے تشریف لاتے تھے کہ میں اُنھیں کہاں اور کس طرح رکھتا ہوں۔ پیرزادہ صاحب کو اِن نوٹ بُکس کی خبر ہوئی تو مجھے طلب فرمایا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد نوٹ بُکس دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اُن کے کہنے کے انداز سے ہی ظاہر ہوتا تھا کہ اُنھیں خود احساس ہے کہ وُہ غلط بات کا تقاضہ کر رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ پریزیڈنٹ کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

کچھ دنوں بعد پھر دہرایا۔ اِس دفعہ لہجہ تلخ اور حاکمانہ تھا۔ میں نے کہا بہت بہتر میں فیلڈ مارشل سے پُوچھ کر آپ کو ایک ایک کر کے سب نوٹ بُکس دکھا دُوں گا۔ فوراً بولے نہیں تم نہ پُوچھنا میں خود اُن سے بات کر لُوں گا۔ اِس کے بعد ناراض ہو گئے اور آخر تک ناراض رہے۔

اب جب وُہ یحییٰ خاں کے چیف آف سٹاف کی حیثیت سے ایوانِ صدر تشریف لے آئے تھے تو مجھے اپنے اختیارات کا نشانہ ضرور بنا سکتے تھے اور بناتے کیونکہ ان کی طبیعت میں کینہ تھا۔ چونکہ اللہ نے مجھے اُن کے شر سے محفوظ رکھنا تھا میرا دل اُن کے آنے سے پہلے ایوانِ صدر سے اُٹھ گیا۔ اللہ نے مجھے اراضی اور انعام و اکرام جیسی ترغیبات کے چنگل میں نہ آنے کی توفیق بخشی۔ ایوب خاں کے دل کو میرے لیے نرم کیا ورنہ وُہ میری ٹرانسفر پر NO کہہ دیتے تو میں کیا کر لیتا۔ مجھے بروقت محفوظ مقام پر بھیج دیا۔

شُکرِ ایں شکرہ از کُجا آرم بجا
ایں ہمہ از تست توفیق اے خُدا

آخری باب

گذشتہ ابواب میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۸ء تک تین سربراہان مملکت غلام محمد، سکندر مرزا، اور ایوب خاں کے پرسنل سٹاف پر کام کرتے ہوئے اپنے مشاہدات اور تاثرات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ تینوں بزرگ اِس دُنیا سے رُخصت ہو چکے ہیں۔ اُن کے نیک و بد اعمال کا فیصلہ تو اللہ کے اختیار میں ہے مگر اُن کے دورِ حکومت کے اثرات سے مُلک ابھی تک نجات نہیں پا سکا ہے۔ اِس باب میں اِن تینوں کے ادوار کا مختصر سا جائزہ لیتے ہیں تاکہ ہمیں اپنے تاریخی ارتقار کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

غلام محمدؒ

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

ناصبوری ہے زندگی دِل کی
آہ وُہ دل کہ ناصبور نہیں

غلام محمد پیدا ہی دِل ناصبور کے ساتھ ہوئے تھے اِس لیے زندگی بھر اندرونی کشمکش اور اضطرابِ مسلسل کے میٹھے درد میں مبتلا رہے۔ ۱۸۹۵ء میں لاہور کے ایک معمولی گھرانے میں جنم لیا۔ علی گڑھ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں انڈین اکاؤنٹس سروس میں شرکت اختیار کر تو لی مگر دلِ ناصبور کے ہاتھوں نباہ نہ کر سکے۔ کوچۂ سیاست کا رُخ کیا۔ ۱۹۳۱ء میں لندن میں ہونے والی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء تک دو برس بھوپال سٹیٹ میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۳۴ء میں دوبارہ گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازمت اختیار کی اور فنانس اور

سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان کی سب سے بڑی اور متمول ریاست حیدرآباد دکن میں وزیرِ خزانہ بنے اور ۱۹۴۶ء تک ریاست کے مالی امور کے سیاہ و سپید کے مالک رہے۔ اسی دوران حکومتِ برطانیہ نے "سر" کا خطاب دیا۔ ۱۹۴۴ء میں قائدِ اعظم کی فرمائش پر مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشی ترقی کے لیے ایک سکیم[1] تیار کی۔ ۱۹۴۶ء میں ریاست کی وزارت سے علیحدہ ہو گئے اور مسلم لیگ ہائی کمانڈ کے فیصلے کی تعمیل کرتے ہوئے "سر" کا خطاب واپس کر دیا۔ قیامِ پاکستان پر قائدِ اعظم نے اُنھیں ملک کا پہلا وزیرِ خزانہ بنایا۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے موقع پر مسلم اکثریت والے علاقے میں کسی بھی قابلِ ذکر صنعت کا وجود نہیں تھا۔ پنجاب جسے پورے ہندوستان کے لیے غلّے کی سپلائی کا ضامن سمجھا جاتا تھا تقسیم ہو گیا۔ پاکستانی پنجاب کے کئی اضلاع سیم و تھور کا شکار تھے۔ سندھ اور بلوچستان کو ریگستان اور سرحد کو پتھریلے پہاڑوں کا خطہ سمجھا جاتا تھا۔ دوسری طرف بنگال بھی تقسیم ہو گیا جس کے سبب پٹ سن کی صنعت مغربی بنگال میں رہ گئی اور مشرقی بنگال کے حصے میں دریاؤں کی طغیانیاں اور سمندروں کے طوفان آئے۔

ہندو اور فرنگی ماہرینِ اقتصادیات پاکستان کے منصوبہ کو ناقابلِ عمل اور مسلم قوم کو اقتصادی منصوبہ بندی سے عاری سمجھتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں راقم ریلوے بورڈ دہلی میں ملازم تھا اور ہمارے ہندو ساتھی برملا کہا کرتے تھے کہ مسلمانوں کے اپنے عقیدے کے مطابق اُن کا خُدا جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔ اس لیے جب مسلمانوں کے خُدا ہی کو حساب سے دلچسپی نہیں تو مسلمانوں کو حساب کتاب سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ ہندو اور فرنگیوں کو یقین تھا کہ چند ہی سالوں میں مسلمانوں کے دماغ ٹھکانے آجائیں گے اور وُہ ہندوستان میں دوبارہ شمولیت کی درخواست کریں گے۔

حضرت قائدِ اعظم رحمتہ اللہ کو ان کوائف سے مکمل آگاہی تھی اور اپنی قوم میں

---

[1] An uplift Plan for Indian Muslims

جوہرِ قابل اُن کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اُن کی مومنانہ فراست، یقینِ محکم اور ایمانِ کامل اُنھیں پاکستان کے روشن مستقبل کی بشارت دیتے تھے۔ پاکستان کی پہلی کابینہ تشکیل دیتے وقت اہم ترین اور مشکل ترین وزارت کے لیے قائداعظم کا انتخاب غلام محمد کی صلاحیتوں کا کھلا اعتراف تھا۔

پہلا متوازن بجٹ پیش کر کے غلام محمد نے ہندو اور فرنگی ماہرین کے سب مفروضے غلط کر دکھائے۔ پاکستان کے اپنے بنک قائم ہوئے۔ صنعتی اور دیگر ترقیاتی اداروں کی بنیاد رکھی گئی اور چار برس تک مسلسل متوازن بجٹ پیش کرتے رہے۔ یہ کارنامے انجام دیتے ہوئے اپنے دلِ ناصبور کے ہاتھوں غلام محمد کو جسم و جان کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ فشارِ خون ناقابلِ پیمائش حد تک اُوپر چلا گیا۔ فالج کے شدید حملے کے بعد غلام محمد راولپنڈی میں ابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے تھے کہ لیاقت علی خان کی ناگہانی شہادت پر الحاج خواجہ ناظم الدّین نے گورنر جنرلی پر وزارتِ عظمیٰ کو ترجیح دی اور اپنی جگہ غلام محمد کو گورنر جنرل نامزد کر دیا۔

یہ دونوں بزرگ محبِ وطن اور دیانتدار تو تھے مگر دونوں کے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ اور عمل کرنے کی صلاحیت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ غلام محمد بے حد فعال، سیماب پا اور ملک کی اقتصادی بنیادوں کا بانی مگر الحاج خواجہ ناظم الدّین تن آسان اور قائدانہ صلاحیتوں سے یکسر تہی دامن تھے۔ ملک کے سربراہ اور حکومت کے سربراہ میں ہم آہنگی نہ ہو تو کاروبارِ مملکت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اقتصادی منصوبہ بندی کے ماہر کی آنکھوں کے سامنے مگر اُن کے اور وزیرِاعظم کے درمیان رابطہ اور تعاون کے فقدان کے سبب ملک کی معیشت تباہی کے دہانے تک پہنچ گئی۔[۱] ۱۹۵۳ء میں اینٹی قادیانی تحریک سے نمٹنے کے لیے خواجہ ناظم الدّین نے جب کہ غلام محمد ملک سے باہر سعودی عرب

---

[۱] وہی عوام جنھوں نے شہیدِ ملّت لیاقت علی خاں کو قائدِ ملّت کا خطاب دے رکھا وہ خواجہ ناظم الدّین کو قائدِ قلّت کہنے لگے تھے۔

کے سرکاری دورے پر تھے لاہور کو مارشل لا کے حوالے کر دیا اور فوج پہلی دفعہ شہری نظم و نسق کی "لذت" سے آشنا ہوئی۔ اگلے سال یعنی ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کا کباڑہ ہوگیا اور جگتو فرنٹ کی کامیابی نے دستور ساز اسمبلی کی نمائندہ حیثیت کو چیلنج کر دیا۔ گورنر جنرل کو وزیر اعظم کی نا اہلی کی بنا پر سبکدوش کر دینا اور دستور ساز اسمبلی کو توڑ دینا "غیر جمہوری اور غیر اخلاقی" اقدام سہی مگر سربراہ مملکت خاموش تماشائی بنا رہتا تو انارکی کیا رنگ لاتی۔ یہ بات بھی غور طلب ہے۔ سیاسی عمل میں سیاستدان کلیدی رول ادا کرتے ہیں اور جب سیاست دان آپس میں دست و گریبان ہوں تو خانہ خالی را دیو می گیرد والی صورت ہو کے رہتی ہے۔

غلام محمد کو عوام میں ہر دل عزیزی کی فکر کبھی دامن گیر نہ ہوئی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انھوں نے لوگوں سے ووٹ نہیں مانگنے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے لیے کسی پی آر او کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا تھا۔ البتہ اپنے دور کے آخر میں ایک مرنجا مرنج قسم کے بزرگ سید وہاج الدین احمد جو ہمیشہ امریکی طرز کی بوٹائی پہنے رہتے تھے، گورنر جنرل ہاؤس میں پریس اتاشی مقرر کیا جن کی ذمہ داری صرف اخبارات کے اداریوں پر مشتمل ایک مختصر نوٹ تیار کر کے گورنر جنرل کو پیش کرنا تھی۔

سب سے زیادہ جن عوامل نے غلام محمد کی کردار کشی کو ہوا دی وہ میری نظر میں دو تھے۔ اوّل یہ کہ اُن کی پیدائش پنجاب میں ہوئی تھی اور انھیں اس "جرم" کی سزا بھگتنا تھی۔[1] دوم اُن کی تند مزاجی تھی جس سے علاقائی تعصب کے مریضوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور غلام محمد کے بارے میں خوب خوب قصے گھڑے اور پھیلائے۔ جھوٹ میں تھوڑا سا سچ ملا دیا جائے تو رنگ "چوکھا" آتا ہے۔ چنانچہ جس شخص نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پوری زندگی لکھنؤ، دہلی اور حیدر آباد (دکن) میں گزاری ہو اُس کے متعلق مشہور کیا گیا کہ ہر کس و

---

[1] صوبائی تعصب اور بالخصوص پنجاب کے خلاف بغض و عناد کی تاریخ پرانی ہے مگر صاحبانِ اقتدار نے اس کا تدارک نہ کیا۔ اب جب ہمارے شہر کراچی کو اس عفریت نے اپنی لپیٹ میں لیا ہے تو بھائی چارے کی "اپیلیں" شروع ہیں۔

ناکس کو اور موقع بموقع پنجابی زبان میں ماں بہن کی غلیظ گالیوں سے نوازتا رہتا ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

نگاہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز

یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

غلام محمد ایسا میر کارواں تھا جو نگاہِ بلند اور جاں پُرسوز کی دولت سے مالامال تھا۔ البتہ سخن دل نواز کی نعمت سے محروم تھا۔ فالج کی وجہ سے گفتگو کے دوران الفاظ کی ادائیگی میں لڑکھڑاہٹ اُن کی جسمانی معذوری تھی جس پر وُہ قابو پانا چاہتے تھے مگر مجبور تھے۔ لب ولہجہ کی سختی اُن کی طبعی معذوری تھی جس پر اگر وُہ قابو پانا چاہتے تو کوئی مجبوری نہ تھی۔ وُہ ہمیشہ سے تند خو اور سخت گیر تھے اور اپنے ابدی دستور کے مطابق "زمانہ سخت گیراں را سخت تر می گیرد"۔ شیریں سخنی اور نرم مزاجی بڑی چیز ہے۔ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۵۹ میں اللہ تعالیٰ نبی اکرمؐ سے خطاب فرما ہیں:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۪

ترجمہ: یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم اِن لوگوں کے لیے بڑے نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔

میجر جنرل سکندر مرزا

پاکستان کے آخری گورنر جنرل سکندر مرزا اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پہلے صدر مملکت، میجر جنرل سکندر مرزا نے پیش ازیں عملی سیاست میں کبھی حصّہ نہ لیا تھا تاہم انڈین پولیٹیکل سروس میں تربیت یافتہ ہونے کے سبب تخریبی سیاست اور در پردہ جوڑ توڑ میں مہارتِ تامّہ حاصل کر رکھی تھی۔ بری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خاں سے دیرینہ دوستی تھی جس سے دونوں کو فائدہ پہنچتا رہا تھا۔ ایوب خاں نے غلام محمد سے سفارش

کر کے سکندر مرزا کو پہلے مشرقی پاکستان کا گورنر جنرل پھر وفاقی وزیر داخلہ اور امورِ کشمیر بنوایا تھا۔ یہی وُہ زینہ تھا جسے استعمال کر کے سکندر مرزا کے لیے گورنر جنرل اور صدرِ پاکستان بن جانا آسان ہو گیا تھا۔ سرحدی گاندھی فیملی کے چشم و چراغ اور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر خان صاحب کو سکندر مرزا پہلے ہی اسیری سے نکلوا کر وزیری دلوا چکے تھے۔

جو حکومت خلوص اور حکمت سے عاری ہو وُہ ملک اور قوم پر بھاری ہوتی ہے۔ سکندر مرزا کی صدارت کے تین برس مملکتِ خداداد پاکستان پر بہت بھاری ثابت ہوئے۔ جس تن آسانی اور سہولت سے ملک کی صدارت چار سال کے لیے اُن کے قبضہ میں آ گئی تھی اُس سے اُن کے عزائم کو مہمیز ملی اور وُہ دائمی اقتدار کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ اس خواب کی تکمیل کے لیے دو ہی طریقے تھے۔ تاحیاتِ صدارت یا پاکستان میں جمہوریت کی آڑ میں بادشاہت کا قیام۔ منصوبہ بندی کے مطابق جمہوری اداروں اور جمہوری سیاستدانوں کو رسوا کرنا اور پارلیمانی طرزِ حکومت کو ناکام کرنا ضروری تھا۔ تین برسوں میں جب پانچ عدد وزیراعظم باری باری خرچ کر چکے تو کنٹرولڈ ڈیماکریسی کی ضرورت کی طرف اشارے کیے گئے تاکہ ایک مضبوط اور کل وقتی کنٹرولر کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ پاکستان کے ایک طرف افغانستان اور دُوسری طرف ایران دونوں برادر اسلامی ممالک اور دونوں میں مستحکم بادشاہت چلی آ رہی تھی۔ اِن ممالک سے ملحقہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں پارلیمانی حکومت کو عدمِ استحکام کے جان لیوا مرض میں مبتلا کر کے فرق کو صاف ظاہر کرنا اور ممکنہ علاج کی نشاندہی کرنا مقصود تھا۔ اگر یہ منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے تو اگلی منزل کے لیے فضا سازگار ہو جاتی تھی۔ چنانچہ افغانستان، ایران اور پاکستان کے درمیان کنفیڈریشن کا خوشنما آئیڈیا (Idea) اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ ایران اور پاکستان میں امریکہ کا بول بالا تھا جب کہ افغانستان میں روسی اثر و نفوذ سرایت کر رہا تھا۔ اس لیے اس منصوبہ کو امریکہ کی سو فیصد سپورٹ حاصل تھی۔ اُن دنوں کابل میں پاکستان کے سفیر محمد اسلم خان خٹک ———————— تھے۔ اُن سے موصول شدہ پیغامات کے مطابق ظاہر شاہ کنفیڈریشن کے حامی تھے مگر سردار محمد داؤد خان اور

سردار شاہ ولی خاں ذہنی تحفظات رکھتے تھے۔ ظاہر شاہ اور رضا شاہ پہلوی دونوں کی مادری اور پدری زبان فارسی تھی۔ ناہید خانم کی وجہ سے سکندر مرزا کی گھریلو زبان بھی فارسی تھی۔ میاں بیوی کے شب و روز خوب گزر رہے تھے اور مستقبل درخشاں نظر آ رہا تھا۔ ناہید خانم کو اپنے شوہر پر "فل کنٹرول" حاصل تھا اور زن و شوہر خوابوں کی دُنیا میں محوِ سفر تھے۔ قافیہ اور ردیف بھی درست دکھائی دیتا تھا یعنی اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ والیِ افغانستان، اعلیٰ حضرت محمد رضا شاہ پہلوی شاہنشاہِ ایران اور اعلیٰ حضرت مرزا سکندر شاہ حاکم پاکستان باری باری کنفیڈریشن کی صدارت کے فرائض انجام دینے کا حسین خواب دن کو بھی دکھائی دیتا تھا۔ پاکستان کے ظلِ سبحانی کی مدد و معاونت کے لیے ایران نژاد خاتون سرگرم تھیں۔ مگر تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔ منزل قریب آتی نظر آ رہی تھی کہ خاں عبدالقیوم خاں نے رنگ میں بھنگ ڈال دی اور چالیس میل لمبا مسلم لیگی جلوس نکال کر مسئلہ کھڑا کر دیا۔ خوف زدہ ہو کر سکندر مرزا کو مارشل لاء کی سوجھی۔

سات اکتوبر ۱۹۵۸ء کو مارشل لاء نافذ ہوا لیکن ۲۷ اکتوبر تک کے بیس دن سکندر مرزا کے لیے عذاب کے دن تھے۔ ایک طرف اُن کے مقرر کردہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے مختارِ کُل بنتے ہی صدرِ پاکستان کے اشاروں پر رقص کرنے سے معذوری کا اظہار کر دیا تھا اور دُوسری طرف اُن کی نصف بہتر نے گھر کا سکون چھین لیا تھا۔ صدر کے پرسنل سٹاف نے میاں بیوی کے درمیان اِس قسم کی چخ چخ پہلے کبھی سنی یا دیکھی نہ تھی۔ اُوپر برآمدے میں بیگم صاحبہ کی گرج چمک ہمیں نیچے اپنے کمروں تک پہنچتی تھی۔ بیگم صاحبہ کو شکوہ تھا کہ ایوب خاں کو ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بناتے اور خود چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنتے تاکہ کمانڈ اپنے ہاتھ میں رہتی لیکن سکندر مرزا اپنے ہاتھ خود کاٹ کر ایوب خاں کے حوالے کر چکا تھا پھر بھی اُس نے ایک دُوسرا وار کرنے کی ٹھان لی۔ وُہ سمجھتا تھا کہ عشق میں جو اندھا ہوتا ہے اور جنگ میں جو اندھا کر دیتا ہے سب جائز ہے۔ سراسیمگی کی حالت میں ایوب خاں کو پاکستان ایئر فورس کے بیس کمانڈر کے ذریعہ حراست میں لینے کا منصوبہ بنایا لیکن عجلت میں بنائے گئے منصوبے میں مناسب پیش بندی نہ ہو سکی اور ملٹری انٹیلی جنس کو

خبر ہو گئی۔ موجودہ سینیٹر بریگیڈیئر محمد حیات ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس تھے۔ انہوں نے بروقت ایوب خاں کو خبردار کر دیا اور سکندر مرزا کا یہ آخری حربہ بھی ناکام رہا۔

سکندر مرزا تاش کے پرانے کھلاڑی تھی لہٰذا اُن میں سپورٹس مین سپرٹ کی کمی نہ تھی۔ جوئے میں ہار جیت تو ہوتی ہے۔ سکندر مرزا بازی ہار چکے تھے۔ ستائیس اور اٹھائیس اکتوبر کو رات گیارہ بجے ایوب خاں کی طرف سے جنرل واجد علی برکی، جنرل محمد اعظم خاں اور جنرل خالد محمود شیخ نے تخت و تاج سے دست برداری پر دستخط کرنے کی "درخواست" کی تو سکندر مرزا نے، بقول جنرل شیخ، مسکراتے ہوئے اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ اُن کی مسکراہٹ کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ڈنر کے وقت وہسکی کی روزانہ خوراک کی بدولت وُہ حالتِ سُکر میں ہوں یا اُن پر راضی برضا والی کیفیت طاری ہو چکی ہو۔ اِس کے علاوہ اُنھیں نہ صرف جان و مال کی امان کا یقین دلا دیا گیا تھا بلکہ سول سرونٹ اور صدر پاکستان کی پنشنوں کی بھی ایوب خاں کی طرف سے یقین دہانی کرائی گئی تھی البتہ اصل ٹریجڈی ناہید خانم کے ساتھ ہوئی کہ ملکہ نورجہاں ثانی کہلانے کا غنچہ اُمید بن کھلے مرجھا گیا تھا۔

فیلڈ مارشل ایوّب خاں

میجر جنرل سکندر مرزا نے مارشل لاء نافذ کیا تو پہلا شکار وُہ خود ہوئے اور دُوسرا شکار اُن کے مقرر کردہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ایوب خاں دونوں بزرگ ایک دوسرے کے ہاتھوں ہلاک ہوئے ایک اقتدار سے ہاتھ دھو کر اور دُوسرا ہاتھ دھو کر اقتدار سے چمٹے رہنے کی پاداش میں۔

مارشل لاء ہمارے دین سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے یا مطابقت رکھتا بھی ہے۔ میں بس کا تعین مرد ہی ہم و دانش کا فریضہ ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ فرما کر دین کی خاطر کسی پر جبر کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا تو دُنیا کی خاطر خلقِ خُدا کو جبر کے ذریعہ اپنی اطاعت پر مجبور کرنا کہاں روا ہو سکتا ہے۔

دُوسری صدی ہجری میں امام مالکؒ نے فتویٰ دیا تھا کہ جبری طلاق حرام ہے۔۔

اس فتویٰ سے نتیجتاً جبری بیعت کی مخالفت بھی نکلتی تھی۔ حکومت مخالف ہوگئی۔ امام مالکؒ گرفتار ہوئے، تشہیر کی گئی۔ کوڑے لگے مگر کوڑے کی ہر ضرب پر جب تک زبان چلتی رہی یہی کہتے رہے "میں مالک بن انس فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری حرام ہے۔"

بانگ درا میں اقبالؒ کی ایک نظم محاصرہ ادرنہ کے عنوان سے ہے۔ ادرنہ بلغاریہ کی سرحد کے قریب ترکی کا ایک شہر ہے جس کا محاصرہ عیسائی افواج نے کر رکھا تھا۔ شہر کی آبادی میں مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور نصرانی بھی تھے۔ محاصرہ طویل ہوتا گیا اور فوج کے لیے خوراک کے ذخائر ختم ہو گئے۔ شہر کے دفاع کو ممکن بنانے کیلئے ترک سپہ سالار (شکری) کو آئینِ جنگ یعنی مارشل لاء کا اعلان کرنا پڑا جس کی رو سے جس شہری کے پاس بھی غلہ تھا اُسے فوجی حکام اپنے قبضے میں لے سکتے تھے۔ نظم کے آخری تین اشعار یہ ہیں:

لیکن فقیہہِ شہر نے جس دم سُنی یہ بات
گرما کے مثل صاعقہ طور ہو گیا
ذمی کا مال لشکرِ مسلم پہ ہے حرام
فتویٰ تمام شہر میں مشہور ہو گیا
چھوتی نہ تھی یہود و نصریٰ کا مال فوج
مسلم خُدا کے حکم سے مجبور ہو گیا

ہمارے ہاں پاکستان میں مارشل لاء کی اپنی تاریخ ہے یہاں تک کہ ہماری پوری ایک نسل یہ کہنے میں حق بجانب ہوگی کہ تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں اللہ کے فضل سے مجبور ہو جانے کا رواج نہیں ہے بلکہ اللہ کے حکم کی آڑ میں خلق خُدا کا استحصال ہوتا رہا ہے حتیٰ کہ ہم نے دین کا استحصال کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ کبھی علماء کنونشن، کبھی مشائخ کنونشن، کبھی یہ کنونشن کبھی وہ کنونشن، اس دوران فقیہانِ حرم پر کبھی سکوت طاری رہا۔

یہ "حضرت" گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا۔

وفاقی شرعی عدالت کے ایک سابق سربراہ جسٹس آفتاب حسین نے اپنے انٹرویو میں جسے روزنامہ نوائے وقت نے ۱۵ جنوری ۱۹۸۶ء کو شائع کیا تھا فرمایا کہ وفاقی شرعی عدالت کے ججوں پر دباؤ ڈال کر حکومت اپنی مرضی کی شرع نافذ کرنا چاہتی ہے۔ اس انٹرویو کی اشاعت سے چند روز پہلے نوائے وقت میں عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) کے ایک سابق سربراہ جسٹس انوار الحق کا بیان چھپا تھا کہ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۵ء تک کے مارشل لاء کے نو سال عدل وانصاف کا بدترین دور تھا۔[1] اس سے بڑی نحوست کیا ہو گی کہ مارشل لاء کے محراب ومنبر سے نیکی کی تلقین بھی نیکی کی طرف رغبت نہیں دلاتی اور بدی پھلتی پھولتی رہتی ہے۔

ایوب خاں بلاشبہ ایک شریف الطبع انسان تھے۔ وہ اپنی شخصی وجاہت اور جامہ زیبی کی وجہ سے اپنے دیگر ہم عصر سربراہانِ مملکت کے درمیان ہمیشہ ممتاز رہے۔ ملک کے پہلے پاکستانی کمانڈر انچیف ہونے کا شرف حاصل تھا۔ وہ اس اعزاز پر نازاں تھے اور اسے اپنے کیریر کی معراج سمجھتے تھے۔ بری فوج کے سربراہ ہوتے ہوئے دفاعی نقطۂ نظر سے ملک کے اندرونی استحکام کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد پاکستان عدم استحکام کا شکار ہوتا ہوا نظر آنے لگا تو ایک محبِ وطن اور ذمہ دار پاکستانی کی طرح مسائل کے بارے میں اُن کا غور وفکر قابلِ فہم تھا۔ عسکری تربیت کے مطابق اپنی سوچ کو ضبطِ تحریر میں لے آنے کے عادی تھے۔ ۱۹۵۴ء میں لندن کے ایک ہوٹل میں فرصت کے اوقات میں اُنھوں نے جو مضمون تحریر کیا اُس میں اُن کے خیال کے مطابق مندرجہ ذیل اقدام پاکستان کے سیاسی استحکام کے لیے ناگزیر تھے۔

ا : مغربی پاکستان میں موجودہ صوبوں کی الگ ہیئت کو ختم کر کے اُنھیں ایک یونٹ میں تبدیل کر دیا جائے۔

ب : مغربی پاکستان کے ایک یونٹ میں پنجاب اپنی آبادی کے تناسب کی بجائے چالیس فی صد نمائندگی قبول کر لے۔

---

[1] یہ دونوں حضرات بیانات دیتے وقت سابق تھے۔

ج : ذرائع آمد و رفت اور مقامی ضروریات کے مطابق مشرقی اور مغربی پاکستان کے دونوں صوبوں کو ڈویژنوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ نظم و نسق میں انتظامیہ کو اور اپنے مسائل کے حل میں عوام کو آسانیاں حاصل ہوں۔

د : مشرقی اور مغربی پاکستان کو وفاق میں مساوی حیثیت کی آئینی ضمانت ہونی ضروری ہے۔

اِن تجاویز کو تحریر کرنے تک ایوب خاں کے دل و دماغ سیاسی عزائم سے آلودہ نظر نہیں آتے۔ پوری دیانتداری سے جو سمجھتے تھے اُنھوں نے اُسے تحریر کر دیا تھا۔ اگر اُنھیں سیاسی اقتدار کی ہوس ہوتی تو فوراً بعد پاکستان واپسی پر اکتوبر ۱۹۵۴ء میں غلام محمد کی پیش کش کو کیوں ٹھکرا دیتے ؟ اُنھوں نے اس دل کش پیش کش کو قبول نہ کیا اور غلام محمد کے اصرار پر ایک سیاسی شخصیت (محمد علی بوگرا) کی زیر قیادت وزارتِ دفاع کی ذمہ داریاں قبول کر لیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنی تحریر کردہ تجاویز وزیر اعظم کے حوالے کر دیں۔ اگر اُن کی نیّت میں کھوٹ ہوتا تو وُہ اپنی دماغی کاوش کو اپنے پاس محفوظ رکھتے تاکہ مناسب وقت اور موقع ملنے پر سارا کریڈٹ خود لے لیں۔ ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان میں اُن کی تجویز کے مطابق وَن یونٹ قائم ہونے کے بعد بھی اُنھوں نے کبھی اس بات کا کریڈٹ لینے کا دعویٰ نہ کیا کیونکہ اُن کے سامنے ملکی مفاد تھا اپنی ذاتی تشہیر نہ تھی۔ پاکستان کا پہلا آئین تیار ہو کر نافذ ہوا اور ملک میں سیاسی استحکام کی اُمید پیدا ہوئی تو وُہ وزارتِ دفاع سے علیحدہ ہو کر واپس جی ایچ کیو چلے گئے کیونکہ اُن کے خیال میں ملک کے لیے صحیح سمت متعین ہو چکی تھی اور اب سیاست دانوں کا کام تھا کہ ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔ وزیر دفاع کی پوزیشن سے برضا و رغبت Demote ہو کر ایک سیاستدان کو وزارت سپرد کر کے اُس کے ماتحت چلے جانا ایوب خاں کی نیک نیتی کی ایک اور دلیل تھی۔

۱۹۵۸ء میں سکندر مرزا نے ایوب خاں کو کراچی بلوا کر تخلیہ میں جب مارشل لاء نافذ کرنے کے فیصلہ سے آگاہ کیا تو ایوب خاں نے، بقول اُن کے، سکندر مرزا کو ایسا سنگین قدم اُٹھانے سے منع کرنے کی کوشش کی جس طرح وُہ چار برس پہلے غلام محمد کو

3

پوری طرح ہوا کریں گے۔ اور ان کے لئے کسی کو لاہور یا
راولپنڈی کے چکر نہیں لگانے پڑیں گے۔

البتہ ایک ایسا طبقہ ضرور ہے جس کا دارالحکومت
کے ساتھ سیاسی یا معاشی مفاد وابستہ تھا۔ ایسے
لوگوں کو خوش کرنا آسان کام نہیں۔ قوم کی بہتری اسی میں
ہے کہ سرکاری محکمے اور بڑے بڑے تجارتی اور صنعتی ادارے
ایک دوسرے کے اثر سے آزاد رہ کر اپنا اپنا کام کریں۔
ورنہ اس میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہونے کا خطرہ ہے X.

چنانچہ جب کوئی آپ کے سامنے دارالحکومت کے
متعلق بات کرے، تو آپ یہ ضرور سوچیں کہ وہ کس
نظریے سے یہ بات کر رہا ہے۔ اگر وہ یہ بات کسی سیاسی
یا ذاتی غرض سے کر رہا ہے تو یہ محض انتشار کی بات
ہے۔ ورنہ جہاں تک کراچی کی ترقی کا تعلق ہے،
دارالحکومت جانے کے بعد اس میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ کمی
نہ تو ہوئی ہے اور نہ ہی انشاء اللہ ہوگی۔ مثال کے طور پر
[illegible] شہری مہاجرین کی آبادکاری کے لئے جتنا خرچ
اور کام کراچی میں ہو رہا ہے اتنا سارے پاکستان
میں اور کہیں نہیں ہوا۔ اسی طرح تجارتی انڈسٹریل
اور تعمیری منصوبوں میں بھی کراچی کا نمبر باقی سب

X No [illegible] People [illegible]

X. Look at the amount of [illegible]

باز رکھ سکے تھے۔ مگر غلام محمد اور سکندر مرزا میں ایک بنیادی فرق تھا۔ غلام محمد ملک کی باگ ڈور ایوب خاں کے حوالے کر کے خود سبکدوش ہو جانا چاہتے تھے جب کہ سکندر مرزا کے ارادے ایسے نہیں تھے۔ وُہ ایوب خاں کے ذریعے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے خواہشمند تھے۔ عجیب بات ہے کہ ۱۹۵۴ء میں ایوب خاں نے مختارِ کُل بننے سے انکار کر دیا تھا مگر ۱۹۵۸ء میں سکندر مرزا کی صدارت میں ثانوی حیثیت قبول کر لی۔ ممکن ہے اُنھوں نے سکندر مرزا کے عزائم کو بھانپ لیا ہو اور اسی لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر سکندر مرزا سے یہ شرط منوالی ہو کہ صدرِ پاکستان اپنے مقرر کردہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی ذمہ داریوں میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔ سکندر مرزا اگر اپنے وعدے پر قائم رہتے ہوئے عہدہ صدارت پر قناعت کیے رہتے تو ایوب خاں کو طریق کار گوارا تھا۔ مگر سکندر مرزا جلد آپے سے باہر ہو گئے۔ ہو سکتا ہے کہ وُہ کچھ دیر اور صبر کیے رہتے مگر اُن کی بیگم اُن کی جان کو آئی ہوئی تھیں۔ ایوب خاں نے آخر دم تک سکندر مرزا سے دوستی نبھانے کی کوشش کی مگر اُن کے رفقائے کار اَڑ گئے کہ سکندر مرزا کے خلاف کارروائی نہ کی گئی تو خانہ جنگی کا خدشہ ہے۔

بہر حال ایوب خاں نے جس لگن، خلوص اور جذبے سے اپنی حکومت کا آغاز کیا تھا اُس سے اندازہ ہوتا تھا کہ بہت جلد ملک کی کایا پلٹنے والی ہے۔ ہمہ جہتی اصلاحات کے نفاذ کی غرض سے مختلف کمیشن قائم کیے۔ ان میں سرفہرست زرعی اصلاحات تھیں جس کے لیے ایوب خاں بہت سرگرم نظر آتے تھے اور جب بجا طور پر جملہ امراض کیلئے امرت دھارا تصوّر کیے ہوئے تھے۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور ٹھوس حقائق سامنے آنا شروع ہوئے اُن کا جوش اور جذبہ ٹھنڈا پڑتا گیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جوش و جذبہ تو ٹھنڈا پڑتا گیا مگر اقتدار میں رہنے کی ہوس اُسی تناسب سے پیدا ہوتی اور بڑھتی چلی گئی۔ جس بیماری کی وجہ سے سکندر مرزا کی ہلاکت ہوئی تھی اُسی بیماری میں ایوب خاں مبتلا ہو گئے۔ بامِ عروج تک اُن کی رسائی مارشل لا کی بدولت ہوئی تھی وہی مارشل لا اُن کے گلے کا ہار بن گیا۔ آج بھی کیفیت یہ ہے کہ ایوب خاں کا نام یاد آتے ہی مارشل لا،

ذہن میں آجاتا ہے اور مارشل لاء کا ذکر آئے تو ایوب خاں فوراً نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مارشل لاء کا اصل بانی مبانی سکندر مرزا مکمل طور پر ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے۔

خوش قسمتی سے ایوب خاں کو ایک ایسا ساتھی میسر تھا کہ جس کے ذمہ انھوں نے جو بھی کام سونپا اُس نے نہایت سرعت اور جاں فشانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لیا۔ یہ ساتھی جنرل محمد اعظم خاں تھے۔ مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ سیاست اور ذاتی مفاد کی نذر ہو کر بُری اُلجھ چکا تھا۔ جنرل اعظم خاں نے جس جذبے اور تن دہی سے مہاجرین کی مستقل آبادکاری کی تکمیل کی وہ اُنھی کا حصّہ تھا۔ جنرل اعظم خاں مشرقی پاکستان بھیج دیے گئے تو وہاں لوگوں کے دل جیت لیے۔ وہ مارشل لاء دور کی مقبول ترین شخصیت کے رُوپ میں اُبھرے تو ایوب خاں کے دُوسرے ساتھیوں نے انھیں ڈرا کر خوف زدہ کر دیا اور ایوب خاں اعظم جیسے عظیم سرمائے سے محروم ہو کر نااہل اور خوشامد پیشہ حلقہ بگوشوں کے اسیر ہو کر رہ گئے۔

ایوب خاں خود راسخ العقیدہ مسلمان تھے مگر اُن کے وزیر خارجہ منظور قادر صاحب ایک آزاد خیال دانشور ہونے کی شہرت کے حامل تھے اور انھوں نے بہت جلد مارشل لاء حکومت کے برین ٹرسٹ کی حیثیت اختیار کر لی۔ انھوں نے ایوب خاں کو قائل کر لیا کہ مذہب ایک ذاتی مسئلہ ہوتا ہے اور حکومت کے معاملات میں مذہب کا عمل دخل بلکہ ضرورت سے زیادہ ذکر اذکار بھی قوم کی صحت کے مضر ثابت ہو سکتا ہے اور نیز یہ کہ پاکستان کی ترقی ترکی کے نقشِ قدم پر چلنے میں مضمر ہے۔ وزیر داخلہ جنرل کے ایم شیخ جناب منظور قادر کے ہمنوا نکلے اور دونوں نے مل کر سیکولرزم کا پرچار کرنا شروع کر دیا۔ قومی پریس نے فوراً اس فتنہ کا نوٹس لیا تو حکومت نے حاکمانہ طریقہ سے پریس کو دبانے کی کوشش کی۔ یہ ۱۹۵۹ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے جب مارشل لاء کا دبدبہ اپنے عروج پر تھا اور سیاست دان مہر بر لب تھے۔ مغربی پاکستان کے چیف سیکرٹری اور نوائے وقت کے مدیرِ اعلیٰ کے درمیان اِس سلسلے میں ہونے والی بات چیت کا ذکر

قدرت اللہ شہاب کے نام ایک خط میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے کیا تھا۔ اس خط کے متعلقہ حصّہ کی فوٹو کاپی ان صفحات میں شامل ہے۔ اس واقعہ کے بعد دونوں وزرائے کرام نے چُپ سادھ لی اور ایوب خاں کو ایک پبلک اجتماع میں یہ اعلان کرنا پڑا تھا کہ پاکستان ایک روحانی اور اخلاقی عقیدے کا نام ہے اور اسلام کے سوا پاکستان کے آئین کی کوئی دُوسری اساس نہیں قرار دی جاسکتی۔

ایوب خاں کا البتہ ایک فیصلہ ایسا بھی تھا جسے علمائے کرام کے ایک محدود طبقے نے مداخلت فی الدّین قرار دے کر خوب دھول اڑائی۔ اگر اُس وقت کی انٹیلی جنس رپورٹ کو دُرست تسلیم کیا جائے تو دلچسپ پہلو یہ تھا کہ علمائے کرام منبر پر ان قوانین کے خلاف تقاریر کرنے کے بعد جب اندرونِ خانہ تشریف لے جاتے تو قوانین کے حق میں اپنی زوجۂ محترمہ یا زوجین کی پرشور تقاریر سے جھنجھلا کر رہ جاتے۔ یہ جراُت مند فیصلہ عائلی قوانین کا نفاذ تھا جو آج بھی جاری وساری ہیں اور جنھیں آنے والی کوئی حکومت بھی کالعدم قرار نہ دے سکے گی۔ پاکستانی خواتین بجا طور پر ایوب خاں کو اپنا محسن سمجھتی ہیں۔

زرعی اور صنعتی میدان میں جتنی ترقی ایوب خاں کے عہدِ حکومت میں ہوئی اس کا عشرِ عشیر بھی نہ "عوامی" دَور میں ممکن ہو سکا اور نہ "اسلامی" دور میں۔ دانش وروں اور بزرجمہروں کی رائے میں جو بھی ہو شہروں میں بالعموم اور دیہات میں بالخصوص ایوب خاں کے نام کو عزت و تکریم حاصل ہے۔ اگر ایک طرف کسی دانشور کی طرف سے یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ ایوب خاں کی نعش کو قبر سے نکال کر دار پر لٹکایا جائے تو دُوسری طرف سادہ دل اور سادہ لوح عوام کی طرف سے ٹرکوں کی پُشت پر ایوب خاں کی قدِ آدم تصویر اور اُس کے نیچے فلمی گیت کا مصرع "تیرے جانے کے بعد تیری یاد آئی" ہمیں اُس دَور کی یاد دلاتا ہے۔

ایوب خاں کے وہ اقدام جو بہت زیادہ تنقید کا نشانہ بنے وہ بنیادی جمہوریت کا ادارہ صدارتی انتخاب کے لیے الیکٹرل کالج کے طور پر استعمال ہونا تھا اور ایوب خاں خود صدارتی اُمیدوار تھے، اس لیے اِس طریق کار میں ذاتی مفاد کی بُو آتی تھی۔ اگرچہ ایوب خاں

کی اپنی ذات اِن دو امور کے ساتھ وابستہ نہ ہوتی تو عوامی ردِ عمل مختلف بھی ہو سکتا تھا۔

انھی صفحات میں ہم ایوب خاں کی اپنی تحریر کے ایک ورق کی عکسی تصویر شامل کر رہے ہیں۔ ایوب خاں اُردو بہت کم لکھتے تھے اس لیے اُن کی اُردو تحریر میں املا کی اغلاط قابلِ فہم ہیں۔ اِس تحریر میں انھوں نے نمایاں کارناموں کی تفصیل بتائی ہے جس میں جہاں اُن کا خلوص جھلکتا ہے وہاں دُکھ کا اظہار بھی نمایاں ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اُن کی خدمات کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ ایک بات بالکل واضح ہے کہ اُن کے تحریر کردہ کارنامے سب کے سب مارشل لاء کے ابتدائی سالوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے تھے یعنی ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۱ء تک اِس کے بعد تو گویا چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ۱۹۶۲ء میں اُنھوں نے مارشل لاء اُٹھا کر اپنے سیاسی دور کا آغاز کیا یا بالفاظِ دیگر اپنے ناکام دَور کی ابتداء کی۔ جس سیاست کاری کو وُہ ریاکاری سے تعبیر کیا کرتے تھے اُس سیاست کی دلدل میں ایسے اُلجھے کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن اور اس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی۔ آل پاکستان مسلم لیگ کی پیوند کاری، ۱۹۶۴ء میں محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلہ میں صدارتی انتخاب، ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ، ۱۹۶۶ء میں سفر تاشقند، اگلے دو سالوں میں ایک طرف سیاست دانوں کی بھرمار، دوسری طرف یحییٰ خاں کی یلغار اور درمیان میں ایوب خاں ریت کی دیوار۔ انگریزی محاورے کے مطابق ایوب خاں نے خود کو Between the Devil and the Deep Sea. پایا۔ ستم یہ کہ ڈیول جیت گیا۔

ایوب خاں اصلاحات کی تکمیل کے فوراً بعد یا زیادہ سے زیادہ ۱۹۶۲ء میں بنیادی جمہوریت اور صدارتی نظامِ حکومت نافذ کر کے از خود اقتدار سے علیٰحدگی کا اعلان کر دیتے تو اپنے لیے تاریخ میں ایک منفرد مقام حاصل کر سکتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُن کی بے لوث خدمات کے عوض عوام اُنھیں عملی سیاست میں آنے پر مجبور کر دیتے مگر اِس مختصر عرصے میں اُنھیں وُہ مرض لاحق ہو چکا تھا جس میں ہر آمر مبتلا ہو کر بالآخر جاں بحق ہو جایا کرتا ہے یعنی ہوسِ اقتدار کا مہلک مرض اور جس مرض کی اوّلین علامت Symptom یہ ہے کہ مختارِ کُل خود کو عقلِ کل بھی سمجھنے لگے۔

م ب خالد

ایوانِ صدر میں سولہ سال

م ب خالد